تذکرہ
انتظار حسین

تذکرہ

ناول

انتظار حسین

سنگِ میل پبلی کیشنز ◎ چوک اردو بازار - لاہور

ضابطہ

— ۱۹۸۷ء
تعداد — ایک ہزار
پبلشر — نیاز احمد
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
پرنٹر — آر۔آر پرنٹرز، لاہور
قیمت — [illegible]

۱

باسمِ سبحانہٗ، کہ سب تعریفیں اسی کے لئے ہیں کہ جس نے ایک لفظ کُن کہہ کر یہ کون و مکاں پیدا کئے اور زمین و آسمان بنائے اور کیا خوب بنائے کہ آسمان کے پھیلاؤ میں ستارے بھر دیئے، بیچ میں ان کے چاند سورج رکھ دیئے، اور گودِ زمین کی ندیوں نہروں تال تلیوں سے بھر دی کہ فیض سے ان کے باغ بغیچے پھولے اور کھیت لہلہائے۔ باغوں کو رنگ رنگ کے پھلوں سے مالا مال کیا کہ انہیں پھلوں میں وہ پھل بھی ہے۔ جسے آم کہتے ہیں اور جس کی ایک قسم صرف ہمارے جدی باغ میں پائی جاتی تھی کہ جسے ایک دفعہ جو شخص چکھ لیتا ذائقہ اس کا نہ بھولتا، تا عمر ہونٹ چاٹتا رہتا۔ میوہ جات مستزاد مثل بادام کشمکش اخروٹ و نیز پستہ جس کی ہوائیوں سے فرنی کی طشتریوں پر بہار آتی ہے۔ کھیتوں کا دامن سبزی ترکاری سے بھر دیا اور گندم موٹھ مٹر جیسی اجناس سے۔ انہیں کھیتوں کے بیچ ایک ہنستا ہوا کھیت زعفران کا کھلایا کہ بریانی کی جان ہے، قورمے کی آن ہے۔ تو ایسا عالم ظاہر کیا اور اس عالم کے بیچ بھانت بھانت کا جانور اور رنگ رنگ کی مخلوق پیدا کی کہ اسی میں انسان ضعیف البنیان بھی ہے۔ سبحان تیری قدرت کہ تو نے اسی بودی بنیاد والے جانور کو اشرف المخلوقات ٹھہرا دیا۔ اس لطیفۂ غیبی پر عقل دنگ ہے، زبان گنگ ہے۔ لطف و کرم اس کے

کس زبان سے شکر ادا کیا جائے کہ اس ظالم و جاہل مخلوق کی اصلاح کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے۔ عزیزو، پھر بھی کم بھیجے کہ اس دو ٹنگی مخلوق کا ظلم زیادہ ہے، جہل بے اندازہ ہے۔

انہیں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں ہمارے پیارے نبی رحمت اللعالمین خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں کہ آپ اور آپ کی آلِ اطہار اور اصحاب کبار پر بعد درود و صلوٰۃ کے بندۂ ہیچمقدار مشتاق علی ولد حکیم چراغ علی غایت اس تذکرے کی بیان کرتا ہے جو یوں ہے کہ ایک شب خواب میں ابا جانی کو دیکھا کہ سامنے دھرے اوراقِ پریشاں کو دیکھ کر پریشان ہیں اور افسوس کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ بزرگوں نے اپنے اپنے وقت میں حق ادا کیا، ہم سے حق ادا نہ ہوا۔ بس اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے پریشان ہوا کہ یہ کیسا خواب تھا۔ بعد تامل کے اسے حرفِ تنبیہ جانا۔ خود کو نفرین کی کہ اے سگِ دنیا مشتاق علی اللہ تعالیٰ تیرے حال پہ رحم کرے۔ تو نے عمر لہو و لعب میں، سیر و شکار میں گذار دی۔ ہنوز تو علائق دنیوی میں مبتلا ہے۔ ہر چند کہ سر تیرا چاندی ہو چکا ہے اور عمارت تن کی تیرے ہل چکی ہے پر حرص و طمع تجھے نہیں چھوڑتی۔ اے غافل اب جبکہ تو گور کنارے آن لگا ہے اور پتہ نہیں کہ پیکِ اجل کب پیام لے کر آجائے خوابِ غفلت سے جاگ اور اپنے فریضہ کو پہچان۔ جان لے کہ خواب میں ابا جانی کا آنا اور اوراقِ پریشان کو دیکھ کر افسوس کرنا تیرے لئے ایک اشارہ ہے۔

تب میں نے ابا جانی کے بکھرے ورق اکٹھے کئے اور دل پہ دھر لیا کہ اس خاندانی تذکرے میں بعد کے خاندانی حالات اضافہ کر کے و نیز حالاتِ زمانہ قلمبند کر کے پایۂ تکمیل کو پہنچاؤں گا۔ بعد میں اخلاف اس میں اضافے کرتے رہیں گے۔ نیز طے کیا کہ یہ کام شتابی سے انجام دیا چاہیئے کہ ایک تو عمر کوتاہ ہے۔ دوسرے زمانہ پُر آشوب ہے۔ چنگیز بیجا کا نقشہ ہے۔ طرابلس میں برادرانِ اسلام پر قیامت گزر گئی۔ ترکی میں خلافت کا تختہ اُلٹ گیا۔ امرتسر میں فرنگیوں نے اپنی دیسی رعایا کو بھون ڈالا۔ دم کے دم میں جلیانوالہ باغ مقتل بن گیا۔ دیارِ ہند کی خلقت تراہ تراہ پکار اٹھی۔ گاندھی جی نے ایسی ستیہ گرہ کی کہ نگر نگر میں قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ چورا چوری

میں تو ایسا ہوا کہ خلافتیوں اور کانگریسیوں نے تھانے ہی کو پھونک ڈالا کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری، قصہ مختصر زیرِ آسمان وہ ہوا اور ہو رہا ہے کہ چشمِ فلک نے کبھی کا ہے کو دیکھا ہوگا۔ ابھی آگے دیکھئے کیا کیا ہوتا ہے۔ زمانہ بے اعتبار ہے۔ چرخ کج رفتار ہے۔ گھڑی گھڑی رنگ بدلتا ہے۔ سنگِ حوادث سے ایسا تفرقہ پیدا کرتا ہے کہ دوست دشمن بن جاتے ہیں۔ ابھی چاہت میں مرے جا رہے تھے ابھی خون کے پیاسے ہیں۔ علی برادران کو دیکھو کل تک گاندھی جی سے دانت کاٹی روٹی تھی تو من شدی من تو شدم کا مضمون تھا۔ ارے اس مہاتما کی خاطر تو ان مولاناؤں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ بی اماں گوشت کی ہنڈیا پکانے سے گئیں۔ دال ترکاری گھوٹ گھوٹ کے بیٹوں کو کھلانے لگیں۔ غضب خدا کا مسلمان گھر کا باورچی خانہ گوشت کی ہنڈیا کی مہک سے محروم ہو جائے۔ مگر اب گاندھی جی سے ان کی ٹھنی ہے۔ وہ مہاتما مینا ہے۔ یہ بھائی بھڑ بھڑیا ہیں۔ گھڑی میں رن ہیں گھڑی میں بن ہیں۔ کل مہاتما جی پہ جان چھڑک رہے تھے۔ اب بے نقط سنا رہے ہیں، آگ کے انگارے اگل رہے ہیں۔ ادھر ہندو مسلمان کٹے مر رہے ہیں۔ ملتان مقتل بن گیا۔ مٹی اس دیار کی خون سے رنگین ہو گئی۔ برادرِ خورد اشتیاق علی بی اے نے بیان کیا کہ مسیح الملک حکیم اجمل خان کوائف معلوم کرنے کے لئے اس قریئے میں گئے۔ ایک کوچے سے گذر ہوا تو کیا دیکھا کہ ایک بوڑھیا ایک جلا پھنکا پنجرا گود میں لئے جلے ملبہ پہ بیٹھی گریہ کرتی ہے۔ حکیم صاحب قبلہ نے احوال پوچھا تو اس نے رو رو کے دہائی دی کہ ناس پیٹوں نے میرے گھر کو پھونکا سو پھونکا میرے مٹھو کو بھی نہ چھوڑا۔ پنجرا آگ میں جھونک دیا۔ پھر جلے پنجرے کو دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ادھر حکیم صاحب قبلہ بھی آبدیدہ ہو گئے۔

برادرِ خورد اشتیاق علی جوشِ جوانی میں تحریکِ خلافت میں شامل ہو گئے تھے۔ فقیر نے انہیں بہت روکا ٹوکا سمجھایا کہ حاکمِ وقت سے سرکشی کرنا قرینِ مصلحت نہیں اور ہمیں تو ان کے مقابل آنا یوں بھی بھلا نہیں لگتا کہ اب ہمارے خاندان کا شمار ان کے وفاداروں میں

ہوتا ہے۔ آگے جو ہوا سو ہوا پر اب تو ہم برکاتِ سلطنتِ انگلیسیہ کے مدح خواں ہیں۔ کیوں نہ ہوں کہ راج میں ان کے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں اور دیار و امصار میں ایسا امن چین ہے کہ چاہو تو کوچہ و بازار میں چاہو تو جنگل ویرانے میں سونا اچھالتے چلے جاؤ، مجال ہے کہ کوئی پوچھ لے کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں اور ہمارے خاندان کا اقبال تو انہیں کے چشمِ کرم کا مرہونِ منت ہے۔ اس بے مقدرت کو انہوں نے خان بہادری کے خطاب سے نوازا اور آنریری مجسٹریٹی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا کہ دادخواہ روز اس ڈیوڑھی پر حاضری دیتے ہیں اور انصاف لے کر جاتے ہیں۔ بدخواہ ہمیں بدنام کرتے ہیں کہ وطنِ عزیز سے غداری کے صلہ میں یہ مراتب ہمیں ملے ہیں۔ حاسد تو ہمارے اقبال کو دیکھ کر آتشِ حسد میں جلتے ہیں اور باتیں بناتے ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ فرنگی حاکموں نے ہمارے خاندان کے جرم بغاوت کو بخش کر ہمارے دل خرید لئے۔ یہی تو اس فقیر نے میاں اشتیاق علی سے کہا کہ برادرِ عزیز ہمارے ایک بزرگ نے سر اٹھایا تھا تو کتنے دنوں خاندان پر ادبار کی گھٹ چھائی رہی اور خطا ایک مرتبہ ہی معاف ہوتی ہے۔ روز روز تو کوئی بھی حاکم جرم سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ مگر برادرِ عزیز کے خون میں گرمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ ایک نہ سنی۔ خاندان کی روایاتِ نمک حلالی کو ٹھوکر ماری اور علی برادران کے پیچھے لگ لئے۔ مگر پیچھے ان کے لگ کر کیا پایا۔ حاکمِ وقت کی نظروں سے بھی گرے اور جس مقصد کے لئے یہ طور پکڑا تھا، وہ بھی حاصل نہ ہوا۔ جگ ہنسائی کے سوا کیا پایا۔ خلافت ہی کا تیا پانچا ہو گیا اور خود اپنوں کے ہاتھوں غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے اس کا خاتمہ بالخیر کر دیا۔ جب یہ خبرِ وحشت اثر یہاں پہنچی تو مت پوچھو کہ اشتیاق میاں پر کیا عالم گذرا۔ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ لگتا تھا کہ خدانخواستہ ہمارے گھر میں کوئی موت ہو گئی ہے۔ میں نے سمجھایا کہ برادرِ عزیز خلافت تو اب جسدِ بے روح تھی اور گھر میں میت کا زیادہ دیر رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ جنازہ نکل گیا، مناسب ہوا۔

علی برادران خلافت کے قضیئے سے فارغ ہوئے تو نجدیوں کے پیچھے لگ لئے۔ ان بھائیوں

کو بھی کوئی نہ کوئی شغل چاہیے۔ جذبات کا ان کے یہاں وفور ہے۔ ندی ہر دم چڑھی ہی رہتی ہے۔ یہ بھائی لوگ ان کے بھرّے میں آ گئے کہ سرزمینِ عرب پر جمہوریۂ عربیہ اسلامیہ قائم ہوگی۔ ان کے بندۂ بے دام بن گئے۔ مگر ہوا کیا۔ ادھر انہوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، ادھر یہ بھائی بھیگے بتاشوں کی طرح بیٹھ گئے۔

تو یہ حال ہے مسلمانوں کا اور یہ چال ہے زمانے کی تباہی کے اخبار ہیں۔ قیامت کے آثار ہیں۔ ایک واقعہ عجب گذرا۔ سدّو کا بیٹا ممدو رات گئے زمینوں سے واپس آ رہا تھا۔ دروغ برگردنِ راوی، آ کر سنایا کہ خان بہادر صاب ہوا یوں کہ میں بیٹا بیٹا چلا آ رہا تھا کہ پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ ایسے لگا جی کہ جیسے کوئی جنا لمبے ڈگ بھرتا ہوا پیچھے آ رہا ہے۔ مڑ کر دیکھنے لگا تھا کہ ایک آدمی ٹانگیں یہ لمبی لمبی جیسے اونٹ کی ہوں، ہاتھ میں لمبا سا لٹھ لمبے ڈگ بھرتا برابر سے سن گزر گیا اور ادھر گذرا ادھر غائب۔ راقم الحروف نے یہ سن کر تامل کیا۔ پھر پوچھا کہ ارے ممدو، تو نے اچھی طرح دیکھا بھی تھا۔ بولا، خان بہادر صاب جی جو جھوٹ بولے سو کافر۔ آنکھوں دیکھی کہتا ہوں اور وہم تو میں نے کبھی کیا ہی نہیں۔ راتیں جنگلوں میں گذاری ہیں۔ کبھی جو وہم کیا ہو۔ میں نے پوچھا، وہ آدمی لگتا تھا نا۔ بولا، آدمی لگتا بھی تھا اور نہیں بھی لگتا تھا۔ میں نے کہا کہ ارے کمبخت، یہ تو نے کیا دیکھ لیا۔ کہیں دابۃ الارض تو نمودار نہیں ہو گیا۔ نشانیاں تو کچھ اسی کی سی ہیں۔

یہ واقعہ سننے کے بعد مجھے کئی دن تک تشویش رہی۔ ممدو کی پیشانی تو میں نے اسی گھڑی غور سے دیکھ لی تھی۔ بعد اس کے دوسروں کی پیشانیاں بھی غور سے دیکھیں۔ جب داغ کسی پیشانی پر دکھائی نہ دیا تو دل کو قدرے قرار آیا۔ پھر یہ سوچ کر اپنے دل کو سمجھایا کہ دابۃ الارض ہوتا تو اتنی دیر کہاں لگنی تھی۔ سب پیشانیاں اب تک داغدار ہوتیں اور دنیا زیر و زبر ہو چکی ہوتی۔ قیامت نامے سے رجوع کیا۔ وہاں سے بھی میرے خیالِ ناقص کی تصدیق ہوئی۔ دابۃ الارض یوں تھوڑا ہی نمودار ہو جائے گا۔ صفا کا پہاڑ جب شق ہوگا ——

تب اس کے بیچ سے برآمد ہوگا۔ سات جانوروں کی اس میں شباہت ہوگی۔ ٹانگیں اونٹ والی گردن پہ ایال گھوڑے والے۔ ہاتھ میں عصا۔ اس عصا کے ساتھ دروازوں پر دستک دے گا۔ وہ جو گھروں میں بند بیٹھے ہوں گے بدحواس ہو کر گھروں سے نکل پڑیں گے۔ دابۃ الارض ہر پیشانی کو عصا سے چھوئے گا۔ جس پیشانی کو چھوئے گا وہ داغدار نظر آئے گی۔ بعد اس کے قیامت کو آیا سمجھو۔

جب تحقیق ہو گیا کہ رات کے ہنگام کسی گھر پہ دستک نہیں ہوئی ہے اور کسی پیشانی پہ داغ نہیں ہے، تب یہ کوتاہ اندیش مطمئن ہو بیٹھا۔ مگر سوچتا ہوں کہ یہ اطمینان آخر کب تک۔ قربِ قیامت کے آثار ظاہر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ دابۃ الارض آج نہیں تو کل نمودار ہو جائے گا۔ ہماری پیشانیوں کو کسی نہ کسی دن داغدار ہونا ہے۔ یہ عاصی پرمعاصی آنے والے وقت سے ڈرتا ہے اور توبہ و استغفار کرتا رہتا ہے کہ اے پالنے والے پیشانی داغدار ہونے سے پہلے اس گنہگار کو اُٹھا لے۔

پنڈت گنگا دت المتخلص بہ مہجور آتے ہیں تو اپنی کتھا لے بیٹھتے ہیں۔ شری مشتاق علی کلجگ ہے کلجگ۔ میں نے جل کر کہا کہ پنڈت یہ تمہارا کلجگ تو ہماری چودھویں صدی سے بھی زیادہ طول پکڑ گیا۔ آخر کب سے چل رہا ہے۔ بولے کہ جس سمے شیش ناگ جی حضرت بلدیو جی کے منہ سے نکل کر سمدر میں اتر گئے اور حضرت سری کرشن مہاراج کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا اور انہوں نے مانس دیہی چھوڑ دی بس اسی سمے کلجگ شروع ہو گیا۔ میں نے کہا کہ پنڈت یہ تمہارا کلجگ ہے یا شیطان کی آنت ہے۔ بولے بس شیطان کی آنت کا انت ہونے لگا ہے۔ پنڈت آخر یہ انت کب ہوگا۔ مشتاق علی جی، بس ایک یدھ پڑے گا اور ادھک اتھل پتھل ہوگی۔

جنگِ عظیم جس میں سب نشٹ اور نابود ہو جائے گا۔ ترتیا یگ کا بھی تو ایسے ہی انت اور انجام ہوا تھا۔ کوروکشیتر میں کتنا کشت و خون ہوا تھا۔ آخر میں کل ملا کر نو جنے بچے

تھے۔ تین کورو پانچ پانڈو اور ایک ہمارے حضرت کرشن مہاراج علیہ السلام۔ پنڈت تمہاری مہابھارت تو جنگِ عظیم سے بھی بڑھ گئی۔ واہ مشتاق علی جی، جنگِ عظیم بھی کوئی جنگ تھی۔ میں پوچھتا ہوں کہ تمہاری جنگِ عظیم میں برہم بان کس کے پاس تھا۔ شری مشتاق علی جی پتہ ہے انت میں کیا ہوا۔ اس دُشٹ اسوتھاماں نے اپنا برہم بان نکالا اور ایک گھاس کی پتی میں اسے پھونک کر ارجن مہاراج کی اور پھینکا۔ فخرِ شجاعانِ آریہ ورت ارجن مہاراج نے بھی اپنا برہم بان چلایا۔ تب ویاس جی رشیوں منیوں کو سنگ لے کے بیچ میں آن کھڑے ہوئے۔ چلائے کہ پترو، بان واپس لے لو، نہیں تو یہ سارا برہمانڈ جل کے خاکستر ہو جائے گا۔ مولا ارجن نے تو ترنت ہی حضرت ویاس جی کے چرن چھوئے اور بان واپس لے لیا۔ پر دُشٹ اسوتھاماں حضرت کا کلام سن کر طرح دے گیا۔ بولا کہ بان واپس لینا میرے بس میں نہیں۔ ہاں سیما اس کی بدل سکتا ہوں۔ اس شقی نے سمت بان کی اس طور بدلی کہ بان پانڈوؤں کی استریوں کی کوکھ پہ جا کے گرا۔ اثر سے اس کے پانڈوؤں کی ازواجِ مطہرات کے گربھ گر گئے، بچے پیٹ میں مر گئے۔

میں نے یہ قصۂ طولانی سُن کر کہا کہ پنڈت کورو پانڈو تو چشم و چراغ ایک ہی خاندان کے تھے کوئی بھوت ان پر سوار تھا کہ ایک دوسرے کا خون بہانے پہ تل گئے۔ کوئی انہیں سمجھانے والا نہ تھا۔ مہجور نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ کہنے لگا کہ یہی سوال جنمی جئے نے حضرت ویاس سے کیا تھا۔ ہوا یوں کہ حضرت گھومتے پھرتے ایک دن دربار میں اس کے آن براجے۔ جنمی جئے نے حضرت کے چرن پوتر جل سے چاندی کے باسن میں دھوتے پھر یوں گویا ہوا کہ رشی مہاراج، میرے دادا پردادا تو بہت بدھیمان تھے اور پھر دونوں ہی طرف گنی گیانی براجتے تھے۔ بڑے اچرج کی بات ہے کہ ان کی بدھی میں یہ بات نہیں آئی کہ یدھ پڑے گا تو راجہ پرجا کا کتنا ناش ہوگا۔ حضرت افسردہ ہو کر بولے کہ پُتر تو نے ٹھیک کہا پر ایسے سمے آتے ہیں۔ بدھیمانوں کی بھی مت ماری جاتی

ہے اور ہونی ہو کر رہتی ہے۔

یہ کلام سُن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ کہا کہ پنڈت ٹھیک کہا تمہارے ویاس جی نے۔ آج کل بھی تو یہی احوال ہے۔ غور کا مقام ہے کہ مہاتما گاندھی مولانا شوکت علی کو اس نیت سے ہمراہ کوہاٹ لے گئے تھے کہ دونوں مل کر ہندو مسلمانوں کو ٹھنڈا کریں۔ لے لو وہ تو وہاں جا کر خود ہی آگ بگولا ہو گئے۔ دونوں میں ٹھن گئی۔ مجھے ان جھگڑوں کا انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ پنڈت اِن بدھیمانوں کو کچھ عقل سکھاؤ۔ کچھ سمجھاؤ۔

پنڈت گنگا دت چپ ہو گئے۔ تامل کر کے بولے کہ مشتاق علی جی، حضرت سری کرشن مہاراج اور حضرت بھیشم پتامہ نے فریقین کو کتنا سمجھایا۔ کوئی سمجھا؟ جب ان ستیوں کا کہا کسی نے نہ مانا تو ہم تم کس کھیت کی مولی ہیں۔ مشتاق علی جی، بس چپ ہی ہو رہو۔ یہ زمانہ بولنے کا نہیں ہے۔

المختصر یہی آشوبِ زمانہ دیکھ کر فقیر نے سوچا کہ ابا جانی خواب میں بروقت آئے ازبسکہ چرخ کج رفتار ہے اور بے زمانہ بے ثبات ہے، سو اس سے پہلے کہ زمانہ آنکھیں پھیرے اور رشتہ خیات منقطع ہو جائے تو ہاتھ میں خامہ پکڑ اور بعد حمد و نعت کے اور ساتھ درود و سلام کے جاری ہو۔ حالاتِ خاندان و نیز حالاتِ زمانہ بے کم و کاست قلمبند کر۔ مگر اختصار کو ملحوظ رکھ کر رسالہ مبادا نہ ہو جائے اور طبیعت پڑھنے والے کی ملول نہ ہو۔ جاننا چاہیئے کہ کلام میں طوالت خص کے نزدیک ایک عیب ہے اور اہلِ ذوق کے لئے ——— باعثِ گرانیِ طبع اور ——— موجب ملال ———

——— و نیز ———

آگے کی عبارت باوجود کوشش کے پڑھی نہ جا سکی۔ کچھ ورق بوسیدہ کچھ خط شکستہ یہ پلندا میاں جان کا مخطوط تھا۔ یعنی میرے دادا مرحوم کا جنہیں خاندان میں سب چھوٹے بڑے میاں جان اور باہر والے خان بہادر صاحب کہتے تھے سوائے ان کے یارِ غار پنڈت

گنگادت مہجور کے جو انہیں کبھی شری مشتاق علی اور کبھی مشتاق علی جی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ بہرحال یہ مخطوطہ برآمد ہو کر میرے لئے ایک اچھی خاصی آزمائش بن گیا۔ ایک تو ورق بے ترتیب تھے اور بہت بوسیدہ ہو گئے تھے۔ پھر میاں جان کا جناتی خط اُردو بھی ایسی لکھی تھی کہ اس کا لہجہ میرے لئے ذرا اجنبی تھا۔ بہرحال تھوڑا پڑھنے کے بعد میری اس میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ سوچا کہ جب یہ ورق ہاتھ پڑ ہی گئے ہیں تو پڑھ کر دیکھنا تو چاہیئے، ان میں لکھا کیا ہے۔ پتہ تو چلے کہ آخر اس خاندان میں ایسی کونسی صفت تھی کہ ہر نسل میں کوئی بزرگ قلم دوات لے کر بیٹھ جاتا اور رواں ہو جاتا۔ کس انہماک کے ساتھ خاندانی حالات قلمبند کرنا اور پچھلے تذکرے کے ساتھ شامل کر کے اولاد کے لئے ایک قیمتی اثاثے کے طور پر چھوڑ جاتا۔ آخر میرے دادا پردادا مال و متاع چھوڑ کر بھی تو جاتے تھے۔ مگر وصیت ناموں میں جتنی تاکید ان پلندوں کے بارے میں ہے "اتنی جائداد کے بارے میں نہیں ہے۔

مجھے خیال آیا کہ آخر میں بھی انہیں بزرگوں کا خون ہوں، میرے یہاں خاندان کا تذکرہ لکھنے کی خواہش کیوں نہیں پائی جاتی۔ میں نے اپنے والد کے یہاں بھی ایسی کوئی خواہش نہیں دیکھی۔ انہوں نے بس اسی قدر کیا کہ بزرگوں کے لکھے ہوئے اوراق کو ضائع نہیں ہونے دیا ویسے انہوں نے اس سلسلہ میں مجھے کوئی ہدایت کوئی تاکید نہیں کی تھی۔ بلکہ میرے سامنے کبھی ان اوراق کا ذکر بھی نہیں کیا۔ وہ تو یہ کہئے کہ نئے مکان میں منتقلی کی تیاری میں سامان کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے خیال آ گیا کہ والد مرحوم کے کاغذات کو ذرا کرید لیا جائے کہ جو ضروری ہیں انہیں سنگھوا لیا جائے اور جو فالتو ہیں انہیں ٹھکانے لگایا جائے۔ بس اس چھان پھٹک میں یہ مسودہ نکل آیا جس کے ورق الگ الگ تھے اور بہت خستہ و بوسیدہ تھوڑے دن اور اسی طرح بند پڑے رہتے تو دیمک کی غذا بن جاتے۔

میرے والد نے اگر تذکرہ نہیں لکھا تو اس کی وجہ تو سمجھ میں آ گئی۔ میاں جان کے

بعد وہ جئے ہی کتنے دن۔ باپ کے جیتے جی انہیں یہ فریضہ ادا کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی۔ مگر میرے یہاں یہ خواہش کیوں پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے بڑوں کی آنکھیں دیکھیں اور ان کی آنکھ بند ہوتے بھی دیکھی۔ میاں جان کا جنازہ اُٹھتے دیکھا۔ پھر والد صاحب کا سایہ سر سے اُٹھتے دیکھا۔ والد صاحب بس یہاں آتے ہی سدھار گئے۔ جیسے اسی کام کے لئے انہوں نے ان پر آشوب دنوں میں ہجرت کی زحمت اُٹھائی ہو اور جیسے اسی خاطر اس نئی زمین نے انہیں بلاوا بھیجا ہو ادھر آئے اور اُدھر گئے اور ادھر تو والد گئے۔ اُدھر چچا جان جنہوں نے علی گڑھ میں ڈیرا کر لیا تھا مہینوں میں چٹ پٹ ہو گئے۔ اب ان بزرگوں کو گذرے ہوئے پورا ایک زمانہ ہو چکا تھا اور اب خود میں بزرگ ہو چلا تھا یا یوں سمجھئے کہ بزرگوں کی موت نے مجھے بزرگ بنا دیا تھا۔ مگر اس صورت میں بھی میرے یہاں خاندان کا تذکرہ لکھنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی، حالانکہ ہجرت کے عمل میں اس خاندان کو جیسے دن دیکھنے پڑے تھے ان کی وجہ سے وہ ایک تذکرے کا مستحق تو تھا۔

اگر اجداد کی وضع کے خلاف میرے یہاں خاندانی حالات قلمبند کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی تو میری سمجھ میں اس کی وجہ یہی آئی کہ میں ایک اکھڑا اکھڑا آدمی ہوں۔ وہ اطمینان جو میاں جان کو میسر تھا وہ مجھے کب میسر آیا۔ میاں جان کی زندگی میں تو ایک جماؤ تھا۔ پتھر اپنی جگہ پہ بھاری ہوتا ہے۔ پتھر سے زیادہ میاں جان بھاری تھے کہ کس اطمینان اور آسودگی کے ساتھ اپنی ٹھیک پر جمے بیٹھے رہے۔ شہر سے نکلنا تو دور کی بات ہے، ڈیوڑھی سے نکلنے کی بھی کم ہی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ بس دو ایسے موقع آتے تھے جب چراغ حویلی سے قدم نکالتے تھے۔ ایک ساون بھادوں کے دنوں میں جب نوروز منانے کی نیت سے خاندانی تام جھام کے ساتھ باغ میں جا کر ڈیرا لگاتے۔ ایک اس وقت جب انگریز کلکٹر دورے پر یہاں آن وارد ہوتا۔ اس موقع

پر بہوا کس اہتمام سے تانگہ جوتتا۔ کیا چم چم کرتا تانگہ تھا اور کیا چم خم اس گھوڑے کے تھے۔ بگھی تو پتہ نہیں کس زمانے سے کھٹ بگڑی گرد آلود اندر اصطبل میں کھڑی تھی۔ اب تو اس تانگہ ہی کی بہار تھی کہ جب میاں جان اس میں بیٹھ کر نکلتے تو راہ چلتے لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور اپنی اپنی ٹھیک پر بیٹھے ہوئے دکاندار کھڑے ہو کر سلام کرتے کہ ایک ایک کو پتہ ہوتا کہ خان بہادر صاحب انگریز بہادر سے ملاقات کے لئے ڈاک بنگلہ جا رہے ہیں۔

باقی دنوں میں وہی ایک طور کہ صبح ہی صبح مردانے میں بیٹھ کر عدالت لگانا۔ (آنریری مجسٹریٹ جو تھے۔) دوپہر ہوتے ہوتے عدالت ختم کر کے دسترخوان پر بیٹھنا، اس کے بعد قیلولہ کہ گرمی کے دن ہوئے تو دھوپ ڈھلنے تک خس کی ٹٹیوں سے لیس کمرے میں لمبی جھالر والے پنکھے تلے آرام کرنا، شام پڑے چھڑکاؤ سے شاداب صحن میں برآمد ہونا اور گاؤ تکیے کے سہارے تخت پہ بیٹھنا کہ ان کے آ کر بیٹھتے ہی ملاقاتیوں جی حضوریوں کا تانتا بندھ جاتا اور رات گئے تک بندھا رہتا۔ اسی ایک طور پر پوری زندگی چراغ حویلی میں گزار دی۔ وہیں پیدا ہوئے، وہیں سے جنازہ نکلا۔ اب ہم پیدا کہاں ہوتے ہیں، مرتے کہاں جا کر ہیں۔ نال کس کوٹھری میں گڑتی ہے، جنازہ کس ڈیوڑھی سے نکلتا ہے۔ آدمی اب ڈال سے ٹوٹا پتہ ہے کہ ہوا اسے اُڑائے اُڑائے پھرتی ہے کہاں سے رولتی ہے کہاں جا کر ڈھیر کرتی ہے۔

میاں جان چراغ حویلی میں بیٹھے پتھر کی مثال بھاری تھے۔ میں گلی کا روڑا بن گیا۔ یہاں آ کر کتنے مکان بدلے، کس کس محلہ میں جا کر رہا۔ ایک وہ لوگ تھے۔ جنہوں نے شہر میں وارد ہوتے ہی بلا تکلف کسی متروکہ مکان کا تالا توڑا اور جم کر بیٹھ گئے۔ اپنے پرائے الاٹمنٹ کا پروانہ لے کر آتے، پولیس کی کمک ساتھ لاتے مگر وہ اپنی جگہ جمے بیٹھے ہیں نہ دھمکی دینے والوں سے مرعوب نہ سرکاری نوٹسوں کی پروا۔ بس جس گھر میں براج گئے

سو براج گئے۔ ایک میں تھا کہ آج اس محلہ میں کل اس گلی میں کتنے برسوں تک میں اس شہر میں گلی گلی رُلتا پھرا۔

"بیٹے اخلاق، یہ تم نے ہمیں کہاں جنگل میں لا پھینکا ہے۔ نگوڑی یاں پہ تو اذان کی آواز بھی کان میں نہیں پڑتی۔" "چپ ہونا اور پھر شروع ہو جانا۔" ارے میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ کہاں کالے کوسوں جا رہے ہو۔ مگر تیرے باپ نے ایسا تلے اُوپر کیا کہ میری عقل پہ پتھر پڑ گئے۔ اے لو وہ تو یاں پہ آتے ہی ٹھنڈے چلے گئے ہمیں جنگل ویرانے میں چھوڑ گئے۔ یہ نگوڑی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ میں نے تو یاں پہ کبھی کسی بخت مارے پھیری والے کی بھی آواز نہیں سنی۔ بس سویرے سے شام پڑے تک کوؤں کی کائیں کائیں سنے جاؤ۔ ارے میں تو یاں رہ کے خفقانی ہو جاؤں گی۔"

بوجان اپنی جگہ سچی تھیں۔ وہ نئی نئی چراغ حویلی سے نکل کر آئی تھیں۔ جہاں سویرے سے رات گئے تک اندر باہر کیسی چہل پہل رہتی تھی کہ اندر زنانے میں بوجان کے ہاتھ میں سروطہ مستقل چلتا رہتا اور باہر مردانے میں گلوریوں کی تھالی مسلسل گردش میں رہتی اور یہاں شام ہوئی اور ہو کا عالم۔ دن میں بھی کونسا شور ہنگامہ ہوتا تھا۔ آخر کس تقریب سے ہوتا۔ آس پاس نہ مکان نہ دکان۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے چند ایک کوٹھیاں ضرور تھیں مگر دور سے یہی لگتا تھا کہ جیسے ان میں کوئی رہتا نہیں۔ ان کوٹھیوں سے پرے ایک بوسیدہ سا پھاٹک نظر آتا تھا۔ جس کے سامنے گرمیوں کے دنوں میں صبح ہی صبح چار چھ ریڑھے کھڑے نظر آتے اور ان پر لدی ہوئی برف کی سلیں۔ اصل میں یہ کوئی برف کا کارخانہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں

دو ڈیڑھ بجے رخصت ہو جاتے۔ پھر سڑک سنسان یہاں جتنا بھی شور تھا پرندوں کا تھا کہ وہاں کھڑے گھنے درختوں پر دن بھر اُترتے رہتے، بے چین ہو کر اُڑتے رہتے، شور کرتے رہتے۔ کوے سب سے بڑھ کر فضا پر چھائے نظر آتے۔ درخت بھی تو اس نواح میں کافی تھے۔ کوٹھی تو فاصلہ پر کوئی کوئی نظر آتی تھی۔ زیادہ تو درخت ہی نظر آتے تھے اور موسم کے ساتھ کس طرح بدلتے چلے جاتے تھے۔ کبھی ہرے بھرے کبھی پیلے چھدرے۔ ایک وقت میں اتنے گھنے ہوتے کہ پتہ ہی نہ چلتا کہ ان کی ٹہنیوں کے بیچ پرندوں کی پوری برات اُتری ہوئی ہے۔ پت جھڑ لگنے پر یہی درخت کتنے چھدرے ہوتے چلے جاتے۔ کوئی کوئی تو سارے پتوں سے نجات حاصل کر کے بالکل برہنہ ہو جاتا۔ لگتا کہ خشک ہو گیا۔ مگر بسنت رُت کے ساتھ جہاں اور درختوں پر نئے پتے آتے اُن لنڈ مُنڈ درختوں کو بھی نئی پوشاک مل جاتی۔ پھر ویسے ہی ہرے بھرے۔ پھر پرندوں کو لپنے چھپنے کے لئے گوشے میسر آجاتے۔ پھر نئے گھونسلوں کی داغ بیل پڑ جاتی۔ خود اس احاطہ میں جس میں میرا مکان تھا درخت اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ ان میں ایک تو مولسری کا پیڑ تھا۔ جس پر جب موسم آتا تو فضا میں ہر وقت ایک ہلکی مہک بسی رہتی اور ایک پیپل جو بہت پھیلا ہوا تھا۔ میرے لئے تو یہ دو پیڑ ہی بہت تھے۔ اسی لئے میں نے باقی پیڑوں کو جاننے پہچاننے کے لئے زیادہ تردد نہیں کیا۔

اصل میں یہ میرا مکان ایک متروکہ کوٹھی کی انیکسی تھی۔ یہ کوٹھی اپنی سُرخ اینٹوں والی دیواروں کی وجہ سے لال کوٹھی کہلاتی تھی۔ کوٹھی پر کون قابض ہے؟ یہ جاننے کی میں نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ وقتاً فوقتاً ایک بھاری بھرکم شخص ادھ میلے لباس میں سائیکل پر سوار نکلتا یا داخل ہوتا نظر آتا۔ تعارف اور علیک سلیک کا تکلف نہ اس کی طرف سے ہوا نہ میری طرف سے۔ تعارف اس نے کرایا بھی تو اس اطلاع کے ساتھ کہ پوری کوٹھی اس کے نام الاٹ ہو گئی ہے۔ میں نے بات بڑھائے بغیر فوراً

ہی کرایہ دار کی حیثیت منظور کر لی۔ خوش اسلوبی سے معاملہ طے ہوتے دیکھا ہے تو پھر اُس نے بھی کوئی تقاضا کوئی تکرار نہیں کی۔ مجھے کرایہ دار کی حیثیت میں کھلے دل کے ساتھ قبول کر لیا۔ پھر تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے کوٹھی میں تالا ڈالا اور مجھے اپنا پتہ بتا کر ملتان چلا گیا۔ جہاں اسے ایک پن چکی الاٹ ہو گئی تھی۔ اس کے پتہ نوٹ کرانے پر مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام برکت الٰہی ہے۔ میں برکت الٰہی کو بہت پابندی کے ساتھ مہینے کے مہینے منی آرڈر سے کرایہ بھیجتا رہا۔

شروع میں تو میں بھی یہاں اکھڑا اکھڑا رہا۔ میرے لئے بھی یہ فضا اتنی ہی اجنبی تھی۔ جتنی بوجان کے لئے۔ مگر یہاں کے گرد و نواح اپنے درختوں اور پرندوں کے ساتھ دھیرے دھیرے میرے اندر گھر کرتے چلے گئے۔ سویرے منہ اندھیرے جب میں سیر کے لئے نکلتا تو اس نواح کا اُجڑا اُجڑا پن دل کے کسی گوشے کو چھوتا محسوس ہوتا۔ آثارِ قدیمہ تو اپنی قدامت اور ویرانی کے ساتھ ہم پر کس قسم کا اثر کرتے ہیں۔ جس قسم کا بھی کرتے ہوں۔ بہر حال وہ اثر ہوتا ہے۔ بہت واضح۔ یہاں ایسے اثر آثار نہیں تھے۔ جنہیں آثارِ قدیمہ کے ذیل میں شمار کیا جا سکے۔

ہم پر کس قسم کا اثر کرتے ہیں۔ جس قسم کا بھی کرتے ہوں بہر حال وہ اثر ہوتا ہے۔ بہت واضح۔ یہاں ایسے اثر آثار نہیں تھے۔ جنہیں آثارِ قدیمہ کے ذیل میں شمار کیا جا سکے۔ لے دے کے ایک لمبا چوڑا نشیب تھا۔ جس میں کہیں کہیں نانک شاہی اینٹ کی بنی کوئی سیڑھی ٹوٹی پھوٹی خاک دھول میں اَٹی کچھ ظاہر کچھ گم دکھائی پڑتی۔ ایک صبح میں اپنے اکیلے پن میں مگن ادھر ادھر گرد پر نظر ڈالتا۔ اُجلے ہوتے منظر کو نظر کے اندر سمیٹتا چلا جا رہا تھا کہ ایک اجنبی نیم کی مسواک کرتا میرے ساتھ لگ لیا۔ صبح کی سیر میں آدمی کے اندر ایک کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی بھی آس پاس ٹہلتے ہوتے آدمی سے بے جانے بوجھے پہلے علیک سلیک ہوتی ہے، پھر موسم پر اکا دکا بات، پھر دنیا جہاں کی باتیں، اور

اتنی گھل مل کر جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ تو اس بھلے مانس نے بھی چلتے چلتے علیک سلیک کی، تھوڑی دُور ساتھ ساتھ چلا اور پھر جانے کس بہانے بات شروع ہوئی اور ایسی شروع ہوئی کہ پھر باتیں ہوتی ہی چلی گئیں۔ میں نے بس یوں ہی اس اجاڑ سوکھے نشیب کے بارے میں کچھ تجسس ظاہر کیا۔ وہ بولا "ایہہ سیتا کنڈ ہے جی۔"

"سیتا کنڈ؟"

"آہو جی۔ ایس پاسے سیتا مائی اشنان کیا کرتی تھی۔"

"سیتا مائی؟ آپ کا مطلب سیتا جی سے ہے۔ سیتا جی۔ یہاں کہاں سے آگئیں۔"

"ایہی تو گل ہے۔ ایس شہر کو تو اسی کے پُتر نے بسایا تھا اور جہاں پوتر وہاں مادر۔"

اس روایت پر مجھے پوری طرح اعتبار تو نہیں آیا۔ مگر اس سے اس جگہ کے بارے میں تجسس اور بڑھ گیا۔ اب میں نے دل ہی دل میں سنجیدگی سے طے کیا کہ اس نواح کو ذرا تفصیل سے کھونڈنا چاہیے۔ سوچا کہ اتوار کی صبح فرصت کی صبح ہوگی کہ وہ چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ بس اس روز یہ پروگرام رہے گا۔ مگر اتوار کے آنے سے پہلے ہی ایسی بات ہوگئی کہ پھر میری توجہ بٹ گئی اور پھر یہاں سے میرا جی اچٹ گیا۔ برکت الٰہی ملتان سے اچانک آن دھمکا۔ "اب جی میں یہیں رہوں گا۔"

"اچھا؟"

"ہاں جی۔ یاں انار کلی میں مجھے ایک متروکہ دکان الاٹ ہوگئی ہے۔"

"اور جو ملتان میں پن چکی آپ کو الاٹ ہوئی تھی اس کا کیا بنے گا؟"

"وہ بھی چلتی رہے گی۔ وہاں میں اپنا ایک کارندہ چھوڑ آیا ہوں۔"

"چلئے اچھا ہے آپ آگئے۔ اس کوٹھی کی حالت بہت خستہ ہو گئی تھی۔"

"بس جی اس جگہ کا بھی اب کچھ کرنا ہے۔" ادھر ادھر نظر ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

جھاڑ جھنکاڑ کھڑا ہے۔ سب صاف کرا کے یہاں دکانیں بنوانے لگا ہوں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ جگہ کمرشیل ایریا بننے والی ہے۔ اس وقت یہ دکانیں سونا اگلیں گی۔"

"مگر یہ جو درخت کھڑے ہیں؟"

"ان سب کو کٹوا دوں گا۔"

"کیا؟... ان درختوں کو آپ کٹوا دیں گے۔" میں حیران و پریشان اس کا منہ تکنے لگا۔

"ہاں اور کیا۔ جگہ بیکار کیوں پڑی رہے اور اتنی اچھی جگہ۔"

میں بہت گھبرایا۔ مجھے فوراً ہی مولسری اور پیپل کا خیال آیا جن سے میں اتنا مانوس ہو گیا تھا۔

"مگر یہ مولسری؟"

"ہاں جی، اس مولسری نے بہت جگہ گھیر رکھی ہے۔"

میں پھر اس شخص کا منہ تکنے لگا۔

"مگر یہ پیپل تو بہت پرانا ہے۔"

"ہاں جی بہت پرانا ہو گیا ہے۔ اسے تو ویسے بھی کٹوا دینا تھا۔ بس کل پرسوں میں انتظام کرتا ہوں۔ جنگل بنا ہوا ہے۔ اسے سارے کو صاف کرا دینا ہے۔"

"اتنی جلدی؟" میں سخت گھبرایا۔

"ہاں جی۔ میں جب فیصلہ کر لوں تو پھر دیر نہیں کیا کرتا۔ پر آپ مت گھبرائیں جی۔ ابھی میں عمارت کو ہاتھ نہیں لگا رہا۔ وہ بعد میں سوچوں گا۔ آپ بے فکر ہو کے رہیں۔ ابھی میں آپ سے اُٹھنے کا تقاضا نہیں کروں گا۔"

"نہیں، آپ کو تقاضا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" یہ کہہ کر میں تو چلا آیا۔ وہ درختوں کا دیر تک جائزہ لیتا رہا۔

"اے بیٹے، یہ تم پہ کیا سنک سوار ہوئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ جہاں آکے بیٹھ گئے ہیں وہاں بیٹھے رہیں۔ کہاں تو اچولہا سر پہ اُٹھائے اٹھائے پھریں۔"

بوجان نے رفتہ رفتہ اس فضا سے جسے وہ جنگل ویرانہ بتاتی تھیں، سمجھوتہ کر لیا تھا۔ مگر میں اکھڑ چکا تھا۔

"نہیں بوجان، اس گھر میں اب ہم نہیں رہیں گے۔ یہ برکت الہٰی بہت بے برکت آدمی ہے۔"

"بیٹے" بوجان نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "برکت تو زمانے ہی سے اٹھ گئی۔ خیر ہمیں اس نحوست مارے سے کیا لینا ہے۔ ہم اپنے کونے میں سر چھپائے بیٹھے ہیں۔"

"بہر حال میں نے گھر کا انتظام کر لیا ہے۔"

"اچھا جیسا تمہاری سمجھ میں آئے۔ میں تو یہ سوچ کے کہہ رہی تھی کہ تمہیں بھی بے آرامی ہوگی اور میری بھی ضعیفی ہے۔ سامان کون سمیٹے گا، کون ڈھوئے گا؟"

"سب ہو جائے گا۔ بس آپ صبح اُٹھ کر مجھے بتاتی جائیں۔ میں سب کر لوں گا۔"

"اے ہے ذرا تو دم لیا ہوتا۔ ہبڑ دبڑ کا کام اچھا نہیں ہوتا۔"

"بوجان، جب یہاں سے اُٹھنا پڑ ہی گیا ہے تو دیر کیوں کی جائے۔"

"اے لڑکے تجھ پہ کوئی بھوت سوار ہے۔"

بس مجھ پہ بھوت ہی سوار تھا۔ بوجان کو کیسے سمجھاتا کہ سویرے سویرے آدمی درخت کاٹنے کے لئے آن پہنچیں گے اور میں اس واردات سے پہلے پہلے یہاں سے

نکل جانا چاہتا ہوں۔ میں نے رات مشکل سے کاٹی۔ کتنی رات تک کروٹیں بدلتا رہا۔ کہیں پچھلے پہر میں جاکر آنکھ لگی۔ پھر مرغے کی بانگ کے ساتھ آنکھ کھل گئی۔ ایسے اُٹھ کھڑا ہوا، جیسے سویا ہی نہیں تھا۔ منہ پر پانی کے دو چھپاکے مارے اور آستینیں چڑھا کر پائنچے اکسا کر سامان باندھنا شروع کر دیا۔ سامان تھا ہی کتنا۔ یہ کوئی چراغ حویلی کا کھڑاک تھوڑا ہی تھا۔ گھر کا کھڑاک گھر کے جمنے کے ساتھ ساتھ پھیلتا جاتا ہے۔ ابھی ہم یہاں آکر جمے کہاں تھے۔ ابھی تو بس بنیادی ضرورت کی چیزیں جمع کی تھیں۔ وہ بھی پوری نہیں تھیں۔ بوجان نے کتنی مرتبہ مجھ سے تقاضا کیا تھا کہ بیٹے اکڑوں بیٹھ کے مجھ سے کام نہیں ہوتا۔ بیٹھ جاتی ہوں تو اُٹھا نہیں جاتا۔ مجھے ایک پنیڑی لا دو اور چکلا بیلن کے لئے میں تم سے کب سے کہہ رہی ہوں۔ وہ تو تمہیں چھنکنی چمٹے کے ساتھ ہی لے آنا چاہیئے تھا۔" لیکن میں نے ابھی تک نہ پنیڑی لا کر دی تھی اور نہ چکلا بیلن بس اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت ہمارا ٹانڈا ٹانڈا کتنا ہوگا۔ سورج نکلنے تک میں نے سارا سامان باندھ لیا تھا۔

پھر میں نے باہر نکل کر تازہ ہوا میں سانس لیا۔ صبح کی سیر آج موقوف تھی۔ دل میں کہا کہ کم از کم اپنے ہمسایوں سے تو مل لو کہ آج ان کے ساتھ تمہاری آخری صبح ہے اور ان کی اپنی بھی آخری صبح ہے۔ ملا۔ میں افسردہ تھا۔ ان کے منہ پہ تو کوئی ملال نہیں تھا۔ بلکہ سورج کی پہلی کرن کے چھو جانے سے کچھ مسکراتے بھی نظر آ رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر پیپل اور مولسری دونوں اپنی اسی ہمیشہ کے وقار کے ساتھ کھڑے تھے۔ نہ خوش و خرم نہ آزردہ، بس خاموش تھے۔ خیر اس وقت ہوا بھی تو ایسی نہیں چل رہی تھی۔ میں نے مولسری کے مہکتے سائے میں کھڑے ہو کر ایک گھڑی سانس لیا۔ ننھے ننھے پھولوں کا جو اس سائے تلے اک بستر بچھا ہوا تھا اس میں سے چند پھول چُنے اور واپس اندر آگیا۔

بوجان نماز سے فراغت پاکر ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں۔ جلدی جلدی ناشتہ کیا۔

"اے بیٹا رات تم سوئے بھی تھے؟"

"کیوں بوجان نہ سونے کی کیا بات تھی؟"

"اے بیٹا جب میری آنکھ کھلی ہے تو تم سڑ بڑ کر رہے تھے۔"

"بوجان، آپ کی دیر میں آنکھ کھلی۔ میں مرغے کی پہلی آواز کے ساتھ اٹھ بیٹھا تھا۔"

"ہاں شاید میری آنکھ آج دیر سے کھلی۔" پھر تھوڑا رک کر "اے بیٹا سامان تو تم نے باندھ لیا۔ ڈھونے کا کیا بندوبست کیا۔ اس کباڑ کو کیا سر پہ رکھ کے لے جاؤ گے۔"

"بوجان یاں برف خانے کے سامنے ریڑھے کھڑے رہتے ہیں۔ میں نے کل دو ریڑھوں کے لئے بات کر لی ہے۔ برف کی لادی بھگتا کر ادھر آئیں گے۔ بس آتے ہوں گے۔ تانگہ یہیں کہیں سامنے سے پکڑ لوں گا۔"

ناشتہ جلدی جلدی کیا۔ پھر یہ سوچ کر ریڑھے والے کہیں بھٹکتے نہ پھر رہے ہوں۔ میں باہر نکل گیا۔ درخت کاٹنے والے آدمی اپنی کلہاڑیوں اور آروں کے ساتھ آن پہنچے تھے۔ برکت الہٰی انہیں مستعدی سے ہدایات دے رہا تھا۔

"دیکھئے برکت الہٰی صاحب، میں نے کل آپ کو بتا دیا تھا۔"

"کیا جی۔" وہ میرے درشت لہجہ سے تھوڑا سٹپٹا گیا تھا۔

"میں نے کل آپ سے کہا تھا کہ درخت ہمارے جانے کے بعد کٹیں گے۔"

"ہاں جی۔ مگر آج تو آپ چلے جائیں گے۔ آپ نے کل یہی بتایا تھا۔"

"جی ہاں ہم آج ہی جا رہے ہیں اور ابھی جا رہے ہیں۔ مگر جب تک ہم یہاں سے رخصت نہ ہو جائیں کسی درخت پہ کلہاڑا نہیں چلے گا۔"

"بہت اچھا جی۔" اور وہ فوراً کلہاڑے والوں سے مخاطب ہوا "اے بھئی دیکھو پہلے چائے شائے پی لو۔ اخلاق صاحب چلے جائیں۔ پھر کام شروع ہوگا۔"

کلہاڑے والوں نے مجھے تعجب سے دیکھا۔ دیکھتے ہی رہے اور میں جب وہاں سے ہٹ کر کوٹھی کے گیٹ کی طرف جا رہا تھا تو برکت الہٰی کو میں نے دیکھا کہ کلہاڑے والوں سے کچھ دبی زبان میں کہہ رہا ہے۔ بس مجھے ایک فقرہ سنائی دیا۔ "یہ بابو کچھ سنکی ہے۔"

ریڑھے آ گئے تھے۔ ایک تانگہ بھی آن پہنچا تھا۔ ریڑھے والوں کو ساتھ ملا کر میں نے جلدی جلدی سامان ریڑھوں پر لادا۔ تانگے کی پچھلی نشست پر بوجان کو ان کی پوٹلیوں اور بقچہ کے ساتھ بٹھا دیا۔ چند چیزیں میں نے ہاتھ میں تھامیں۔ والد صاحب کے کاغذات کا بستہ بغل میں دابا اور اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔

تانگہ چلنے لگا تو کلہاڑے والوں نے کتنے غور سے مجھے دیکھا۔ جب تانگہ کوٹھی کے گیٹ سے نکل رہا تھا تو دفعتاً کلہاڑا چلنے کی آواز میرے کان میں آئی۔ کچھ گھبرا کر ایک دم سے میں نے مڑ کر دیکھا۔ بدبختوں نے بسم اللہ مولسری سے کی تھی۔

۲

مکان سہ منزلہ۔ اُوپر سے نیچے تک کمرے ہی کمرے مگر ایسے کہ بالشت سے ناپ لو۔ صحن برائے نام کہ اُوپر سے دیکھو تو لگے کہ اندھیرے کنوئیں میں جھانک رہے ہیں۔ بوجان نے فوراً بوجھ لیا کہ متروکہ مکان ہے۔

"ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے گھروں کی لوگوں نے الاٹمنٹیں کرائیں اور کتنے تھے کہ تہارے الاٹمنٹوں والاٹمنٹوں کے الجھیڑے ہی میں نہیں پڑے۔ قبضے کر کرکے بیٹھ گئے مگر ہمارے بیٹے کے دماغ میں تو ایسی رئیسی گھسی ہوئی تھی کہ اس نے پروا ہی نہیں کی۔ متروکہ مکان میں رہنے والا ایسا کونسا ہے جو کرایہ ادا کرتا ہے۔ بس ایک ہم ہی دنیا سے نرالے ہیں۔"

مگر جب بوجان نے اڑوس پڑوس میں یہ نقشہ دیکھا کہ ایک ایک متروکہ گھر میں تین تین چار چار مہاجر خاندان ٹھنسے ہوئے ہیں تو انہیں اس کے مقابلہ میں کرایہ دار بن کر رہنے ہی میں عافیت نظر آنے لگی۔ بس پھر انہیں اس مکان سے ایک ہی شکایت باقی رہ گئی کہ فارغ ہونے کے لئے انہیں اُوپر تیسری منزل پر جانا پڑتا تھا۔ روز صبح کو جب وہ خالی لوٹے کے ساتھ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آتیں تو بڑبڑاتیں "بخت ماروں پہ یہ کیا خدا کی سنوار تھی کہ کھڈیاں آسمان پہ جا کے بنائیں۔" مگر اس مکان میں اچھے پہلو انہوں نے اتنے دریافت کر لئے تھے کہ یہ شکایت ان کے نیچے دب کر رہ گئی۔ یہ کیا کم بڑا فائدہ تھا کہ

پانچوں وقت اذان کی آواز گھر بیٹھے سنائی دیتی اور یوں نماز کے وقت کا پتہ چل جاتا۔ پھر قصائی کی دکان کتنی قریب تھی اور قصائی بھی کتنا اچھا تھا کہ خود ہی اچھی بوٹی والا گوشت بنا کر گھر پہ دے جاتا۔

مگر ایک روز یوں ہوا کہ ایک ٹیکسی دروازے پہ آ کر رُکی اور ایک ادھیڑ عمر عورت برمیں ساڑھی ماتھے پہ بندی اس سے اُتر کر ایک بچی کو انگلی پکڑائے اندر آئی۔ "میّا ذرا گھر دیکھنا ہے۔"

بوجان نے ناخوشگواری سے جواب دیا کہ "بی بی تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے۔ ہم تو ابھی اس گھر کو نہیں چھوڑ رہے۔"

"نہیں میّا، تم جگ جگ اس گھر میں رہو۔ ہمارا اب اس پہ کیا دھیکار ہے۔ میں تو اپنی لالی کو دکھانے لائی تھی۔ بوردڑ کھلا تو میری موسی کے پُتر نے آ کے کہا کہ دیدی میں یہ دیکھنے تیرے لہور جا رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ لالہ مجھے بھی لے چل۔ میں بھی اپنا گھر دیکھ لوں گی۔ لالی کو بھی دکھا لاؤں گی۔ دیکھ تو لے کہ میں نے اُسے کہاں جنا تھا۔"

بوجان نے حیرت سے اُسے سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر گھر کا ایک ایک کونہ اُسے دکھایا۔

"بی بی، اپنے سے پہلے کی تو میں بات کرتی نہیں۔ مگر جب سے میں آئی ہوں میں نے تمہارے گھر کو بہت سنبھال کے رکھا ہے۔ ہر برسات کے بعد سفیدی کراتی ہوں۔ ذرا کوئی کونہ جھڑ جائے فوراً راج مزدور کو بلا کے مرمت کراتی ہوں۔"

آنے والی بی بی نے گھر کا تفصیل سے جائزہ لیا اور گھر کی صفائی ستھرائی دیکھ کر تشکر آمیز نظروں سے بوجان کو دیکھا۔ پھر ایک کوٹھری جیسے کمرے میں لے جا کر بچی کو کھڑا کر دیا "لالی، یاں پہ تیری نال گڑی ہے۔" بس یہ کہتے کہتے اس کی آنکھ بھر آئی۔ بچی کی انگلی پکڑ، پلو سے آنکھ پونچھتی فوراً ہی باہر نکل آئی۔

"بی بی بیٹھو۔ چائے پی کے جائیو۔"

"ناتیا۔ اپنا ٹھیا دیکھنا تھا وہ دیکھ لیا۔ تم راضی خوشی رہو۔"

یہ جا وہ جا۔

بوجان کئی دن چپ چپ رہیں۔ پھر بولیں۔ "بیٹے، کوئی اور گھر تلاش کرو۔"

میں نے بوجان کو حیرت سے دیکھا "کیوں۔ اس گھر میں کیا خرابی پیدا ہو گئی۔"

"خرابی ہو یا نہ ہو۔ میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی۔"

"وجہ؟"

"مجھے شک آوے ہے۔ اور اب کے جو گھر کرائے پہ لو وہ متروکہ نہ ہو۔"

"وہ کیوں؟"

"میرے لال میں کچھ سوچ ہی کے کہہ رہی ہوں۔ کسی غریب کی آہ لینی اچھی بات تو نہیں ہے۔"

بوجان اکھڑیں سو اکھڑیں۔ مجھے اتنا کھٹکا یا کہ میں آخر کو زچ ہو گیا۔ بھاگ دوڑ کر کے ایک دوسرا مکان کرائے پہ لیا اور متروکہ مکان کو سلام کیا۔

"اس ڈوبے مولوی کو کیا ہو گیا ہے۔ نہ خود سوتا ہے نہ محلے والوں کو سونے دیتا ہے۔"

بوجان کو آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ مسجد کی ہمسائیگی جس کی وجہ سے انہیں یہ مکان اتنا پسند آیا تھا کیا معنی رکھتی ہے۔ مگر انہیں تعجب اس پر تھا کہ بیتے دنوں میں تو مسجد کی ہمسائیگی گھر کے لئے رحمت کا سایہ بن جاتی تھی اور اس ہمسائیگی سے ایک طمانیت قلب حاصل ہوتی تھی۔ اب ایسا کیوں نہیں تھا۔ میری سمجھ میں تو بات آتی تھی۔

اس زمانے میں مسجدوں میں وعظ کم اور عبادت زیادہ ہوتی تھی۔ پھر اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر کا بھی تو چلن نہیں تھا۔

"اللہ بخشے مولوی سبحانی ہماری مسجد میں اذان دیا کرتے تھے۔" بوجان کو چراغ حویلی کی ہمسایہ مسجد یاد آ گئی۔ "کیسا لحن تھا ان کی آواز میں۔ جو نماز سے بدکا ہوتا وہ بھی ان کی اذان سن لیتا تو مسجد کی طرف کھنچا چلا آیا اور کتنی اونچی آواز تھی ان کی۔ صبح کی ان کی اذان تو آس پاس کے گاؤں تک پہنچتی تھی۔"

"بوجان، وہ تو پھر لاؤڈ سپیکر کا کمال ہو گا۔"

"اے خاک پڑے تمہارے لاؤڈ سپیکر پہ۔ ہماری مسجد میں یہ تمہارا نام جہام نہیں تھا۔ مولوی سبحانی تو اسے شیطانی آلہ کہتے تھے۔ کسی نے ایک دفعہ اس کا نام ان کے سامنے لے دیا تھا۔ غصے سے کانپنے لگے۔ بولے یہ شیطانی آلہ مسجد میں آیا تو میں اذان دینی بند کر دوں گا۔"

مگر اس محلہ میں تو اس شیطانی آلہ کو کچھ زیادہ ہی رسوخ حاصل تھا۔ آئے دن یہاں شامیانے تنتے رہتے۔ آج فلانے کی شادی ہے۔ کل ڈھماکے کے ختنے ہیں اور شامیانہ اس طرح تنتا کہ گلی بند ہو جاتی۔ شامیانے کے ساتھ لاؤڈ سپیکر کہ اس زور پر فلمی گانوں کے ریکارڈ اتنا شور کرتے کہ بوجان عشا کی نماز کی خاطر کمرے کے دروازے کھڑکیاں سب بند کر لیتیں۔ کس مشکل سے نماز ختم کرتیں۔ کتنی مرتبہ تسبیح پھیرتے پھیرتے گڑبڑا جاتیں۔ جانماز لپیٹتے ہوئے بڑبڑاتیں کہ کمبختوں نے نماز پڑھنی دو بھر کر دی۔

بوجان تو بیزار تھیں ہی، میں بھی جلدی اس محلہ سے بیزار ہو گیا۔ یہاں سے بھاگنے کے جتن کرنے لگا۔ اب مکانوں کے کرائے اچھے خاصے بڑھ گئے تھے مگر میں نے دل میں کہا کہ زیادہ کرایہ دینا منظور ہے۔ اس محلہ میں رہنا منظور نہیں۔

مگر جو مکان زیادہ کرائے پہ لیا وہ نُورٌ علیٰ نُور تھا۔ جس گلی میں یہ مکان تھا اس کا

نقشہ عجب تھا۔ گلی کا گٹر مستقل اُبلتا رہتا۔ کتنی دفعہ اس کی صفائی کرائی۔ مگر ہر دفعہ یہی ہوا کہ چار چھ دن درست رہا۔ اس کے بعد پھر اُبلنے لگا۔ کبھی کبھی اتنا اُبلتا کہ گلی میں ایک اچھی خاصی تلیّا بن جاتی۔ تعفن اس پر مستزاد۔ ایک تعفن گٹر سے اُبلتے پانی کا، ایک تعفن کوڑے کے اس انبار کا جو پھیلتا بھی جا رہا تھا۔ بلند بھی ہوتا جا رہا تھا۔ کارپوریشن کی کوڑا گاڑی ہمارے یہاں وارد ہونے سے پہلے کبھی آتی ہو تو آتی ہو، ہمارے آنے کے بعد تو وہ یہاں کبھی آتے دیکھی نہیں گئی۔

سونے پر سہاگہ پڑوسن کے بچے کہ سویرے سویرے اس حال میں کہ آگا بھی کھلا ہے پیچھا بھی کھلا ہے۔ گھر سے نکل کر نالی پر قطار بنا کر بیٹھ جاتے۔ پھر ایک بچہ اس یکسانیت سے شاید بور ہو گیا یا شاید انفرادی حیثیت حاصل کرنے کے شوق میں پلٹن سے ٹوٹ کر اس نے ہمارے دروازے کے عین سامنے نالی پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ بوجان نے ایک دن دیکھا ضبط کیا۔ دوسرے دن دیکھا ضبط کیا۔ جب دیکھا کہ یہ تو روز کا معمول بن گیا تو ضبط کا یارا نہ رہا۔ پڑوسن کو دروازے پر کھڑا دیکھا تو باتیں شروع کر دیں۔ کوئی یہاں کی بات کوئی وہاں کی بات۔ آخر کسی قدر تامل کے بعد حرفِ شکایت زبان پر لائیں مگر اس طرح کہ اچھی خاصی لیپا پوتی بھی کر دی: "اے کوئی جان کر تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ آخر بچے ہی تو ہیں۔ اس عمر میں آگے پیچھے کا ہوش نہیں ہوتا"

پڑوسن نے بھی اپنی طرف سے بہت ضبط سے کام لیا۔ لہجہ میں اک ذرا درشتی پیدا ہوئی۔ بولی "اے بی بی میرے بچے ایسے نہیں ہیں کہ تیری میری نالی میں ہگتے موتتے پھریں۔ کوئی اور ہوگا۔ محلہ میں آخر اور بچے بھی تو ہیں"

پڑوسن نے اس وقت تو اتنا ہی جواب دیا۔ مگر اسی دن دوپہر کو وہ سامنے کے گھر کی کھڑکی سے جھانکتی بی بی سے مخاطب تھی اور غصے میں بھری بلند آواز میں

کہہ رہی تھی "بھلا میرے بچوں نے محلہ والوں کا کیا بگاڑا ہے کہ وہ ہاتھ دھو کے ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں غریب ہوں تو کسی سے دب جاؤں گی۔ کسی نے میرے بچوں کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا تو اس آنکھ میں تکلے بھونک دوں گی"

ان حالات میں ہمارا اس کوچے میں بسیرا کتنے دن رہ سکتا تھا۔

"اِن کمبخت گلیوں سے تو چھٹکارا ملا" بوجان نے نئے گھر کے گرد و پیش کو دیکھ کر اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

یہ مکان لبِ سڑک تھا۔ سو گلیوں والی مصیبتیں یہاں نہیں تھیں۔ پڑوس بچوں بچوں والا نہیں تھا۔ دائیں تو ایک چھوٹی موٹی کوٹھی تھی۔ کم از کم فاصلہ سے تو کوٹھی ہی کا تأثر دیتی تھی۔ بائیں ایک ورکشاپ تھی۔ جس میں چند رکشائیں چند سکوٹر مرمت کے لئے کھڑے رہتے تھے۔ اسی مرمت میں ایسا مرحلہ بھی آجاتا کہ مستری رکشا کو آن کر کے چھوڑ دیتا۔ اس وقت کتنا شور ہوتا اور بیچ بیچ میں پٹاخے سے چھوٹتے کبھی کبھی یہ عمل لمبا ہو جاتا۔ لگتا کہ مستری رکشا کو آن کر کے بھول گیا ہے۔ بس اس وقت بوجان تھوڑی پریشان ہوتیں۔ جب رکشا رکنے میں نہ آتی تو بالآخر تڑپ اُٹھتیں۔ "ارے اس نحوست مارے مستری سے کہو کہ کیوں تو ہمارے کانوں کا دشمن ہو گیا ہے۔ تیرے کان کے پردے تو پھٹ گئے۔ مگر ہمارے تو ابھی سلامت ہیں"

شروع میں یہاں ایک ورکشاپ تھی۔ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ اسی کے بغل میں ایک اور ورکشاپ کھل گئی۔ پھر یوں نظر آنے لگا کہ شہر کی ساری کھٹ گڑی رکشاؤں کا آخری ٹھکانا یہی ورکشاپس ہیں جو چھت کے نیچے کم اور کھلی سڑک

پر زیادہ پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کھڑاک کو یہاں پھیلتے دیکھ کر کسی نے کل پرزوں کی ایک دکان کھول لی۔ پھر ایک ٹوٹا پھوٹا چائے خانہ کھل گیا جو رکشا ڈرائیوروں کا مستریوں کا، آس پاس گھومتے پھرتے نکھٹوؤں کا مرجع بن گیا۔

دھواں، ڈیزل کی بُو، پھٹے ہوئے سائلنسروں کا شور، چائے خانے میں بجتے ہوئے فلمی ریکارڈوں کا ہنگامہ، کھٹ بگڑی رکشاؤں کی قطاریں۔ دیکھتے دیکھتے اس علاقہ کی کیسی کایا کلپ ہوئی اور سڑک جو شروع میں مجھے کشادہ نظر آتی تھی، اب کتنی تنگ دکھائی پڑتی تھی۔

"بیٹے میں تو جانوں کہ لال کوٹھی والی جگہ ہی اچھی تھی۔ خواہ مخواہ وہ جگہ چھوڑی تم نے خود ہی چھوڑی۔ اس بچارے نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ ارے درخت وہ کاٹ رہا تھا تو کاٹنے دیتے۔ آخر وہ اسی کی جگہ تو تھی اور وہ درخت ہمیں ایسے کونسے پھل دے رہے تھے۔"

بوجان بولتی رہیں۔ میں سُنتا رہا۔ ویسے مجھے بھی اب محسوس ہونے لگا تھا کہ اس جگہ کو چھوڑ کر غلطی کی۔ وہاں سے نکل کر کتنے مکان بدلے، کس کس گلی میں جا کر رہا۔ شہر بیشک نہیں چھوڑا۔ مگر مکان تو بہت بدلنے پڑے۔ جب ایک مکان میں رہتے کچھ برس گذر جاتے اور اس کے در و دیوار سے تھوڑی جان پہچان ہو جاتی تو مالک مکان زیادہ کرائے پر اٹھانے کا خیال دل میں باندھ کر سر پہ آن کھڑا ہوتا کہ مکان خالی۔ مالک مکان تقاضہ نہ کرتا تو مکان کی حالت زار دستانا شروع کر دیتی۔ تب خود ہی خیال آتا کہ یہاں سے اٹھ ہی جائیں تو اچھا کریں۔ مکان خستہ نہ ہوتا تو محلہ کی حالت خستہ ہوتی چلی جاتی اور پھر نئے ٹھکانے کی تلاش۔ جو گھر ملا پہلے سے خستہ ملا۔ جس محلہ میں جا کر رہا وہ پچھلے محلہ سے بدتر ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ میرا حال بھی بد سے بدتر ہوتا چلا گیا یا شاید اس شہر کا نقشہ ہی میری دربدری کے ساتھ ابتر ہوتا چلا گیا۔

"بیٹے میری رائے تو یہی ہے کہ لال کوٹھی والی جگہ ہی کو جا کے دیکھو۔ وہیں کہیں گھر مل جائے تو اچھا ہے۔"

میں نے بھی سوچا کہ واقعی رہنے کے لئے وہی جگہ مناسب تھی۔ میں خواہ مخواہ جذباتی ہو گیا۔ درخت کٹ رہے تھے تو کٹنے دیتا۔ آخر آدم بھی تو اتنا کٹ گیا اور کٹتا ہی چلا جا رہا ہے۔ میں نے اس پر کب احتجاج کیا۔

تو میں مکان کی تلاش میں ایک مرتبہ پھر اس نواح میں گیا۔ مگر میں تو وہاں جا کر گڑبڑا گیا۔ در و دیوار ہی بدلے ہوئے تھے۔ یہاں سے وہاں تک دکانیں ہی دکانیں مال و اسباب دکانوں کے اندر بھرا ہوا۔ اندر سے زیادہ باہر پھیلا ہوا۔ سواریوں کی ریل پیل۔ ریڑھے، رکشائیں تانگے، موٹریں۔ یہاں دکانیں زیادہ تر تعمیری سامان کی نظر آ رہی تھیں۔ اسی وجہ سے یہاں ریڑھوں کی بہتات تھی اور ان کی وجہ سے سڑک اتنی تنگ ہو گئی تھی کہ سواری میں سواری بھڑی نظر آتی تھی۔

تھوڑا آگے بڑھا تو اور ہی بھیڑ بھڑکا دکھائی پڑا۔ گوروں کے رد کئے ہوئے کوٹ پتلون، سوئیٹر، مفلر، اوور کوٹ، غرض ہر رنگ ہر طرز کی اُترن ریڑھیوں پر لدی ہوئی لوگ اس اُترن پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ خریداروں کی بھیڑ اتنی تھی کہ بیچ بیچ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ کس مشکل سے میں اس بھیڑ کے بیچ سے گذرا۔

میں نے بہت اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ لال کوٹھی یہاں کہاں تھی۔ کہیں اس کے آثار نظر نہ آئے۔ جیسے یہاں نہ کوئی لال کوٹھی تھی نہ کوئی درخت نام کی چیز تھی۔ میں لال کوٹھی کے سامنے والی اس خاموش سڑک کو دھیان میں لایا جس پہ درخت دو رویہ دور تک قطار باندھے دکھائی دیتے تھے۔ وہ سڑک تو معدوم نہیں ہو سکتی اسے تو یہیں ہونا چاہیئے۔ ضرور ہو گی۔ مگر میں اسے کسی صورت شناخت نہ کر سکا۔

میں حیران، میں کہاں آگیا ہوں، وہ شجر حجر کہاں کھو گئے، وہ شجر حجر، وہ کشادہ رستے
وہ پُرفضا۔ در و دیوار۔

"بوجان، وہ جگہ تو اب بہت بدل گئی ہے۔"

"اے بیٹے، کتنی بدل گئی ہوگی۔ جگہیں ایسے تو نہیں بدلا کرتیں کہ بالکل ہی بدل جائیں۔"

"مگر بوجان، وہ جگہ بالکل بدل گئی ہے۔"

"اچھا تم کہتے ہو تو مانے لیتی ہوں۔ ویسے آخر تم اتنے دن وہاں رہے۔ کسی جاننے والے کو پکڑا ہوتا۔ کوئی مکان اس کے واسطے سے مل ہی جاتا۔"

"بوجان، میں آپ کو کیا بتاؤں۔ نہ وہ لوگ، نہ وہ در و دیوار، نہ وہ درخت، نہ وہ رستے وہاں تو دنیا ہی بدلی ہوئی ہے وہ جگہ اب رہنے کے لائق نہیں رہی۔"

"اچھا۔" بوجان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ انہیں میری بات کا اعتبار نہیں آیا ہے۔ بس جیسے یہ سوچ کر کہ اڑیل لڑکے سے کون بحث کرے چپ ہو گئی تھیں۔

میں نے آنکھوں سے دیکھا نہ ہوتا تو مجھے بھی کہاں اعتبار آتا۔ یہاں سے مجھے احساس ہوا کہ دنیا تب سے اب تک کتنی بدل گئی ہے اور شہر کیا سے کیا ہو گیا ہے شہر کا وہ پچھلا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ پت جھڑ کی دوپہریں۔ سڑک پر پیلے پتوں کا بستر بچھا ہوا۔ ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا تو ایک دم سے پیلی ٹہنیوں میں کھلبلی مچتی سوکھے پتے کھڑکھڑاتے، ٹہنیوں سے باجماعت جھڑتے اور پکی سڑک پر فٹ پاتھ پر گر کر پہلے سے گرے ہوئے پتوں کے ساتھ رَل مِل جاتے۔ ہوا کا جھونکا گزر جاتا اور پھر

خاموشی چھا جاتی۔ پھر یہ خاموشی اس وقت ٹوٹتی جب پھر کوئی تیز جھونکا آتا یا جب کوئی کار فراٹے سے اس سنسان راہ سے گزرتی اور سوکھے زرد پتے اس طرح کلبلاتے جیسے بچوں کی بھیڑ تالیاں بجاتی کار کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ کار تیزی سے گزر جاتی، بچے تھک کر پیچھے رہ جاتے۔ لال حویلی کی سڑک سے لے کر مال روڈ تک اس شہر کی کتنی سڑکیں پت جھڑ کے اس منظر کے ساتھ تصور میں گھوم گئیں۔ موسموں کا اپنا جادو ہوتا ہے۔ موسموں میں سب سے بڑھ کر پت جھڑ کا کہ ایک تو اس کا اپنا جادو، ایک زرد پتوں سے پھیلتی ویرانی کا جادو، خاص کر دوپہریں کہ پت جھڑ کی دوپہریں جیٹھ کی ٹیکاٹیک دوپہریوں سے بڑھ کر جادو بھری ہوتی ہیں۔ زمانہ، میں نے سوچا، کتنا بدل گیا ہے اب اس شہر میں ٹریفک کے شور اور فلک بوس عمارتوں کے ہجوم میں پہروں اور موسموں کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ نہ جاتی رُت کی اُداسی کا احساس ہوتا ہے نہ آتی رُت کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ نہ دیواروں چھتوں پر اُترتی چڑھتی دھوپ اپنے اُترنے چڑھنے کا پتہ دیتی ہے نہ ڈھلتے دن کی دبے پاؤں پھیلتی چھاؤں اپنی خبر دیتی ہے اور کان نہ اس سے آشنا کہ درخت کیا کلام کرتے ہیں نہ یہ سننے پر آمادہ کہ پرندے کونسی بانی سناتے ہیں۔ شہر بدل گیا۔ شہر والوں کے حواس کند ہو گئے۔

تب رفتہ رفتہ بوجان کی بات نے دل میں گھر کرنا شروع کیا۔ خیر بوجان تو آہستہ سے اتنا کہہ کر چپ ہو جاتی تھیں کہ بیٹے اس طرح اُٹھاؤ چولہا کب تک بنے پھرو گے۔ قدم جمانے کے لئے اور سر چھپانے کے لئے اپنا کوئی جھونپڑا ہونا چاہیے مگر جب بیوی نے گھر میں قدم رکھا تو اس نیک قدم نے یہی بات زیادہ بلند آہنگی

سے اور تکرار کے ساتھ کہی۔ بیوی جب نئی نئی ہوتی ہے تو اس کی بات زیادہ اثر کرتی ہے۔

"دیکھتے نہیں ہو، مکانوں کے کرائے کتنے بڑھ گئے ہیں۔ آج مکان بدلیں تو آدھی تنخواہ تو کرائے ہی میں نکل جائے گی۔"

میں قائل ہو گیا۔ زبیدہ نے بات غلط تو نہیں کہی تھی۔ مکانوں کے کرائے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ شروع میں یہاں مکان کتنے تھوڑے کرائے پر مل جایا کرتے تھے اور کتنی آسانی سے مل جاتے تھے۔ ان شروع کے برسوں میں مجھے جو بھی مشکل پیش آئی مکان میں بسنے کے بعد پیش آئی۔ مکان بدلنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ مگر برس جتنے گذرتے گئے، مکان کی تلاش میں اتنی ہی مشکل پیش آتی گئی۔ شہر پھیل رہا تھا۔ نئی آبادیاں وجود میں آ رہی تھیں۔ نئی تعمیرات کا وہ زور تھا کہ کشادہ علاقے گنجان ہوتے چلے جا رہے تھے۔ جو قطعات کب سے بے مصرف پڑے تھے وہاں عمارتیں قطار اندر قطار کھڑی ہو چکی تھیں۔ مگر مکان جتنی کثرت سے تعمیر ہوئے اتنی ہی ان کی قلت ہوتی چلی گئی۔ جتنی قلت ہوتی گئی اتنے کرائے بڑھتے گئے۔

تو ایک تو کرائے کے مکان کی دقتوں کا احساس۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید بوجان ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ قدم جمانے کے لئے زمین کا اپنا کوئی ٹکڑا ہونا چاہیے۔ شاید میں بکھرا ہوا آدمی اسی وجہ سے ہوں کہ بکھرا ہوں۔ قدم جمانے اور سر چھپانے کے لئے کوئی کونا مل جائے تو شاید اپنی زندگی میں بھی کوئی جماؤ پیدا ہو جائے سو مکان بنانے کا خیال جس سے آگے وحشت ہوا کرتی تھی اب میرا مسئلہ بن گیا۔ اب یہ وقت آیا کہ میں نے دفتر میں ساتھ کام کرنے والوں کے غم روزگار میں حصہ بٹانا شروع کر دیا۔ یہ لوگ کب سے اپنی کالونی کی کھچڑی پکا رہے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے یہی ایک ذکر کہ ایل ڈی اے سے کیا بات ہوئی۔ کس افسر نے کیا وعدہ کیا، کونسی

ہاؤسنگ سکیم کب بروئے کار آنے والی ہے۔ میں ان باتوں سے کتنا بور ہوتا تھا۔ دفتر میں چائے پیتے پیتے کوئی رفیق کار یہ ذکر چھیڑ دیتا تو میں بس بے مزہ ہو جاتا "یار اس وقت نہیں۔ تمہاری حساب کتاب کی باتوں سے چائے کا لطف غارت ہو جاتا ہے۔" مگر اب اس ذکر فکر میں میری دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ اور جب کالونی کا منصوبہ سالوں کی بھاگ دوڑ کے نتیجہ میں پروان چڑھا تو میں رفقائے کار کی خوشی میں برابر کا شریک تھا۔ قرعہ اندازی ہوئی۔ میرے نام بارہ مرلے کا پلاٹ نکلا۔ میں باغ باغ ہو گیا۔

"بیٹے دیکھ بھی لیا ہے کہ زمین کیسی ہے۔"

"بوجان اچھی زمین ہے۔"

"پہلے استخارہ کرا لیا ہوتا۔ زمین استخارے کے بغیر نہیں لینی چاہیے۔"

"استخارہ؟ ـــــ اگر استخارہ منع آجاتا تو پھر میں تو پلاٹ سے گیا تھا۔"

"میرے لال۔" بوجان نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "زمین کا ساتھ عمر بھر کا ہوتا ہے۔ خریدنے سے پہلے بہت سوچنا سمجھنا پڑتا ہے۔"

میں دل میں ہنسا۔ بوجان اپنے زمانے کے حساب سے سوچ رہی تھیں۔ جو زمانہ انہوں نے دیکھا بھرتا تھا، اس میں بے شک یہی طور تھا۔ آدمی مکان زندگی میں ایک مرتبہ بناتا تھا۔ جہاں جس زمین پہ بنا لیا سو بنا لیا۔ پھر وہ پشتوں تک چلتا تھا۔ اپنی چراغ حویلی ہی تھی۔ کس زمانے کی بنی ہوئی تھی۔ کتنی نسلیں اس میں پروان چڑھیں۔ کتنے موسم اس پر آئے اور گذر گئے۔ ان موسموں کے ساتھ کتنی چڑیوں نے اس کے روشندانوں میں گھونسلے بنائے، انڈے دیئے، بچے نکالے، بچوں کے پر آنے کے ساتھ گھونسلے چھوڑ کر اڑ گئیں۔ کتنی انجنہاریوں نے اس کی اونچی دیواروں پر اپنے مٹیا محل تعمیر کئے۔ اپنے سندر سیاہ سنہری وجود کے ساتھ ان میں رچیں بسیں، بچے دیئے اور پھر ریزہ ریزہ جمع کر کے بنائے ہوئے محل کو چھوڑ کر کہیں آگے سدھار گئیں۔ ہماری بڑی بو نے کبھی کسی بچے کو انجنہاری کا گھر توڑنے

چھوڑنے کی اجازت نہیں دی۔ کہا کرتی تھیں کہ جس گھر میں انجہناری کے گھر بنانے کا مطلب تھا ایک نئی پیدائش کی خبر انجہناری کے گھر میں بھی اور اس گھر میں بھی جہاں وہ اپنا گھر بناتی تھی۔ بڑی بوکے اس عقیدے کو بوجان نے بھی اپنایا۔ انہوں نے مجھے یا میرے ساتھ کے کسی بچے کو انجہناری کا گھر اجاڑنے کی اجازت نہیں دی۔ مگر وہ زمانہ تو چراغ حویلی کے ساتھ گذر گیا۔ اب تو عقلمندوں نے یہ طور پکڑا تھا کہ ہر نئی ہاؤسنگ سکیم کے شروع ہونے پر پلاٹ کے لئے عرضی داغ دی۔ پلاٹ مل گیا تو اسے تھوڑے دنوں ڈالے رکھا۔ پھر منافع پر بیچ کر کسی اگلی سکیم میں پلاٹ کے لئے بھاگ دوڑ کی۔ پلاٹ ملنے پر مکان بنا بھی لیا تو بھی لازم نہیں کہ اس میں پوری عمر گذاریں۔ نئے زمانے کے تعمیر کرنے والے جس شوق سے مکان تعمیر کرتے ہیں۔ اسی شوق سے منافع ملنے کی صورت میں اسے فروخت کر ڈالتے ہیں۔

تو خیر میں نے بوجان کو سمجھایا کہ نئی ہاؤسنگ سکیموں میں زمین حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے یہ کہ ان سکیموں میں استخارے کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ ان کی بنیاد قرعہ اندازی پر ہے۔ پھر جو پلاٹ الاٹ ہو گیا سو ہو گیا۔ مگر بوجان کو اس وقت تک اطمینان نہیں ہوا۔

جب تک انہوں نے مولوی غلام رسول کو بلا کر پوچھ نہیں لیا۔ مولوی غلام رسول بھی پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ اپنے علم سے زمینوں کا نیک و بد فوراً جان لیتے تھے۔ انہوں نے بوجان کو اطمینان دلایا کہ زمین کسی بد روح کے اثر میں نہیں ہے۔ مگر یہ کہ صدقہ تو ہر زمین مانگتی ہے۔ سو بنیاد رکھتے وقت اس کا اہتمام ہو جانا چاہیے۔ وہ ہوا۔ اس مبارک موقعہ پر بوجان نے انہیں ہی زحمت دی۔ انہوں نے جنتری دیکھ کر بنیاد رکھنے کے دن اور ساعت کا تعین کیا۔ نیو رکھے جانے سے پہلے پلاٹ کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر دیر تک کچھ پڑھا، چاروں سمتوں میں منہ کر کے پھونکا اور پھر کالے بکرے کے گلے پر چھری پھیری اس کے گلے سے ابلتا ہوا گرم گرم خون بنیاد میں ڈالا گیا۔

نیو تو دھری گئی اور جب نیو دھری جاتی ہے، یہی لگتا ہے کہ بس اب مکان بن کر کھڑا ہوا۔ مگر ایسا کہاں ہوتا ہے۔ میرے پاس الہ دین کا چراغ ہوتا تو راتوں رات مکان بنا کر کھڑا کر دیتا۔ مگر یہ تو تھکا دینے والا عمل نکلا۔ زمین کہے مجھے چھو کے دیکھو مکان کہے مجھے شروع کر کے دیکھو۔ جنگ اور عشق کے متعلق تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ ان کے آغاز کا تو پتہ ہوتا ہے، مگر انجام کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ مکان کی تعمیر بھی جنگ اور عشق کی ٹکر کا قصہ ہے۔ بوجان سچ ہی کہتی تھیں کہ جن اور راج مزدور ایک دفعہ گھر میں داخل ہو جائیں تو پھر انہیں خدا ہی نکالے تو نکلتے ہیں۔ تعمیر کا آغاز میں نے کس ولولے سے کیا تھا۔ آخر میں کتنا تھک گیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اسی طرح چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ پیسے کو جیسے پہیے لگ گئے ہوں۔ تعمیر ہوتے مکان کا منہ کھلا ہوتا ہے۔ رقم انڈیلے چلے جاؤ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس کنوئیں میں گئی۔ زبیدہ نے شادی کے دوسرے ہی دن سے گھر کی خستہ حالی اور گلی کی ابتری دیکھ کر دل پہ دھر لیا تھا کہ اپنا مکان بنانا ہے اور اسی وقت سے اس خاطر پیسہ جوڑنا شروع کر دیا تھا اور حق یہ ہے کہ چند ہی برسوں میں اچھی خاصی پونجی جوڑ لی تھی۔ مگر وہ جمع پونجی تو پہلے ہی ہلہ میں نکل گئی۔ پھر قرضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دفتر سے قرضہ ہاؤسنگ فنانس کارپوریشن سے قرضہ، بنکوں سے قرضہ، ایک بنک سے، دوسرے بنک سے، پھر ٹکرم لڑا کے کسی تیسرے بنک سے پھر دوستوں اور ملنے والوں کی باری آئی۔ پہلے لمبے قرضے۔ پھر جتنا جس سے مل جائے۔ آخر آخر میں تو سو سو دو دو سو تک کے قرضے بھی لئے گئے۔ جس نے جتنا دے دیا۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سمجھ کر غنیمت جانا۔ یہ سوچ کر دل کو سمجھایا کہ بوند بوند کر کے ہی تالاب بھرتا ہے۔ مگر بھرتا دکھائی تو دے۔

میں نے جگری دوستوں سے پریشانی بیان کی۔ کامریڈ نے تو زہرخند سے میری بات کا جواب دیا "ہور چوپو گنے"۔ اصل میں کامریڈ تو سرے سے مکان بنانے ہی کے خلاف تھا۔ مکان بنانے پہ کیا موقوف تھا، میں نے جب ملازمت شروع کی تھی تب

بھی اس کا ردِ عمل خلاف ہی تھا۔ جب میں نے شادی کی اس پر بھی اس نے بیزاری ہی کا اظہار کیا۔ شادی، گھر بار، ملازمت، اس کے حساب سے یہ سب جھمیلے ہیں جو آدمی کو انقلاب سے دور لے جاتے ہیں اور سرمایہ داروں سے سمجھوتہ کرنے اور ضمیر کا سودا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

ممتاز نے البتہ دلجوئی کی مگر عجب انداز سے کہنے لگا "یار کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم نے کوئی نیا قرضہ لیا ہے۔ مکان تو ہمیشہ قرضے ہی سے بنتا ہے اور مکان کے لئے قرضے اسی طرح لئے جاتے ہیں"۔

"مگر یار قرض جہاں جہاں سے مل سکتا تھا وہاں سے لے چکا۔ مکان پھر بھی اُدھ بنا ہے۔ آگے گاڑی کیسے چلے"؟

"یہی ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔ راج مزدوروں کو چھٹی دو۔ ٹھیکیدار سے معذرت کرو۔ مگر نہ راج مزدور ٹلتے ہیں نہ ٹھیکیدار پنڈ چھوڑتا ہے۔ بس پھر کسی نہ کسی طرح گاڑی چل پڑتی ہے اور لشٹم پشٹم چلتی رہتی ہے"۔

"کیسے چلتی رہتی ہے"؟

"ایسے کہ جب آدمی باہر سے قرضے لے چکتا ہے تو پھر گھر بار کا جائزہ لیتا ہے۔ پہلے بیوی کا زیور گروی رکھا جاتا ہے۔ پھر جہیز میں آئی ہوئی قیمتی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ سب سے آخر میں گھر کے برتن بکتے ہیں"۔

"یار یہ تو تم بہت بھیانک نقشہ پیش کر رہے ہو"۔

"کوئی بھیانک نقشہ نہیں ہے۔ جب مکان بن جاتا ہے تو مرپٹ کر قرضے ادا ہو ہی جاتے ہیں"۔

جو بات ممتاز نے کہی وہی زبیدہ نے بھی کہی۔ میں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ بولی "تم مکان بن جانے دو۔ قرضوں کا کیا ہے وہ تو ادا ہو ہی جائیں گے۔ بس

یہی ہوگا کہ گھر کے اخراجات کم کرنے پڑیں گے۔ نہیں کھائیں گے تر نوالہ۔ روکھی سوکھی کھا لیں گے۔ گھر تو اپنا ہوگا۔ اپنے گھر میں آدمی روکھی سوکھی کھا کے بھی خوش رہتا ہے"۔

اصل میں ایک چوک مجھ سے بھی ہوئی۔ وہ چوک ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہوئی۔ خرچ کا تخمینہ لگاتے وقت یہ بات تو ملحوظ ہی نہیں رکھی گئی کہ فیس نذر بھی کرنی ہوں گی۔ آخر نقشہ بھی منظور کرانا تھا اور سیمنٹ کا پرمٹ بھی لینا تھا اور ایسے ہی چھوٹے چھوٹے سو خرچے تھے۔ پھر یہ کہ تخمینہ لگاتے وقت تعمیری سامان کی قیمتیں کچھ تھیں، تعمیر ہوتے کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔

خیر جیسی پڑتی ہے سہارنی پڑتی ہے۔ اس صورتِ حال سے مفر تو نہیں تھا۔ تعمیر ہوتا مکان آدمی کو بھاگنے تو نہیں دیتا۔ تو مکان لشٹم پشٹم گذارے لائق بن ہی گیا۔ بیشک اس میں کھانچے رہ گئے تھے۔ مگر ممتاز نے اچھی بات کہی کہ نیا بنا ہوا مکان مکمل طور پر بنا ہوا کبھی نہیں ہوتا۔ کمیاں رہ ہی جاتی ہیں جو بعد میں پوری ہوتی رہتی ہیں تو میں نے بھی سوچا کہ جو حصے ادھ بنے ہیں انہیں فی الحال نظر انداز کرو اور مکان کو مکمل جانو۔ بس اس میں آباد ہو جاؤ۔ تب میں نے پہلی مرتبہ باہر کھڑے ہو کر مکان پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ ایک حیرت اور ہیبت نے مجھے آ لیا —— سنگ و خشت کا ایک پہاڑ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اچھا یہ تعمیر میں نے کی ہے۔ عجب تجربہ ہے۔ نیا مکان آدمی کو رجھاتا بھی ہے، ڈراتا بھی ہے۔ زبیدہ خوش تھی۔ بو جان بھی خوش تھیں اور میں؟ میں خوش بھی تھا اور اُداس بھی۔ تھوڑے رومانس کا احساس تھوڑا خوف۔ ایک اطمینان کہ آخر کار اپنا ایک گھر ہو گیا۔ ساتھ میں بے اطمینانی بھی اور تذبذب۔ بات یہ ہے کہ پتہ تو نہیں ہوتا کہ نئے در و دیوار سے ہمارا رشتہ کس رنگ سے قائم ہوگا، ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ کتنے معاملات کیا کیا قصے ہوتے ہیں۔ شادی غمی کے کتنے واقعات گذرتے ہیں۔ تب کہیں جا کر در و دیوار کے ساتھ

رشتہ قائم ہوتا ہے۔ پھر ہر شادی ہر غمی کے ساتھ جوان در و دیوار کے بیچ گذرتا ہے۔ رشتہ گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس آن مجھے چراغ حویلی کی یاد آئی۔ اس کے در و دیوار سے رشتے میرے پیدا ہونے سے پہلے قائم ہو چکے تھے۔ میری پیدائش سے پہلے کتنے جنازے اس ڈیوڑھی سے نکل چکے تھے اور کتنے ڈولے اس ڈیوڑھی میں داخل ہو چکے تھے۔ میری پیدائش کے بعد بھی

اس ڈیوڑھی سے کئی جنازے نکلے۔ کئی ڈولے اس ڈیوڑھی میں آئے، کئی ڈولے اس ڈیوڑھی سے رخصت ہوئے۔

آخری جنازہ کہ اس ڈیوڑھی سے نکلا، میاں جان کا تھا کہ اس کے بعد خاندان کا خاندان اس ڈیوڑھی سے نکل گیا۔ خیر میاں جان تو بعد میں گئے۔ بڑی بُوان سے پہلے ہی سدھا گئیں۔ کتنے دنوں پلنگ پہ پڑی رہیں۔

سانپ والی کوٹھری کے برابر والے کمرے میں ان کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ جانے کب سے بیمار چلی آ رہی تھیں۔ تندرست بھی ضرور رہی ہوں گی۔

مگر میں نے ان کی تندرستی کا زمانہ نہیں دیکھا۔ جب سے ہوش سنبھالا انہیں بستر بیماری پہ پایا۔ دن رات اسی کمرے میں بستر پہ دراز رہنا، تھوڑا تھوڑا کراہتے رہنا۔ کبھی تکلیف کم ہوتی اور چہرے پہ بحالی آجاتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتیں۔ پھر دور دور کی سوجھتی۔

"اے بیٹے اخلاق، یہ کیا سنگھاڑے والا گلی میں بول رہا ہے"

"جی بڑی بو"

"اے ہے پوری فصل گذر گئی میں نے تو سنگھاڑا چکھا ہی نہیں" گلے میں پڑے بٹوے سے اکنی نکالتے ہوئے "یہ لے ذری اکنی کے سنگھاڑے میرے لئے لا دے۔ چکھ کے تو دیکھوں"

"ابھی لایا"

دم کے دم میں سنگھاڑے حاضر۔

بو جان کا آ کر دیکھنا اور ٹوکنا "بڑی بو، یہ آپ کیا بد پرہیزی کر رہی ہیں۔ خدا خدا کر کے تو طبیعت ذرا سنبھلی ہے۔ سخت چیزیں کھائیں گی تو پھر طبیعت بگڑ جائے گی"

"نہیں بہو، سخت نہیں ہیں۔ کھا کے دیکھو۔ بالکل پھول ہیں۔

"پھر بھی۔ ہیں تو آخر سنگھاڑے ہی"

"بہو جاتی فصل کا میوہ ہے اور ہم بھی اب چلنے ہار ہیں۔ اگلی فصل کس نے دیکھی ہے۔ چلی گئی تو یہ تمہارے انگھاڑے سنگھاڑے کھانے کے لئے واپس تو نہیں آؤں گی"۔

"نہیں بڑی بو، شیطان کے کان بہرے۔ ایسی بدشگنی کا کلمہ کیوں منہ سے نکالتی ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ آپ کے چہرے پہ رونق ہے۔ آپ کے بیٹے تو واقعی ڈر گئے تھے۔ مگر اللہ نے بڑا کرم کیا"

اس دن بڑی بو کے چہرے پہ واقعی رونق تھی۔ مگر رات ہوتے ہوتے طبیعت بگڑی وہ چراغ کا آخری سنبھالا تھا۔ بس پھر ایک دم سے گل ہو گیا۔ چہرے پہ آئی ہوئی رونق اسی طرح رہ گئی۔

دوسرے دن جب بو جان کے دل کو تھوڑا قرار آیا تو انہوں نے پرسا دینے والیوں کے سامنے ذکر کرتے ہوئے بار بار یہی کہا "بی بی کیا بتاؤں، چہرے پہ کتنا سکون تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ مر گئی ہیں۔ بس ایسا لگتا تھا کہ سو رہی ہیں۔ جیسے باتیں کرتے کرتے آنکھ لگ گئی ہو" پھر جنازے پہ تبصرہ "کیا بتاؤں جنازے پہ کیسی رونق تھی۔ وہ جنازہ تھوڑا ہی لگ رہا تھا۔ یہ لگتا تھا کہ برات نکل رہی ہے"

بڑی بو کے کمرے میں چالیس دن تک پابندی کے ساتھ چراغ جلا اور اگربتی سلگی۔ چالیسویں کے بعد ایک دن بو جان کہنے لگیں "بی بی چالیس دن تک اس کمرے میں کیسی رونق رہی ہے۔ اگربتی تو میں شام کو سلگاتی تھی۔ مگر کمرہ چوبیسوں گھنٹے مہکتا رہتا

تھا اور خوشبو بھی عجب طرح کی تھی۔ اے بی بی چالیسواں ہوتے ہی گھر میں کیسا سناٹا چھایا ہے۔ جیسے آئے مہمان چلے گئے ہوں۔"

چالیسویں پر عزیز رشتہ دار دور دور کے شہر سے چل کر آئے۔ تب مجھے اندازہ ہوا اور حیرانی بھی کہ یہ خاندان کتنا بڑا ہے اور کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے۔ کتنے دور پرے کے تایوں، چچاؤں کو پھوپھیوں، پھوپھاؤں کو، بہنوں بہنوئیوں کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ شیریں کو بھی جیسے پہلی ہی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ زمانہ جب ہم ساتھ ساتھ کھیلے تھے، بھول بسر چکا تھا۔ اب تو شیریں کا طور ایسا تھا۔ جیسے وہ مجھے جانتی ہی نہیں۔ مجھ پہ کیا موقوف تھا، چراغ حویلی کی کسی لڑکی لڑکے سے بات کرنا ہی اسے گوارا نہیں تھا۔ الگ الگ رہتی تھی۔ کتنا بڑاپن آگیا تھا۔ اس میں چچی جان جس طرح بیبیوں کے بیچ بیٹھ کر اس کی تعریف کرتی تھیں۔ اس سے وہ اور اترانے لگی تھی۔ چچی جان نے سب کے بیچ بیٹھ کر کس فخر سے اعلان کیا تھا کہ "ہماری شیریں اب کالج میں پہنچ گئی ہے۔ ماشاءاللہ سے اتنی ذہین ہے کہ اپنے باپ سے انگریزی میں باتیں کرتی ہے۔"

سب اس خبر پر ششدر رہ گئے۔ اصل میں ہمارے خاندان کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک لڑکی تختی اور رحل کی منزلوں سے آگے نکل کر کالج میں پہنچ گئی تھی اور انگریزی لکھ پڑھ رہی تھی۔ تھی تو ابھی وہ فرسٹ ایئر ہی میں۔ لیکن مجھے اس نے ایسے مشورے دیئے جیسے وہ کالج کی زندگی کا لمبا تجربہ رکھتی ہے۔ مشوروں کی منزل بعد میں آئی۔ شروع میں تو وہ الگ الگ اور دور دور رہتی تھی۔ بس ایسا لگتا تھا کہ میرے اور اس کے بیچ میلوں کا فاصلہ ہے۔ مگر کیا ہوا کہ بوجان نے ایک دن مجھے ٹہوکا کہ بیٹے، شیریں آئی ہوئی ہے۔ اس سے تم کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ کالج میں داخلہ کے لئے تمہیں کیا کرنا ہے اور شیریں یہ سن کر کہ میں بھی کالج میں قدم رکھنے لگا ہوں ایک دم سے مجھ پہ مہرباں ہوگئی۔ بس چھوٹتے ہی وہ بڑی بن گئی اور مجھے اپنا چھوٹا سمجھ کر کالج کی زندگی کے نشیب و فراز سمجھانے لگی۔

پھر اس قسم کے مشورے کہ مجھے کون کونسے مضمون لینے چاہئیں اور انگریزی میں مہارت پیدا کرنے کے لئے کیا کیا پڑھنا چاہیئے۔

کالج کی حد تک میں نے بھی اسے بڑا مان لیا اور وہاں کی زندگی کے متعلق جی بھر کر معلومات حاصل کیں۔ میں یہ بھول ہی گیا کہ ابھی شیریں کو کالج میں گئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ خیر اس کے بعد میں بڑا بن گیا یہ اس وقت ہوا جب اسے حویلی کے پُراسرار گوشوں کے متعلق کرید ہوئی اور میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنا شروع کیا۔ سانپوں والی کوٹھری کے متعلق جو میں نے بڑی بو سے اور بوجان سے سنا تھا۔ سب اُسے سنا ڈالا۔ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ "وہ کالا ہے۔"

"بالکل کالا بھجنگ۔" اور یہ لمبا اور یہ موٹا جیسے اژدھا ہو۔"

اور اسی سانس میں میں نے اسے جعفر کی موت کا قصہ سنا ڈالا۔ جعفر سانپ کو مارنے میں بہت مہارت رکھتا تھا۔ محلہ میں بلکہ پوری بستی میں جس گھر میں بھی سانپ نکلتا وہی مارنے کے لئے بلوایا جاتا تھا۔ مگر پھر اسے بھی بالآخر سانپ ہی نے ڈسا۔

"پتہ ہے اسے سانپن نے کیوں ڈسا تھا؟"

"کیوں ڈسا تھا؟"

"وہ سانپ کی آنکھیں کچلنا بھول گیا تھا۔"

"تو پھر؟"

"واہ شیریں تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں ہے۔ سانپ کو جب کوئی مارتا ہے تو اس کی آنکھوں میں مارنے والے کی تصویر اُتر آتی ہے۔ سانپن آکر اس کی آنکھوں کو دیکھتی ہے۔ پھر جس آدمی کی شکل اس کی آنکھوں میں نظر آتی ہے اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پھر اُسے چھوڑتی نہیں۔"

شیریں پہلے ہی حیران ہو رہی تھی۔ اب بالکل حیرت زدہ ہوگئی اور جیسے دل ہی دل

میں ڈر رہی ہو۔ آستین سے مجھے پکڑا۔ "چلو یہاں سے چلیں۔" اور ہم دونوں سانپوں کی کوٹھڑی کے پاس سے چل کر دالان میں آئے، دالان سے صحن میں وہاں سے مردانے میں جہاں اونچے من والا کنواں تھا اور جس پر ہر پہر نیم کی چھاؤں رہتی تھی۔ بس ہم کنوئیں کے من پر آ کر بیٹھ گئے۔ سب سے الگ تھلگ۔ ادھر دالان میں بوجان، چچی جان، تائی اماں غرض سب ہی بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ شکوے شکایتیں، تعریف و تنقیص ہونے والی اور ہو کر ٹوٹ جانے والی منگنیوں کے تذکرے، ہو جانے والی شادیوں پر تبصرے اور ادھر ہم دونوں حیرت کے عالم میں گم سُم۔ بس اسی طرح حویلی کے اندر دو دنیائیں آباد تھیں۔ ایک تو یہی معمولات کی دنیا، روزمرہ کی باتیں، دیکھے بھالے لوگ اور ایک غیر معمولی کی دنیا، انہونی باتیں، ان دیکھی ان جانی مخلوق کہ اچانک کسی آن کسی گھڑی بس ایک جھلک نظر آتی، ایک اُڑتا سا سایہ، یا محض آہٹ اور حویلی کی معمولات کی دنیا میں ایک حیرت اور خوف کی لہر دوڑ جاتی۔ بس یوں حویلی میں ہونی اور انہونی کی دم بھر کے لیے آنکھیں چار ہوتیں۔ اس سے ایک زلزلہ سا آتا۔ پھر یہ اپنی راہ، وہ اپنی راہ۔ بڑی بُو جب تک زندہ رہیں۔ اس یقین کے ساتھ زندہ رہیں کہ اوپر والے کمرے میں کوئی رہتا ہے۔ ایک دفعہ تو انہوں نے کچھ دیکھا بھی تھا۔ جمعرات کی شام تھی کہ انہیں یہ لگا کہ جیسے کوئی سفید براق کپڑوں میں ہے اور اندر کمرے میں گیا ہے۔ مگر جب وہ کمرے میں گئیں تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ بس کمرہ خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔

"بڑی بو!" بوجان نے ایک دفعہ ان کے سامنے تجویز پیش کی تھی۔ "پھر کسی عامل کو بلا کے یہاں عمل کرایا جائے۔"

"نا بہو، وہ تو کوئی بزرگ روح ہیں۔ حویلی کی حفاظت پر مامور ہیں۔ ہمارے جو خسر تھے وہ پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ میں تو جانوں انہیں نے کسی کو تعینات کیا ہے۔"

اور سانپ کی کوٹھڑی والے کو تو انہوں نے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ دیکھا تھا۔ "اللہ

ہی جانے کب سے یہاں رہتا ہے۔ بہت پرانی روح ہے۔ مگر انصاف کی کہنی چاہیے، اس نے کبھی کسی کو ستایا نہیں۔ ہم نے تو کبھی اس کی پھنکار بھی نہیں سنی۔ میں نے ایک مرتبہ بہو تمہارے خسر سے ذکر کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ ہم سے کچھ نہیں کہتا۔ ہم بھی اس سے کچھ نہیں کہتے۔ بس اُسے چھیڑنا مت۔"

وہاں گھروں میں سانپ کچھ زیادہ ہی نکلتے تھے۔ مسلمان کے گھر میں سانپ نکلتا تو جعفر کو بلوایا جاتا کہ وہ اس مہارت سے اُسے گھیرتا کہ ہار کر وہ اس کی لاٹھی کی زد میں آتا اور مارا جاتا۔ ہندو کے گھر میں نکلتا تو گبیر کو بلوایا جاتا کہ وہ سانپ کو مارتا نہیں تھا۔ پکڑ لیتا تھا۔ کس کمال سے دم کو چٹکی میں دبا کر ایک جھٹکا دیتا کہ اس کی کمر ٹوٹ جاتی، اور پھر وہ اسی طرح اسے دم سے چٹکی میں پکڑے ہاتھ سے زاویہ قائمہ بنائے ہوئے بستی سے باہر جاتا اور پیپانی املی تلے کے اس کنوئیں میں جو زمانہ ہوا خشک ہو چکا تھا اُسے پھینک آتا۔

کنوئیں وہاں بہت تھے۔ مگر سوکھا کنواں تو بس یہی ایک تھا۔ جو ہندوؤں کے گھروں میں نکلنے والے سانپوں کا بندی خانہ بنا ہوا تھا۔ مگر کیسا بندی خانہ، سانپ گرنے پر پہلے تو تہہ میں پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ کے بیچ گھڑی بھر کے لیے تڑپتا، پھر کونوں کھدروں میں غائب ہو جاتا۔ تو سوکھا کنواں تو یہی ایک تھا۔ باقی سب کنوئیں شاداب تھے۔ ہاں ایک اور کنواں تھا۔ دوسرے کنوؤں سے مختلف۔ یہ کھاری کنواں تھا۔ اس کا پانی تو بس نالیوں کو دھونے ہی کے مصرف میں آتا تھا۔ باقی ٹھنڈے میٹھے کنوئیں تھے کہ ان کا پانی صراحیوں اور کچے گھڑوں میں بھرے جانے کے بعد مٹی کی سوندھی مہک بھی پکڑ لیتا تھا۔ سب سے ٹھنڈا میٹھا پانی ہماری حویلی کے کنوئیں کا تھا اور میاں جان رمضان کے دنوں میں ایک اہتمام اور کرتے تھے۔ کیوڑے کی بوتلیں کی بوتلیں اس میں انڈیل دیتے تھے۔ بس پھر رمضان بھر ہم کیوڑے سے مہکتا پانی پیتے تھے۔

بوجان اس حویلی کی یاد کے ساتھ کرائے کے مکانوں میں کیسے گذارہ کر رہی تھیں؛ یہ میں محسوس تو کر سکتا تھا، مگر میرے لئے اس کے سوا چارہ کیا تھا۔ ویسے بوجان اپنے دکھ کا ذکر زیادہ نہیں کرتی تھیں۔ بس جب میں کرائے پر نیا مکان لیتا تب وہ اس مکان کا جائزہ لیتیں اور حویلی کو یاد کر کے لمبا ٹھنڈا سانس لیتیں اور چپ ہو جاتیں۔ ہاں کبھی کبھی سمجھاتیں کہ آدمی کے لئے اپنی چھت اور اپنا کونہ کتنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ تو میری شادی کے بعد ہوا کہ انہوں نے بہو کی کمک پا کر مکان بنانے کی ضرورت۔ پر ضرورت سے زیادہ زور دینا شروع کر دیا اور جب میں نے مکان بنا لیا تو زبیدہ کتنی خوش تھی اور بوجان کتنی مطمئن تھیں۔ مگر میں افسردہ تھا۔ اینٹ پتھر کا ایک پہاڑ خود میرا کھڑا کیا ہوا میرے سامنے کھڑا تھا اور مجھے ایک تذبذب نے گھیر رکھا تھا کہ اس کے ساتھ میری رفاقت کیا صورت اختیار کرے گی۔ سو جب میں اس گھر میں داخل ہو رہا تھا تو تعلقات کے نئے امکانات کے روبرو تھا، ایک نئے رشتے کی دہلیز پر۔

۳

ہر زمین ہر آدمی کو راس نہیں آتی۔ بعض زمینیں اکل کھری ہوتی ہیں کہ اپنے کسی باسی کو بستے نہیں دیکھ سکتیں، اپنے اجاڑ پن میں خوش رہتی ہیں۔ بعض زمینیں زود حس ہوتی ہیں کہ بسنے والوں سے طبیعت میل کھا جائے تو ان پر کشادہ ہو کر انہیں نہال کر دیتی ہیں۔ طبیعت میل نہ کھائے تو ان پر تنگ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مگر یہ آگاہی تو بعد کی بات ہے ان دنوں مجھے ان باتوں کا شعور کہاں تھا۔ میں تو کبھی زمینوں کا مزاج داں نہیں رہا۔ میرے تو تصور میں بھی کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ زمین بھی محبت اور نفرت کر سکتی ہے۔ ہمیشہ یہی سمجھا کہ محبت اور نفرت آدمی کے مشغلے ہیں۔ ان جذبوں سے زمین نا آشنا ہے زمین آدمی سے محبت نہیں کرتی۔ آدمی زمین سے محبت کرتا ہے اور کبھی کبھی تو اس طرح ٹوٹ کر کرتا ہے۔ جیسے زمین بھی عورت ہو، بلکہ عورت سے بڑھ کر عورت۔

تو میں نے اس طرح سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے تو قرعہ میں نکلنے والے پلاٹ کو اس زاویے سے دیکھا تھا کہ وہ کونے کا پلاٹ ہے یا کہیں بیچ میں پھنسا ہوا ہے اور یہ کہ مین روڈ سے قریب رہے گا یا دور پڑے گا۔ زمین کے بھی جذبات ہوتے ہیں، وہ بھی خوش اور ناخوش ہوتی ہے یہ بوجان کا عرفان تھا۔ نئے گھر میں آ کر پھر انہوں نے اپنے حساب سے تجویزیں پیش کیں۔

"اے دلہن، نئے گھر میں آکے اس طرح تو نہیں بیٹھ جایا کرتے کہ نہ اللہ کا نام، نہ رسولؐ کا کلمہ۔ ایسے گھر میں فرشتے قدم نہیں رکھتے۔"

"پھر بوجان، مٹھائی منگا کے نیاز دلائے دیتے ہیں۔"

"اے ہے دلہن، خالی نیاز دلا کے بیٹھ جاؤ گی۔ برادری کنبہ والے، ملنے جلنے والے کیا کہیں گے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟ میلاد کرو کہ بیبیاں جمع ہوں۔ کچھ اللہ رسولؐ کا ذکر ہو، کچھ بچوں بڑوں کی چہل پہل ہو۔ ہنسی خوشی کی آوازیں گونجیں۔ گھر میں اسی طرح خوشی رچتی بستی ہے۔"

پھر بوجان نے چراغ حویلی کے کب کب کے قصے سنا ڈالے کہ کس موقعہ پر کونسی خوشی کی تقریب ہوئی تھی اور اس میں کیا ڈھول ڈھمکا ہوا تھا۔ کتنے دنوں کے بعد بوجان کی زبان کھلی تھی ورنہ چراغ حویلی سے نکل کر تو انہیں چپ لگ گئی تھی۔ وہاں وہ کتنا چہکتی بولتی رہتی تھیں۔ یہاں آکر ساری چہک مہک رخصت ہوگئی تھی۔ بس نئے مکان میں قدم رکھا اور زبان کھل گئی۔ . . . شاید اپنے مکان میں بیٹھ کر ان میں حوصلہ پیدا ہوگیا تھا۔ گیا ہوا اعتماد بحال ہوگیا۔ کتنی رات تک چہکتی رہیں۔ چراغ حویلی اچانک ان کے تصور میں جی اٹھی تھی۔

'میاں جان سنایا کرتے تھے کہ جب چراغ حویلی بنی تھی تو چاندی کی طشتریوں میں بالوشاہیں بٹی تھیں۔ برادری کے ہر چنے کو ایک ایک چاندی کی طشتری میں دو دو بالوشاہی بھیجی گئی تھی اور بی بی ڈیوڑھی میں نوبت رکھی گئی تھی۔ چالیس دن تک نوبت بجی۔ نوبت بجانے والے کو جامدانی کے انگرکھے کے ساتھ پورا جوڑا دیا تھا۔"

"بوجان، چراغ حویلی کب بنی تھی؟"

"بیٹے، یہ تو مجھے پتہ نہیں۔ میرے تو اس گھر میں آنے سے پہلے کی بات ہے۔ تمہارے

لکڑ دادا کے وقتوں میں کسی وقت بنی تھی۔ حویلی کی منڈیروں کے کوؤں نے اللہ رکھے پانچ پشتیں پروان چڑھتے دیکھی تھیں۔ بیٹے تم پانچویں پشت میں ہو۔"

"بوجان، اس میں کوؤں کی کیا تخصیص ہے۔"

"بیٹے، کوے کی عمر لمبی ہووے ہے۔ سو برس میں اس کا ایک پر سفید ہووے ہے۔ ویسے تو خدا تمہارا بھلا کرے زمین والا بھی جو سانپ والی کوٹھری میں رہوے تھا سو برس سے زیادہ کی عمر کا تھا۔"

"کمال ہے بوجان اتنی عمر۔"

"ارے بیٹے اس زمانے میں تو آدمیوں کی عمریں بھی بہت ہوا کرے تھیں۔ اللہ بخشے تمہاری پردادی جو تھیں، غدر کے قصے تو ایسے سناوے تھیں جیسے کل کی بات ہو۔ انگریز جرمن کی لڑائی دیکھ کے آنکھیں موندی ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پوری صدی دیکھی تھی اور ماشاء اللہ چلتی پھرتی دنیا سے گئیں۔ آخر وقت تک دانت سلامت تھے۔ بس ایک دفعہ شکایت کی تھی کہ دانت جواب دے رہے ہیں۔ بھٹے کے دانے مجھ سے چبتے نہیں۔"

بس بوجان اپنی رو میں چراغ حویلی کے اگلے پچھلے قصے سناتی چلی گئیں۔ پہلی رات تو انہیں باتوں میں کٹ گئی۔ اچھا خاصا رتجگا ہوگیا۔ کہیں پچھلی رات کو سوتے ہیں اور صبح سویرے اٹھ بیٹھے۔ کم از کم میری آنکھ تو تڑکے ہی کھل گئی۔ نئے گھر کی صبح بھی نئی نئی لگ رہی تھی اور آسمان کتنا تازہ نظر آرہا تھا۔ نکلتا سورج یوں دکھائی دیا جیسے آج ہی پیدا ہوا ہے۔ میں نے پورے گھر میں گھوم پھر کر اوپر نیچے چڑھ اتر کر جائزہ لیا کہ سورج اس گھر میں کس طرف سے نکلتا ہے اور پہلی کرن ہماری کونسی منڈیر پر چمکتی ہے۔ گھر میں یہ دیکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ آخر سورج سے بھی تو نباہ کرنا ہوتا ہے۔ نئے گھر میں قدم رکھنے کے ساتھ چاند سورج ستارے آسمان ہوا، بارش، سب ہی سے نئے سرے سے افہام و تفہیم کرنی ہوتی ہے۔ دھوپ چھاؤں کا نقشہ سمجھنا ہوتا ہے۔ دیکھنا ہوتا ہے کہ دھوپ کس رنگ سے

اُترتی چڑھتی ہے اور چھاؤں کس طور پھیلتی سمٹتی ہے۔

اس ایک صبح پہ موقوف نہیں ان دنوں روز ہی صبح منہ اندھیرے میری آنکھ کھل جاتی۔ آنکھ کھلتی کہ فوراً ہی ساری نیند آنکھوں سے غائب ہو جاتی۔

زبیدہ کی خواہش تھی کہ ہمارے اس گھر کا کوئی نام بھی ہونا چاہیے۔ کتنے نام تجویز ہوئے اور رد ہوئے۔ میں نے کہہ دیا تھا میں گھر کے نام کے ساتھ اپنا نام نتھی نہیں کروں گا۔ آخر ایک سیدھے سے نام پر اتفاق رائے ہو گیا۔ آشیانہ۔ اور اب میں اس گھر میں صبح ایسے کرتا جیسے پرندے آشیانے میں صبح کرتے ہیں۔ تڑکے آنکھ کھلتی۔ بس میں پھریری لے کے فوراً چھت پہ پہنچتا پھیلتے اُجالے اور نکلتے سورج کے عمل کا جائزہ لینے لگتا۔ وہ صبحیں کتنی نئی اور اجلی لگتی تھیں اور فضا میں کتنی شادابی ہوتی تھی۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ دنیا نئی نئی پیدا ہوئی ہے یا میری نئے سرے سے پیدائش ہوئی ہے یا کہہ لیجیے کہ جیسے میری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ شادی کے بعد کمروں میں، برآمدوں میں صحن میں، بس پورے گھر میں ایک نئی مہک، نئی حرارت سرسراتی محسوس ہوتی ہے۔ جب آدمی اپنا نیا مکان بناتا ہے اس وقت بھی کچھ یہی کیفیت ہوتی ہے۔ کم از کم میں تو یہی محسوس کر رہا تھا کہ میری زمین سے نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ زمین کے ایک خوبصورت قطعہ سے۔ در و دیوار کے بیچ ایک نئی حرارت۔ کتنے زمانے کے بعد مجھے زمین سے وصل حاصل ہوا تھا اور آسمان سے شرفِ باریابی۔ وہ جو اس گھر میں قدم رکھتے ہوئے مجھے اُداسی نے آلیا تھا اور ایک تذبذب نے اس کے اب کوئی اثر آثار باقی نہیں تھے۔

اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ لوگ گلیوں سے نکل کر نئی آبادیوں، نئی ہاؤسنگ سکیموں کی طرف کیوں دوڑ رہے ہیں۔ پہلے تو میں اُسے نو دولتیے پن کا مظاہرہ جانتا تھا۔ اب پتہ چلا کہ وہ گلیوں سے کیوں بیزار ہیں آگے لوگوں نے کچھ کھلے آسمان سے کچھ دشت کی پہنائیوں سے ڈر کر نگر آباد کیے، نگر میں پتلی پتلی گلیاں بنائیں، ان گلیوں میں مکان

اس طور بنائے کہ ایک دوسرے میں پیوست، منزل کے اُوپر منزل یوں انہوں نے اپنی دانست میں بے اماں آسمان سے امان حاصل کر لی اور زمین کی بے پناہ وسعتوں سے پناہ لے لی۔ مگر جب زمین و آسمان سے چھپ کر انہوں نے بہت دن گذار لیے تو پھر انہیں رفتہ رفتہ تنگ گلیوں اور اونچے مکانوں سے خفقان ہونے لگا۔ کیا مشکل ہے کہ نہ یوں چین ہے نہ ووں چین ہے۔ آدمی زمین کی وسعت اور آسمان کی لامحدودیت سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ گلیوں گھروں کی تنگی سے اسے خفقان ہوتا ہے۔ تو وسعت کے خوف کی منزل سے گذر کر اب ہم تنگی سے خفقان کی منزل میں ہیں۔ گلیوں سے کھلے علاقوں کی طرف لپک رہے ہیں اور کشادہ مکان بنانے میں مصروف ہیں۔ شاید اسی قسم کا کوئی خفقان ہوا یا کرلئے کے مکانوں سے جو بے ٹھکانا ہونے کا احساس پیدا ہو گیا تھا، اس سے نجات پانے کی خواہش، یا محض ماں اور بیوی کا دباؤ ہو، بہر حال وجہ کچھ بھی ہو میں نے مکان بنایا اور ایسے علاقہ میں بنایا۔ جو کھلا کھلا تھا۔ مجھے یہاں کشادگی محسوس کر کے خوشی ہو رہی تھی۔ ماں اور بیوی کو یہ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی کہ اپنا مکان کھڑا ہو گیا اور جائداد بن گئی۔ کتنی خوش تھیں دونوں کہ جامہ میں پھولی نہیں سماتی تھیں۔ کس دھوم سے انہوں نے میلاد کا اہتمام کیا اور بالوشاہیاں بانٹیں۔ کھانہ دانہ الگ۔ اس روز خوب دیگ کھٹکی اور کتنی چہل پہل رہی۔ بچوں نے تو وہ چیخم دھاڑ مچائی کہ میں تو پناہ مانگ گیا۔ پتہ نہیں رات کس وقت تک جاگ باگ رہی۔ میں تو سو گیا تھا۔

"بوجان" آج ہمارے پچھواڑے پھانسیاں لگیں گی"۔

"اے دلہن، صبح ہی صبح کیسا منحوس کلمہ منہ سے نکال رہی ہو"۔

میں نے آدھے سوتے آدھے جاگتے یہ گفتگو سنی۔ بات کا آگا پیچھا سمجھ میں نہیں آیا۔ پھانسیاں۔ کیسی پھانسیاں۔ باہر نظر ڈالی۔ اچھی خاصی دھوپ نکل آئی تھی۔ بس فوراً ہی اُٹھ بیٹھا۔ یوں تو جب سے میں اس گھر میں آیا تھا سویرے منہ اندھیرے آنکھ کھل جاتی تھی مگر آج دیر سے آنکھ کھلی۔ شاید اس وجہ سے کہ رات دیر سے سویا تھا۔

منہ ہاتھ دھو کر جب ناشتہ کی میز پہ پہنچا تو زبیدہ نے ناشتہ چنتے چنتے خبر سنائی۔

"اخلاق تم نے سنا۔ آج ہمارے پچھواڑے پھانسیاں لگ رہی ہیں۔"

اب میں چونکا۔ زبیدہ کو غور سے دیکھا "پھانسیاں؟ کیسی پھانسیاں؟"

"جیسی پھانسیاں ہوتی ہیں۔"

"ہوش میں تو ہو؟"

"میں نے اپنے مغز سے اُتار کے تو بات نہیں کہی ہے۔ سارے محلے میں شور پڑا ہوا ہے۔ سُنا ہے کہ تختے تیار ہو رہے ہیں۔"

بس اسی گھڑی پڑوس سے نصیبن بوا داخل ہوئیں۔ التجا بھرے لہجہ میں بولیں۔

"بیگم صاب جی، ذرا پھانسی کے تختے دیکھ لوں۔"

"نصیبن بوا، پھانسی کے تختے ہمارے گھر میں تو نہیں لگے ہیں۔"

"اے خدا نہ کرے کہ تمہارے گھر میں لگیں۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ تمہاری جو پچھلی دیوار ہے اس کے پرے تختے لگ رہے ہیں۔ کہو تو ذرا ادھر ول جا کے جھانک کے دیکھ لوں۔"

نصیبن بوا کے اس بیان سے زبیدہ پر انکشاف ہوا کہ پھانسی کے تختوں کا نظارہ تو اپنے گھر سے کیا جا سکتا ہے۔ بس ذرا پچھلے حصہ میں جا کر دیوار سے جھانکنے کی ضرورت ہے اور اچانک اس نیک بخت کو اتنا شوق ہوا یا کہہ لیجئے کہ تجسس ہوا کہ مجھے میرے حال پہ چھوڑ نصیبن بوا کو ساتھ لے پچھلے گوشے کی طرف چل دی۔

تھوڑی دیر میں واپس آئی، آنکھوں میں لذتِ دید لئے ہوئے "نصیبن بوا ٹھیک ہی

تو کہہ رہی تھیں۔ ارے یہ تو ہمارا بالکل پچھواڑہ ہے۔ دیوار سے ذرا جھانکو تو سامنے ہی تختے نظر آ رہے ہیں۔ دو تو لگ گئے ہیں۔ تیسرا لگ رہا ہے۔ ذرا دیکھو تو ہی جا کر۔"

لیکن میرا ردعمل زبیدہ کے ردعمل سے بالکل مختلف تھا۔ زبیدہ نے پھانسی کے تختوں کے بارے میں جتنی گرمجوشی دکھائی اتنا ہی میں سرد ہوتا گیا۔ ویسے تو میں پچھلے دن کے اخبار ہی میں یہ خبر پڑھ چکا تھا کہ تین پھانسیاں سرعام لگائی جانے والی ہیں تو اس اطلاع پر مجھے چونکنا تو نہیں چاہیئے تھا۔ شاید میں اس اطلاع پر نہیں چونکا تھا۔ جس اطلاع نے مجھے چونکایا اور پھر سرد کیا وہ یہ اطلاع تھی کہ یہ پھانسیاں میرے گھر کے بالکل قریب دی جانے والی تھیں۔ میں نے اخبار میں خبر پڑھتے ہوئے اس پر دھیان ہی نہیں دیا کہ پھانسیوں کی جائے وقوع کونسی ہے۔ خبر میں یہ تفصیل تو دی ہوئی تھی کہ پھانسیاں جیل کے باہر لب سڑک دی جائیں گی۔ اس سے مجھے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ یہ واقعہ میرے گھر کے نواح میں گذرے گا۔ مگر میں نے ابھی تک اس بات پہ بھی دھیان کب دیا تھا کہ میرا یہ گھر جیل کے نواح میں واقع ہے۔ روز میں اس سڑک سے آتا جاتا تھا۔ جو جیل کے عقب کی فصیل کے برابر برابر چلی گئی ہے۔ مگر مجھے یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ یہ سڑک میرے مکان کے عقب میں ہے کہ اپنی پچھلی دیوار سے جھانکوں تو یہ سڑک اور اس سے پرے جیل کی عقبی دیوار صاف نظر آئے گی۔ لیکن اگر یہ بات میرے دھیان میں ہوتی بھی تو میں خبر پڑھ کر یہ کیسے طے کر سکتا تھا کہ پھانسی کے تختے اسی عقبی دیوار کے سائے تلے میرے گھر کے رُخ پر نصب کئے جائیں گے اور اخبار میں تو سب ہی طرح کی خبریں آتی ہیں۔ قتل کی خبریں، اغوا کی خبریں، بم پھٹنے کی خبریں۔ مگر اخبار پڑھتے ہوئے ایک احساس یہ رہتا ہے کہ یہ سب واقعات ہم سے دور کہیں گذر رہے ہیں۔ یہ کہ آج کی سب سے سنسنی خیز خبر کی جائے واردات عین ہمارے آشیانے کا پچھواڑہ ہوگا، یہ تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بہرحال میں اس سارے قصے پر کچھ ایسا بے مزہ ہوا کہ زبیدہ کے اصرار کے باوجود میں

اس طرف جانے اور دیوار سے جھانکنے پر رضامند نہ ہوا۔ بلکہ زبیدہ نے جتنا اصرار کیا اتنا ہی میں اس تجویز سے بیزار ہوتا گیا۔

"اے ہے دیکھ تو لو کہ تمہارے گھر کی دیوار کے اس طرف ہو کیا رہا ہے"۔

"بس بیگم تم ہی دیکھو۔ مجھے دفتر جانے میں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے"۔ اور میں ناشتہ کی میز سے اُٹھ ایک بے تعلقی کے ساتھ دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

ایسے سنسنی خیز واقعہ سے میری بے تعلقی کی وجہ ایک اور بھی تھی۔ میں جس محلہ میں رہا محلہ والوں کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں سے میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ الگ ہی رکھا۔ گلی محلہ کے لوگوں کا کیا ہے، ذرا کوئی بات ہو ان میں ایک گرمی آجاتی ہے۔ خوشگوار واقعہ ہو یا ناخوشگوار، دونوں صورتوں میں ان کے یہاں ایک زبردست تجسس پیدا ہو جاتا ہے اور چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں۔ جس محلہ میں بھی رہا میں نے یہی دیکھا اور ہمیشہ یہ طور برتا کہ کبھی ان کے اس قسم کے ذوق و شوق میں ان کا شریک نہیں بنا۔ جیسے میں ایسی باتوں سے بہت بالا ہوں۔

دفتر پہنچا تو دیکھا کہ میز میز وہی ایک موضوع گفتگو ہے۔ دفتر کا کام کم ہوا پھانسیوں پر گفتگو زیادہ ہوئی۔ ہر کلرک، ہر چپراسی بیتاب نظر آتا تھا کہ کسی طرح دفتر ختم ہو اور وہ اُڑ کر جائے واردات پر پہنچ جائے۔ ایسے بھی تھے کہ اُٹ سیدھا بہانہ کر کے دفتر کے ختم ہونے سے پہلے ہی کھسک لئے۔ ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ دفتر میں آج ہاف ڈے ہونا چاہئیے۔

"بھائی وہ کس خوشی میں؟"

"پھانسیاں دیکھنے جانا ہے جی۔ اگر پھانسیوں کے بعد ہم پہنچے تو پھر وہاں جانے کا فائدہ کیا ہوگا"۔

کن مشکلوں سے لوگوں نے دفتر کا وقت گذارا۔ اور جب دفتر ختم ہوا تو کتنی بیتابی سے دفتر سے دوڑ لگائی ہے۔ لگتا تھا کہ سارا دفتر اسی طرف ڈھل جائے گا۔

گھر واپس جانے کے لئے مجھے اپنا راستہ بدلنا پڑا۔ جیل والی سڑک تو اتنی بھر چکی تھی کہ ادھر سے سکوٹر پر گذرنا مجھے سخت دشوار نظر آیا۔ سواریوں کا ایک سیلاب اُمنڈا ہوا تھا۔ ٹریفک کے سپاہی اپنی اچھی خاصی نفری کے باوجود ٹریفک کو کنٹرول کر نہیں پا رہے تھے۔ ایک تو ٹریفک کا شور، پھر ٹریفک والوں کی سیٹیوں کا شور، ایک طوفان اُٹھا ہوا تھا۔ کتنے آڑے ترچھے راستوں سے گھوم پھر کر میں اپنے گھر پہنچا۔ مگر اپنی گلی میں بھی آج گاڑیوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ گھر میں قدم رکھا تو دیکھا کہ زبیدہ حواس باختہ ہے۔

"زبیدہ پھانسیاں جنہیں لگ رہی ہیں انہیں لگ رہی ہیں، تمہیں کیا ہوا"۔

"لوگوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے"۔

"کیوں؟"

"کہتے ہیں کہ چھت پہ جانے دو۔ وہاں سے پھانسیاں دیکھیں گے"۔

"نہیں چھت پر کوئی نہیں چڑھے گا"۔

"میں نے تو بہت منع کیا مگر کمبخت بعض تو ایسے ڈھیٹ نکلے کہ میں چلاتی رہ گئی۔ انہوں نے ایک نہ سنی۔ چھت پر چڑھ گئے"۔

میں نے ڈانٹ پھٹکار کر انہیں نیچے اُتارا اور گھر سے نکالا۔

"ادھر کتنے بچے دیوار پہ چڑھے بیٹھے ہیں۔ میری تو سنتے نہیں۔ ان سے بھی تم ہی نبٹو"۔

اور میں نے ادھر جا کر بچوں کے کان اینٹھے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر کے انہیں بھگایا۔

پھر محلے کے باہر کے لوگوں سے جو لگاتار چلے آ رہے تھے نبٹا۔ پتہ نہیں شہر کے کس کس کونے کھدرے سے لوگ نکل نکل کر آ رہے تھے۔ ان کا تانتا ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دروازے پر جانا نو وارد کی التجا اور ٹکا سا جواب دے دینا کہ نہیں صاحب یہ گھر ہے تماشا گاہ نہیں ہے۔

ایک دفعہ پھر دروازے کی گھنٹی بجی اور ساتھ میں کسی نے دھڑ دھڑ دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ میں نے جاکر دروازہ کھولا۔ اجنبی کو دیکھا۔ روکھے پن سے پوچھا "فرمایئے"۔

لجاجت سے بولا "اگر آپ تھوڑی مہربانی کریں اور اک ذرا اجازت دیدیں تو میں آپ کی چھت ۔۔۔۔"

میں نے بے صبری سے اس کی بات کاٹی "آپ کو پتہ ہونا چاہیئے کہ یہ گھر ہے۔ یہاں شریف لوگ رہتے ہیں۔ آپ لوگوں نے اس گھر کو کیا سمجھا ہے"۔

"دیکھئے، آپ برا مان گئے۔ قصہ یہ ہے کہ میں بہت دور سے آرہا ہوں"

"بہت دور سے؟ کہاں سے؟"

"فیصل آباد سے"۔

"اسی کام کے لئے آئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ یہی سوچا تھا کہ ذرا آؤٹنگ ہوجائے گی۔ پھانسیاں بھی دیکھ لیں گے۔ یہاں آکر دیکھا تو یہاں سے وہاں تک آدمی ہی آدمی ہے۔ کہیں قدم ٹکانے کو جگہ نہیں مل رہی۔ میں نے سوچا کہ آپ سے اپیل کردیکھوں کہ آپ اپنی چھت سے مجھے دیکھنے کی اجازت دے دیں۔ نہیں تو میرا فیصل آباد سے آنا بیکار جائے گا۔ جانے کتنے ضروری کام چھوڑ کے آیا ہوں"۔

"جی نہیں"۔ میں نے قطعی جواب دیا اور دروازہ بند کرلیا۔ مگر ابھی دروازہ بند کیا ہی تھا کہ پھر گھنٹی بج گئی۔ بس پھر تو میرا پارہ بالکل چڑھ گیا۔ بھنا کر دروازہ کھولا جیسے چھوٹتے ہی آنے والے پر جھپٹ پڑوں گا۔ مگر سامنے اپنا کامریڈ کھڑا تھا۔ میں حیران رہ گیا "کامریڈ، تم بھی؟"

"ہاں یار، میں نے سوچا کہ تماشا ہے تو تماشہ ہی سہی"۔

میں نے اسے اندر لاتے ہوئے اطلاع دی کہ میں نے کسی کو چھت پر چڑھنے نہیں دیا۔

نہ دیوار سے جھانکنے کی اجازت دی ہے۔

"کون بھڑوا تمہارے گھونسلے کو کھوندنے اور دیوار کو پھاندنے آیا ہے"۔ کامریڈ نے ہمارے آشیانے کو گھونسلہ کہنا شروع کردیا تھا۔

"مگر پھر تم پھانسیوں کا تماشہ کیسے دیکھو گے؟"

"کامریڈ، تماشہ تو میں دیکھتا ہوا آرہا ہوں۔ لوگ پھانسیوں کا تماشا دیکھنے کے لئے ادھر ڈھل رہے ہیں۔ میں پھانسیاں دیکھنے والوں کا تماشا دیکھتا دیکھتا یہاں چلا آیا۔ کامریڈ بہت خلقت اُمنڈی ہوئی ہے۔"

میں نے جل کر کہا "کامریڈ، یہ سب سالے تمہارے عوام ہیں۔ جن کا تم اُٹھتے بیٹھتے قصیدہ پڑھتے ہو"۔

کامریڈ نے میری بات کو سنی ان سنی کردیا۔ کہنے لگا "میں کہتا تھا تو تمہیں یقین نہیں آتا تھا۔ اب تو تم اندازہ کرسکتے ہو کہ کوڑے لگنے کے موقعہ پر تماشا دیکھنے کے لئے کتنے لوگ جمع ہوتے ہوں گے"۔

"کمال لوگ ہیں"۔

"اس شہر کے لوگ۔ کہتے ہیں کہ جب نادر شاہ نے دلّی میں قتل عام کا حکم دیا اور یہ خبر یہاں پہنچی تو ایک زندہ دل نے دوسرے سے کہا کہ چلو چلئے۔ چل کے دلّی میں قتلام کا تماشہ دیکھیں"۔

اسی گھڑی زبیدہ گھبرائی ہوئی آئی "اجی کیا تم نے گیٹ کھول دیا ہے۔"

"نہیں تو"۔

"چھت پہ تو لوگ چڑھے بیٹھے ہیں۔ کمبخت چھت ہی کو نہ لے بیٹھیں۔ ادھر دیوار پہ بچے لدے ہوئے ہیں۔ دیوار آج ضرور بیٹھ جائے گی"۔

میں اُٹھنے لگا تھا کہ کامریڈ نے ٹوک دیا "بیٹھ جاؤ کامریڈ"۔

"نہیں یار، ان لوگوں کا کچھ انتظام کرنا پڑے گا"۔

"ان لوگوں کا اس وقت کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔"

"اس وقت لوگوں کا ریلا آیا ہوا ہے۔ جب لوگوں کا ریلا آتا ہے تو پھر تم جیسے بوڑھے لوگ اُسے نہیں روک سکتے۔"

میں نے کامریڈ کو طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔۔ آج ریلا غلط آیا ہے۔ کل کو صحیح آئے گا۔" کامریڈ نے فوراً ٹکڑا لگایا۔

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ "تم لوگ خیالی پلاؤ پکانے میں جواب نہیں رکھتے۔"

گھنٹی پھر بجی۔ میں نے جا کر گیٹ کھولا تو ایک بوڑھیا ایک ننھے بچے کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی۔ "بڑی بی کیا بات ہے۔"

"پُتر مجھے تو دیکھنے دکھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مگر یہ میرا پوتا بہت ضد کر رہا ہے کہ پھانسیں دیکھوں گا۔ تو پُتر ذرا اس بچے کو دکھانا ہے۔"

بڑی بی نے اتنی لجاجت سے بات کہی کہ میرا دل واقعی پسیج گیا۔ "جاؤ بڑی بی تم بھی تماشہ دیکھو، اپنے پوتے کو بھی دکھاؤ۔"

بڑی بی نے مجھے بہت دعائیں دیں اور پوتے کا ہاتھ پکڑے پکڑے پچھواڑے کی دیوار کی طرف چلی گئیں۔ اور نعیمن بوا نے تو صبح ہی اپنا حق منوا لیا تھا۔ اب انہیں مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بے تکلف آئیں اور زبیدہ کو ٹہوکا۔ "اے بیگم صاب پھانسیوں کا ویلا ہو رہا ہے۔ یہ کام کا کونسا وقت ہے۔" زبیدہ پہلے ہی عجلت میں تھی۔ نعیمن بوا کے فقرے نے اس پر قمچی کا کام کیا۔ لپک جھپک چائے ٹرے میں سجا میرے سامنے رکھ دی۔ "آپ چائے پئیں۔ میں ذرا پھانسیاں دیکھ آؤں۔" اور یہ جا وہ جا۔

زبیدہ کے جانے کے ساتھ ہی میں نے پھانسیوں کی طرف سے کچھ لیجئے کہ ذہنی

فراغت پائی۔ "یار کامریڈ، چھوڑو اس قصے کو پھانسیاں تو لگتی رہیں گی۔ آؤ ہم اپنی باتیں کریں۔"

اشارے کی دیر تھی۔ بس کامریڈ رواں ہو گیا۔

ایک دم سے کتنی باتیں کر ڈالیں۔ رُکا ہوا بھی تو کتنے دنوں کا تھا۔ ایک زمانے میں روز ملتا تھا اور کتنا بولتا تھا۔ اس پہ کیا موقوف تھا سب ہی دوست روز اکٹھے ہوتے تھے فاروق، ظہور، ممتاز اور ہم سب دوست اپنے کامریڈ کے حساب سے بورژوا رجعت پسند اور زوال پسند اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ کامریڈ کرتا ہوگا کسی زمانے میں پارٹی ورک۔ مگر نہ اب پارٹی تھی اور نہ وہ ورکر تھا۔ بس ہمارے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ باتیں کرتا تھا اور مستقل لیکچر دیتا تھا کہ باتیں کرنے اور کتابیں پڑھنے میں کچھ نہیں رکھا۔ ایکشن ہونا چاہئے۔ ہم اس کے آنے سے پہلے ظہور کو انقلابی سمجھا کرتے تھے کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے مارکس کا حوالہ دیتا تھا اور ہمیں موقع پرست ثابت کیا کرتا تھا۔ مگر کامریڈ نے آکر اسے بھی ہمارے خانے میں ڈال دیا۔

"یار کامریڈ، ظہور کے بارے میں تو تم یہ نہیں کہہ سکتے۔ وہ تو تمہاری آئیڈیالوجی کا ماننے والا ہے۔"

"ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ اصلی چیز ایکشن ہے۔ ایکشن۔ بھائی سے مارکسیت پہ باتیں کروا لو۔ ایکشن کے نام صفر ہے۔"

بس اسی رنگ میں بولتا چلا جاتا۔ ایک ایک دوست کا احتساب کرتا۔ دوستوں کی منڈلی بکھری تو وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ خیر وہ مہینے پندرھواڑے میں صورت ضرور دکھا جاتا تھا۔ دوسرے تو بالکل ہی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ بس تتر بتر ہو گئے۔ کوئی دور کے دیسوں میں نکل گیا۔ کوئی ملک ہی میں رہ کر غمِ روزگار کی غذا بن گیا۔

میں نے پوچھا۔ "یار کامریڈ، کچھ ممتاز کا بھی اتا پتہ ہے۔ کہاں ہے آج کل؟"

"اسی شہر میں۔"

"اچھا؟ — آگیا واپس؟ عجیب آدمی ہے۔ آکر بتایا بھی نہیں۔"

"اب وہ اونچی ہواؤں میں ہے۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔ خیر میں نے تو اس کے مزاج درست کر دیئے۔ پہلے تو وہ نیڑے ہی نہیں لگنے دے رہا تھا۔ جب میں نے بات کی تبھی کہا کہ یار میں ابھی پھنسا ہوا ہوں۔ دفتر قائم کرلوں پھر بات ہوگی۔ میں نے دل میں کہا کہ کامریڈ، یہاں سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلے گا۔ تو بس ایک دن میں نے اُسے دھر لیا کہ پیارے شیوخ کے بوٹوں کے تسمے باندھ کے تو بھی فل بوٹ بن گیا ہے۔ اس حرام کی کمائی میں سے کچھ زکوٰۃ وکات نکال دے۔ بس جی سیدھا ہو گیا۔ میں نے اس سے تھوڑا بہت اینٹھ ہی لیا۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی۔"

کامریڈ جاری تھا کہ زبیدہ آن پہنچی۔ آتے ہی اطلاع دی "لگ گئی پھانسی؟"

"لگ گئی۔" کامریڈ اپنی باتیں بھول کر زبیدہ کی طرف متوجہ ہو گیا "تینوں کو؟"

"ہاں تینوں کو۔ ابھی تک لٹکے ہوئے ہیں۔"

"اچھا۔ چلو ٹنٹا مک گیا۔"

باہر یک دم سے ٹریفک کا شور ہوا۔ جیسے سینما ٹوٹا ہو۔ چھت پہ چڑھے ہوئے لوگ اور دیوار پہ لدے ہوئے بچے بھی اتر اتر کے جانے لگے۔ بوڑھیا بھی پوتے کو اپنی انگلی پکڑائے واپس ہوتی نظر آئی "ہائے بدنصیب جوان جہان دنیا سے گئے۔" اور افسوس کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"اچھا میں چلا۔" کامریڈ کہ بولتے بولتے چپ ہو گیا تھا ایک دم سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیوں؟"

"بس، کھیل ختم پیسہ ہضم۔ پھر ملیں گے۔"

اب شام ہونے لگی تھی۔ باہر ٹریفک کا شور دھیما پڑ گیا تھا۔ اِدھر چھت پہ بھی اب کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دیوار پہ بھی کوئی بچہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ زبیدہ نے ایک مرتبہ پھر دیوار کا رُخ کیا۔ بوجان نے ٹوکا "دلہن دونوں وقت مل رہے ہیں۔ اب اس طرف مت جاؤ۔"

"بس بوجان ابھی آئی۔"

اور واقعی زبیدہ جلدی ہی واپس آگئی۔ واپس آکر اطلاع دی "ابھی تک لٹکے ہوئے ہیں۔"

"ہوں۔" میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اس پر اپنے ردِ عمل کا کیسے اظہار کروں۔

"اب جا کے دیکھ لو۔ اب تو سب لوگ چلے گئے ہیں۔ ہماری دیوار سے سب کچھ نظر آتا ہے۔"

"اس میں دیکھنے کی کونسی بات ہے۔" میں نے اک ذرا اپنی بے تعلقی ظاہر کرتے ہوئے کہا اور اندر کمرے میں چلا گیا۔ وہاں دیکھا کہ بوجان جانماز پہ بیٹھی ہیں اور دعا کے لئے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے دوپٹے کا پورا آنچل پھیلا رکھا ہے۔

نیند تو آ نہیں رہی تھی۔ میں نے سوچا لاؤ میاں جان کے کاغذات ہی لگے ہاتھوں ترتیب دے لیں۔ اُس روز کے بعد میں نے اس مسودے کو ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔ خیر لے کر تو بیٹھ گیا اور بہت دیر تک اُلٹ پلٹ کرتا رہا مگر دماغ اس وقت حاضر نہیں تھا۔ رکھ دیا کہ کل پرسوں اطمینان کے ساتھ اسے پڑھوں گا۔

کرسی سے اُٹھ کر پلنگ کی طرف بڑھا۔ کہیں برآمدے سے باہر صحن میں نظر جا پڑی دیکھا کہ بوجان کھڑی ہیں۔ میں حیران کہ اس وقت صحن میں کھڑی کیا کر رہی ہیں۔ غور سے دیکھا تو منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ جب پڑھ چکیں اور اندر آنے لگیں تو میں نے پوچھا "بوجان، کیا پڑھ رہی تھیں؟"

"بیٹے حصار کھینچ رہی تھی۔ اللہ اس گھر کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

میں اب سونے کے موڈ میں تھا۔ خیر جا تو لیٹا مگر نیند نہیں آئی۔ آئی۔ جھپکی آئی بھی تو دور سے آئی ایک آواز نے اسے منتشر کر دیا۔ میں نے باہر برآمدے میں نکل کر پچھلی دیوار سے پرے نظر دوڑائی۔ آواز اسی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے اب سے پہلے کبھی اس طرف کا دھیان سے جائزہ ہی نہیں لیا تھا۔ جیل کے احاطہ کے بیچ ایک اونچی برجی جس میں پہریدار ایک ہاتھ میں لالٹین دوسرے ہاتھ میں موٹا سا لٹھ لئے کھڑا تھا۔ بار بار لالٹین اونچی کر کے ہلاتا، لٹھ فرش پر پٹختا اور آواز لگاتا "خبردار۔ ہوشیار۔"

اِس آواز نے مجھ پہ عجب اثر کیا۔ دل جیسے بیٹھ رہا ہو۔ تھوڑا تھوڑا ڈر۔

میں واپس آ کر آن لیٹا۔ لیکن کھٹ پٹ سے زبیدہ کی آنکھ کھل گئی۔ "اخلاق آج تم سو نہیں رہے۔"

"نیند نہیں آ رہی۔" اور ذرا تامل کے بعد آہستہ سے

"زبیدہ۔"

"ہاں۔ کیا بات ہے۔"

"زبیدہ گھر ہم نے بنا تو لیا ہے مگر.... "

زبیدہ نے چکرا کر مجھے دیکھا۔ "پھر؟"

"پھر میں یہ سوچ رہا تھا۔" میں نے رُکتے رُکتے آخر کہہ ہی ڈالا۔ "یہ گھر تو بالکل جیل کے سائے میں ہے۔"

زبیدہ نے غور سے مجھے دیکھا۔ "کوئی خواب دیکھا ہے؟"

"خواب؟.... نہیں۔ بس یوں ہی خیال آ گیا۔"

"کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ سو جاؤ۔"

میں چپ ہو گیا۔ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ زبیدہ نے کروٹ لی۔ اور خراٹے لینے شروع کر دیئے۔

۴

صاحبو ہم فلک کے ستائے ہوئے ہیں، زمانے کے راندے ہوئے ہیں۔ ارے ہم تو اسی روز آسمان سے زمین پہ آ پڑے تھے۔ جس روز گردشِ دوراں نے ہمیں جہان آباد سے ڈھکیل کر بن کے ویرانے میں جہاں بارہ بارہ کوس پر چراغ جلتا تھا لا پھینکا تھا۔ واں پہ ہمارے اجداد عرش میں جھولتے تھے۔ طب گھر کی لونڈی تھی۔ خاک ان کی چٹکی میں آ کر اکسیر بن جاتی تھی۔ قریب و دور سے مایوس العلاج مریض آتے تھے اور کامل شفا پا کر جاتے تھے۔ دربار سے پرانا تعلق چلا آتا تھا۔ یہ دستور ٹھہرا تھا کہ جو خاندانی مسند پہ بیٹھتا وہ شاہی طبیب بھی قرار دیا جاتا۔ مسند پہ بیٹھنے والا ان مخطوطوں کا بھی وارث ہوتا جو ہمارے جدِ اعلیٰ حکیم علی شیر ریحان قزدین سے بغل میں داب کر لائے تھے۔ ان مخطوطوں میں ایسا ایسا نسخہ درج تھا کہ آخری دموں میں مریض کو پلا دیا جائے تو اسی دم اُٹھ کھڑا ہو۔

جدِ اعلیٰ حکیم علی شیر ریحان کے بعد سب سے بڑھے چڑھے حکیم ہمارے پردادا حکیم گلستان علی تھے کہ مسیح دوراں کا مرتبہ رکھتے تھے۔ گو شاہی طبیب تھے مگر جہان آباد کی ساری خلقت ان سے فیض پاتی تھی۔ دور پرے کے شہروں سے بھی جینے سے مایوس مریض ان کے مطب میں پہنچتے تھے اور عمرِ خضر کی ضمانت لے کر جاتے تھے۔ خلقت ان کے

نام کا کلمہ پڑھتی تھی۔ قلعہ معلّٰی کے شہزادے شہزادیاں الگ ان کی گرویدہ تھیں۔ اے صاحبو ان کی شہرت تو جنّات تک میں پہنچی ہوئی تھی۔ یہ بات میں اپنے مغز سے اُتار کر نہیں کہتا' اماں جانی کی کہی دہراتا ہوں۔ ایک دن میں نے اس اجمال کی تفصیل پوچھی تو اماں جانی نے یوں بیان کیا کہ بیٹے ایسا ہوا کہ ایک روز شام پڑے ایک اجنبی مطب میں آیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا کہ مریض آخری دموں پہ ہے۔ اپنی مسیحائی سے اسے بچا لیجیے۔ تمہارے پردادا کے دل پہ اس کے گڑگڑانے کا بہت اثر ہوا۔ جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اجنبی کی لائی ہوئی سکھپال میں جا بیٹھے۔ تھوڑی دور چلے ہوں گے کہ اے لو یہ تو گھنی بنی آگئی۔ رات کا سناٹا۔ دور دور تک آدمی نہ آدم زاد، شیروں کی دہاڑ، ہاتھیوں کی چنگھاڑ، تمہارے پردادا نے تشویش سے باہر نظر دوڑائی۔ اجنبی سے کہا کہ میرے عزیز تم ہمیں کہاں کالے کوسوں لے آئے، منزل کتنی دور ہے۔ اجنبی نے مڑ کر نظر ڈالی تو تمہارے پردادا نے کیا دیکھا کہ اس کی صورت تو بکرے والی ہے۔ بہت حیران ہوئے کہ وہ آدمی کون تھا، یہ جناور کون ہے۔ یہ سوچتے تھے کہ سکھپال ایک بڑے سے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔ سکھپال سے اُترے۔ دیوان خانے میں گئے۔ مریض چھپر کھٹ پہ چادر تانے لیٹا تھا۔ چادر اُلٹی تو حق دق رہ گئے۔ چہرہ مور کا، ٹانگیں ہرن کی۔ سمجھ گئے کہ یہ غیر مخلوق ہے۔ اصل میں وہ جنوں کا شہزادہ تھا۔ تمہارے پردادا نے سکون کے ساتھ اس کی نبض دیکھی، پیشانی کو چھوا۔ تیمارداروں سے کہا کہ شیر ببر کے اگلے پنجہ کا ناخن مہیا ہو جائے تو مریض شاید بچ جائے ورنہ رات رات کا مہمان ہے۔ ایک لمبا تڑنگا جن اُٹھا اور غائب۔ پھر دم کے دم میں حاضر۔ شیر کا ناخن لا کر پیش کر دیا۔ تازہ تازہ خون لگا ہوا جیسے ابھی زندہ شیر کے پنجے سے کھینچا ہو۔ تمہارے پردادا نے ناخن کو پتھر پہ گھسا، شہد میں گھولا اور مریض کو چٹا دیا۔ اے لو مریض نے آنکھیں کھول دیں۔

ادھر مریض پریشان گھر والے حیران کہ حکیم صاحب کہاں گئے۔ اے لو چوتھے دن

ہشاش بشاش چلے آ رہے ہیں۔ ساتھ میں گدھوں پہ لدی ہوئی مشکیاں۔ ہر مشکی اشرفیوں سے لبالب بھری ہوئی۔ اِدھر مشکیاں اتاری گئیں اُدھر گدھے غائب۔ پھر تو بیٹے جنوں کو ساوتی پڑ گئی۔ جس کی طبیعت خراب ہوتی آ کر نبض دکھاتا، دوا لیتا اور سونے کی ڈلی نذر کر جاتا۔ ارے جبھی تو تمہارے پردادا کے گھر میں الغاروں پیسہ تھا۔ ایسی حویلی بنائی تھی کہ کیا راجوں مہاراجوں کے محل ہوں گے۔ محل تو تھا ہی۔ گلستان محل سچ مچ گلستان محل تھا۔ مگر سب کچھ غدر میں غارت ہو گیا۔

عزیزو، غدر میں غارت ہونے کی صورت یہ ہوئی کہ ابا جانی کے تایا حضور مولوی چقماق علی نے کہ اپنے وقت کے صاحب ضمیر عالم دین تھے۔ فرنگیوں کے خلاف جاری ہونے والے جہاد کے فتوے پر دستخط کر دیئے تھے۔ جب لڑائی کا پانسہ پلٹا تو شریفوں روشن ضمیروں کی شامت آئی۔ بڑے تایا حضور پھانسی پر چڑھ گئے۔ دادا جانی حکیم گل زباغ علی خاندان کو سمیٹ رات کے پردے میں اس آفت زدہ شہر سے نکل گئے۔

دادا جانی اہلِ خاندان سمیت خاک بسر بے گھر بے در پھرتے پھرے۔ مگر برن کے علاقے سے گزرتے گزرتے پکڑے گئے۔ اس اجاڑ قریئے نے جواب ہمارا مسکن ہے، دادا جانی کے قدم پکڑ لیے۔ بس وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ ابا جانی بیان کیا کرتے تھے کہ ان دنوں یہ بستی اجاڑ ویران تھی۔ مٹھی بھر اہلِ ہنود۔ جہاں تہاں مسلمانوں کے گھر باقی اشجار بے شمار تھے۔ مگر ان میں کوئی قرینہ نہیں تھا۔ نرا جنگل تھا۔ نہ امریاں نہ کوئی پھولتا مہکتا باغ۔ بس جھڑ بیری کے بیر پنیریوں کے حساب سے سمیٹ لو۔ آم بھی تھے مگر کاٹھا آم۔ قلمی آم کہ تراش کر سلیقہ سے کھایا جا سکے ناپید تھا۔ بازار میں گڑ کی بھیلیاں بہت دکھائی دیتی تھیں۔ قند و نبات کی شیرینی سے یہ قریہ ناآشنا تھا۔ قند غائب شکر قند بہت، سواری کے نام نہ پالکی نہ ڈولی۔ چھکڑے چلتے تھے۔ کبھی کوئی رتھ دکھائی دے جاتا تو عورتیں گھروں کی ڈیوڑھی پر آ کر تعجب سے دیکھتیں کہ رتھ جا رہا ہے۔ ہاتھی

پوری بستی میں ایک تھا کسی ہندو ساہوکار کا جب پوکھر پہ نہانے کے لئے نکلتا تو بستی کے بچوں کی عید ہو جاتی۔

دادا جانی نے یہ سارا نقشہ دیکھا لیکن ذرا جو بے دماغ ہوئے ہوں۔ ڈیرا ایک دفعہ ڈال لیا تو بس ڈال لیا۔ پھر وہ اس دیار میں جم کر بیٹھے۔ مسحیٰ میں ہنر تھا۔ ہاتھ میں شفا تھی۔ مریض جنم جنم کے روگ لے کر آتے تھے اور شفا کی سند لے کر جاتے تھے۔ ان کی مسیحائی کی خبر دور و نزدیک ایسے پھیلی جیسے خوشبو پھیلتی ہے۔ بس اسی کے ساتھ اُسی بستی کا نقشہ بھی بدلنے لگا۔ دادا جانی کی بگھی آئی تو بستی میں گویا ایک انقلاب آیا۔ یہ سواری یہاں کی خلقت نے پہلے بھلا کاہے کو دیکھی تھی۔ سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جاننا چاہیئے کہ جب کسی بستی میں کوئی نئی سواری آتی ہے تو اس کے ساتھ ہی بستی کا طور بدل جاتا ہے۔ تو بس ہمارے دادا جانی کی بگھی کے ساتھ اس دیار کی کایا پلٹ ہو گئی۔

برن کے پورے علاقہ میں چرچا تھا کہ اس نواح میں ایک مسیحا نفس طبیب آیا ہوا ہے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر حاکمِ ضلع کی میم صاحب تک پہنچی۔ میم صاحب کا حال بہت پتلا تھا۔ حمل ٹھہرتا تھا مگر ساتویں مہینے کے آتے آتے ضائع ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹروں سے بہت علاج کرایا۔ مگر اس بی بی کے مقدر میں تو شفا کہیں اور لکھی تھی۔ دادا جانی کو طلب کیا گیا۔ دادا جانی تین مہینے تک میم صاحب کو خمیرے معجونیں چٹاتے رہے۔ بعد اس کے گذارش کی کہ میم صاحب اب آپ بصد شوق کلکٹر بہادر دام اقبالہٗ کے پاس جائیں۔ حمل ٹھہرنا شرط ہے۔ گر جائے تو میرا ذمہ بیشک ہرنی کی طرح کودتی پھاندتی پھریئے۔ اندر والے کے لئے کوئی جوکھوں نہیں ہے۔

دادا جانی نے جیسا فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔ گلگوتھنا سا لال پیدا ہوا۔ میم صاحب بہت مسرور ہوئیں پوچھا ویل حکیم شاب کیا فیس مانگتا ہے۔ دادا جانی نے بصد ادب عرض کیا کہ فرزند دلبند آپ کو مبارک ہو۔ یہ عاجز صرف نظر کرم چاہتا ہے۔ پھر احوال

خاندان کے عتاب میں آنے کا گوش گذار کیا۔ میم صاحب نے شوہر نامدار کے کان میں بات ڈالی۔ کلکٹر بہادر دام اقبالہٗ نے اپنے حاکمانہ و فرنگیانہ اثر و رسوخ کو استعمال میں لا کر معافی تلافی کروائی۔ ادھر ملکہ معظمہ کی طرف بھی عام معافی کا اعلان ہو گیا خلقت کو ملکہ کے لطف و کرم نے لوٹ لیا۔ دادا جانی اس نیک نہاد ملکہ کے اخلاقِ حمیدہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ مدح میں اس جناب کے ایک قصیدہ رقم کیا اور کلکٹر بہادر کی خدمت بابرکت میں بھجوایا۔ اس جانب سے توقع سے بڑھ کر قدر دانی ہوئی اور انعام و اکرام کی بارش ہوئی۔ حاذق الملک کا خطاب عطا ہوا۔ المختصر ادبار کے دن ٹل گئے، عتاب کے بادل چھٹ گئے۔ ہمارا خاندان سلطنت انگلیسیہ کی نظروں میں سرخرو ہوا۔ پھر خوش حالی کے دن آ گئے۔ دادا جانی اب اس دیار میں رچ بس گئے حویلی کی تعمیر کی۔ جب حویلی بن کر کھڑی ہوئی اور نام اور تاریخ تعمیر کا پتھر لگانے کا وقت آیا تو ابا جانی کو بلا کر فرمایا کہ فرزند، ہمارا زمانہ جہان آباد تک تھا۔ اب تمہارا زمانہ ہے۔ سنگِ تعمیر تمہارے نام کا لگے گا۔ یوں حویلی کا نام چراغ حویلی رکھا گیا۔

دادا جانی چراغ حویلی کھڑی کر کے خود ڈھیتے چلے گئے۔ دنیا کے قصوں بکھیڑوں سے منہ موڑ کر خانہ نشین ہو گئے۔ جتنے دن جئے گلستان محل کو یاد کر کے گریہ کرتے رہے۔ طب کو بھی سلام کر لیا۔ علاج معالجہ سے منہ موڑ لیا۔ ہر دم ہاتھ میں تسبیح، یادِ خداوندی اب خاندانی مسند پہ ابا جانی حکیم چراغ علی رونق افروز تھے۔ کیا دبدبہ تھا۔ ان کے پیشاب پہ چراغ جلتا۔ تشخیص کی دھوم دور دور تھی۔ ہاتھ میں کچھ تاثیر تھی کہ خاک کی چٹکی بھی مریض کو دے دیتے تو ہفتے پندرھواڑے میں بھلا چنگا ہو جاتا۔ ڈاکٹروں نے بہت زور مارا مگر ابا جانی کے مقابلہ میں ڈاکٹری کا چراغ نہیں جلا۔

روایت کی ابنِ حاتم نے عبداللہ عمرو بن عاص سے کہ جب سے دنیا عدم سے وجود میں آئی ہے۔ تب سے آغاز میں ہر صدی کے فتنہ کوئی نہ کوئی ضرور بپا ہوا ہے۔ اس ہیچ میرز مداں مشتاق علی یہ بولنے کی جسارت کرتا ہے کہ پھر تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی

آغاز ایسا ہے تو انجام کیسا ہوگا۔ دور کیوں جاؤ بیتی صدی کے دمِ آخر کی مثال سامنے ہے۔ جب فقیر نے ہوش کی آنکھ کھولی تو صدی دم توڑ رہی تھی اور فتنے دم میں آرہے تھے۔ ایک فتنہ دہریت کا، ایک فتنہ نیچریت کا۔ پھر آگے چل کر ایک ڈھونگ دعویٰ نبوت کا، ایک شگوفہ مہدی موعود کا۔ کوئی فتنہ احاطۂ پنجاب سے اٹھا، کوئی شگوفہ دیارِ علی گڑھ سے پھوٹا۔ القصہ دنیا فتنوں سے بھری ہوئی تھی اور اسلام خطرے میں تھا۔

ابا جانی نے برادر خورد اشتیاق علی اور اس ہیچ مداں کو یہ خیال کر کے علی گڑھ کالج بھجوا دیا تھا کہ جب فرنگیوں کے راج میں رہنا ہے تو ان کی گٹ پٹ کو بھی سیکھ لیا جائے۔ انہوں نے اپنے طور پر نیکی کی تھی کہ کسی طور اولاد کی دنیا سنبھل جائے۔ یہ کب گمان تھا کہ اشتیاق میاں دنیا کے پیچھے دین کی دولت گنوانے پہ تل جائیں گے۔ علی گڑھ جا کر ان میاں کے پَر نکل آئے۔ اونچا اڑنے لگے۔ واپس اس رنگ سے آئے کہ در مدح نیچر رطب اللسان تھے۔ اماں جانی ہرنی کا معجزہ بیان کر رہی تھیں کہ وہ میاں بیچ میں تڑ سے بولے کہ یہ واقعہ تو خلاف نیچر ہے۔ اماں جانی نورِ نظر کا یہ کلام سن کر دم بخود رہ گئیں۔ خیر انہوں نے تو اپنی طرف سے پردہ ڈالنے کی بہت کوشش کی۔ مگر عشق اور مشک کی طرح فتنہ کی بات بھی چھپی نہیں رہتی۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔ دوسرے دن ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا کہ حکیم چراغ علی کا بیٹا نیچری ہوگیا۔ اماں جانی نے لاچار ابا جانی کے گوش گذار کیا کہ لاڈلے میاں نیچری ہوگئے ہیں، برادری میں تھڑی تھڑی ہو رہی ہے، جو سنتا ہے دانتوں میں انگلی دباتا ہے۔ ابا جانی نے تامل کیا اور فوراً ہی میاں کو کالج سے اٹھوا لیا۔ ان میاں نے بہت زاری کی مگر ابا جانی نے دوٹوک فرمایا کہ فرزند، تمہیں نیچری بنا کر ہمیں اپنی عاقبت خراب کرنی منظور نہیں ہے۔

مگر بڑے خالو نجم الہدیٰ خود امورِ دین سے بے نیاز تھے۔ رنگِ فرنگ میں غرق

تھے۔ فرزند کے بارے میں خبریں سُنیں۔ ہر خبر کو ایک کان سنا، دوسرے کان اڑایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمس الہدیٰ علی گڑھ سے نرے دہریہ بن کر نکلے۔ ہماری چھوٹی پھوپھی سے ان کی نسبت ٹھہری ہوئی تھی۔ اب جو اُن کی دہریت کی خبرِ بد ابا جانی کے کانوں تک پہنچی تو انہیں فکر لاحق ہوئی کہ ہمشیرہ عزیزہ کا ہاتھ ایک دہریئے کے ہاتھ میں کیسے پکڑا دیں۔ آخر الامر بڑے خالو صاحب کو بطرزِ شائستہ کہلا بھیجا کہ یہ دینداروں کا گھرانا ہے، دہریہ داماد کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

پھر شادی ہماری چھوٹی پھوپھی کی لکھنؤ کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ سے ہوئی کہ اسم گرامی ان کا قنبر حسن تھا کہ اب مرحوم و مغفور ہیں۔ طبیعت شائستہ طینت پاکیزہ پائی تھی۔ تھے بھی تو ماشاء اللہ خانم کے تربیت یافتہ۔ خانم نے بھی ان کی خاندانی شرافت و نجابت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور ان کے والد گرامی فخر الواعظین مولانا شبر حسن سے زمانۂ شباب کے تعلقِ خاص کو خاطر میں لاتے ہوئے ان پر توجہ خاص کی تھی۔ مجلسی آداب سکھائے پاکبازی کا سبق پڑھایا۔ خانم کی بیٹیاں واہ واہ سبحان اللہ۔ ایک آفتاب تو دوسری ماہتاب۔ جب پھوپھا حضور اس بالاخانے پہ پہنچے تھے تو دونوں کچی کلیاں تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے شگفتہ ہوئیں۔ مہک ان کی چار سو گئی۔ بھونرے اڑ کر دور دور سے آئے۔ مگر دور ہی دور منڈلائے۔ خانم نے کسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ کیا ٹھسّا تھا خانم کا۔ شباب پہ اس کے چراغ جلتا تھا۔ محفل کا کیا رکھ رکھاؤ تھا کہ ہمہ شما کا کیا مذکور، نوابوں کا بھی وہاں گذر مشکل سے ہوتا تھا۔ مولانا شبر حسن تو زمانۂ شباب میں اہلِ علم کے گھرانے سے نسبت رکھنے کے باعث بار پا گئے تھے۔ مگر بس ذائقہ چکھا اور محفل سے دامن جھاڑ کر اٹھ لئے پھر ان کا ذہن ہی بدل گیا۔ اس محفل سے اٹھ محفلِ وعظ میں جا بیٹھے۔ پھر ایسے اس محفل کے ہوئے کہ خود اس راہ پر چل نکلے اور فخر الواعظین کہلائے۔ مگر خانم نے وضعداری کو آخر وقت تک نبھایا۔ ہمارے پھوپھا قنبر حسن ابھی کمسن تھے کہ انہیں اپنے سایۂ عاطفت

میں لے لیا۔ تو اس جناب نے اس بلند بام بالاخانے سے تہذیب سیکھی۔ وہیں تیسوں پارے ان کچی کلیوں کے ساتھ بیٹھ کر ختم کئے۔ عروض سیکھا۔ سُروں کی تعلیم لی۔ چند برسوں ہی میں ڈھل منجھ گئے۔ خام گئے تھے، ترش کر آئے۔ طبیعت حسن پرست، باطن مثل آئینہ صاف کن رس، شعر شناس سوز خوانی کرتے ہوئے کبھی سُر سے باہر نہیں ہوئے اور لہجہ کی ادائگی میں کبھی خطا نہیں کی۔ فقیر آج کے سوز خوانوں کو دیکھتا ہے تو خون کے آنسو روتا ہے۔ ارے میاں سوز خوانی ذاکری بناشد۔ اچھا اچھا خون تھوک جاتا ہے۔ حقیر فقیر یہ کہتا ہے کہ راگ راگنیوں میں درک نہیں تو اس فنِ شریف میں قدم رکھنا کیا ضرور ہے۔ ثواب کمانا مقصود ہے تو وہ تو وعظ دے کر بھی کمایا جا سکتا ہے۔

خیر ذکر تو یہ تھا کہ ایسے تھے ہمارے پھوپھا حضور۔ ہم سب چھوٹی پھوپھی کو چھوٹی پھوپھی ہی کہتے۔ پھوپھا حضور نے بطرزِ شائستہ ہمیں ٹوکا کہ ایسا کہنا خلاف ادب ہے۔ تب ہم چھوٹی پھوپھی کو پھوپھی حضرت اور چھوٹے پھوپھا کو پھوپھا حضور کہنے لگے۔ واضح ہو کہ ہمارے پھوپھا حضور کے خاندان عالی شان میں زبان و بیان پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ روز مرہ اور محاورے سے انحراف کو ظلم عظیم تصور کیا جاتا تھا۔ مولانا شبیر حسن سے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ محض زبان کے سوال پر انہوں نے بیٹی کا رشتہ واپس کر دیا تھا۔ سوال ڈال دیا کہ ہم صاحبزادے کو فرزندی میں لینے سے پہلے ان کا امتحان لیں گے۔ امتحان اس طور لیا کہ مثنوی سحرالبیان کھول کر سامنے رکھ دی کہ میاں ذرا پڑھ کر تو سناؤ۔ چار شعر سنے اور کہا کہ بس کرو۔ کہلا بھیجا کہ صاحبزادے اضافت کھاتے ہیں۔ ہماری بیٹیا کا ان کے ساتھ گذارہ کیسے ہوگا۔ ویسے ہماری پھوپھی کا بھی امتحان لیا گیا تھا۔ لکھنؤ سے چل کر ایک بی مغلانی آئیں۔ مثنوی سحرالبیان پڑھوا کر سنی، لب و لہجہ دیکھا، تذکیر و تانیث کے استعمال کو پرکھا۔ ہماری پھوپھی بھی چاروں کھونٹ پکی تھیں۔ بی مغلانی اپنا سا منہ لے کر چلی گئیں۔

پھوپھا حضور اثنا عشری تھے۔ پھوپھی حضرت بھی اس گھر میں جا کر اسی رنگ میں رنگی گئیں۔ محرم کے چاند کے ساتھ چوڑیاں توڑ ڈالتیں۔ کنگھی چوٹی موقوف، سرمہ مسی معطل۔ دس دنوں تک سیاہ پوشاک پہننا، الٹی چارپائی پہ سونا۔ ہمارے خاندان میں بڑے پھوپھا صاحب بہ پیر مغیث الدین کے توسط سے کہ پہنچے ہوئے بزرگ تھے تفضیلیت تو پہلے ہی راہ پا گئی تھی۔ اب پھوپھا حضور کی راہ تھوڑا تشیع بھی در آیا۔ خیر میاں شمس الہدیٰ کی دہریت سے تو بچ گئے۔ بس خدا ہی نے بچایا۔ بروقت پتہ چل گیا۔ وہ میاں تو نرے جنٹلمین بن گئے۔ لندن گئے تو وہاں ایک میم سے نکاح بطرزِ فرنگ پڑھوا لیا۔ پھر کھچڑی اولاد پیدا کی۔ بیٹی بیٹے آدھے گورے آدھے کالے۔ قدرے مسلمان، زیادہ کرسٹان آدھا تیتر آدھا بٹیر خاندان۔

مدعا کہنے کا یہ ہے کہ ایسے کافر زمانے میں اس عاصی پر معاصی نے شعور کی آنکھ کھولی، مگر بحمد اللہ کہ اپنے عقیدے کے شیشے پر بال نہیں آنے دیا۔ ایمان کی کشتی کو دہریت کے گرداب سے اور نیچریت کے تھپیڑوں سے بچا کر صاف نکال لے گیا۔ اس پاک پروردگار کا شکر بجا لاتا ہوں۔ جس نے اس ہیچ پوچ میں یہ استقامت پیدا کی کہ ایسے دشمنِ ایمان زمانے میں ایمان کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔

ارے نیچریت اور دہریت ایک طرف، اس گنہگار نے تو ناقوس کی آوازوں کے سائے میں ہوش سنبھالا ہے۔ مندر چراغ حویلی سے کتنی دور تھا۔ یہی کوئی فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلہ پر۔ پنڈت گنگا دت مہجور کی صحبت اس پر مستزاد کہ تب ہی سے ان کے ساتھ دانت کاٹی روٹی چلی آتی ہے۔ ہائے پنڈت کیا ہیرا آدمی ہے۔ ایک دفعہ کلمہ پڑھ لے تو سیدھا جنت میں جائے۔ اُف خدایا، کیسا کیسا غاصب ظالم جابر بے ایمان دغاباز چور اچکا قزاق بٹ مار محض اس زور پر کہ اُمتِ مرحومہ میں شامل ہے جنت پر اپنا حق جتاتا ہے۔ ادھر ہمارے پنڈت مہجور کا دامن نیکیوں سے بھرا ہے۔ مگر کلمہ گو نہ ہونے

کے سبب مقدمہ ان کا کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔

میں نے ایک دن کہا کہ "پنڈت، بس ایک دفعہ کلمہ پڑھ لے اور پھر مر جا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"پھر تو سیدھا جنت میں جائے گا۔"

پنڈت ہنسا۔ کہنے لگا کہ "شری مشتاق علی، تمہارے یہاں تو جنت میں جانے کا بہت آسان نسخہ ہے۔ زبان سے ایک دفعہ کلمہ پڑھ لیا اور بے کھٹکے سیدھے جنت میں پہنچ گئے۔ ہمارے یاں پہ سورگ کی راہ بہت کٹھن ہے۔ ارجن بھیم نکل سہدیو کیسا کیسا گیانی رستے ہی میں ڈھے گیا۔ انت میں ایک کتا رہ گیا کہ یدھشٹر مہاراج کے سنگ سورگ کی چوکھٹ تک پہنچا۔"

میں نے ٹکڑا لگایا "سبحان اللہ۔ حضرت انسان اشرف المخلوقات بنے پھرتے تھے، وہ تو رہ گئے۔ کتا سورگ تک پہنچ گیا۔"

پنڈت بولا "آدمی کا گھمنڈ اسے لے بیٹھتا ہے۔ سہدیو کو بدھیمان ہونے کا گھمنڈ تھا۔ نکل کو اپنی سندرتا کا گھمنڈ تھا۔ بھیم کو اپنے کس بل کا گھمنڈ تھا۔ ارجن کو اپنی دھنش اور بان کا مان تھا۔"

"اور دروپدی؟"

"ہاں دروپدی سے بھی اک چوک ہوتی۔ اس نے پانچوں سے برابر کا پریم نہیں کیا۔ ارجن پہ زیادہ ریجھ گئی۔"

اب میرے ہنسنے کی باری تھی۔ "واہ پنڈت واہ۔ اشرف المخلوق کو کس کس بہانے سے کاٹا ہے۔ پوری بنی نوع انسان کو قلم زد کر کے سورگ کا قبالہ ایک کتے کے نام لکھ دیا۔"

پنڈت نے بہت متانت سے کہا "شری مشتاق علی پشو پنچھی۔ نرناری دھنی نردھنی سب رام رحیم کی مخلوق ہیں۔ اس سنسار میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ کوئی بڑا ہے۔ نہ کوئی

اونچی ذات نہ کوئی نیچ ذات۔"

ظالم نے مجھے لاجواب کر دیا۔ خیر آمدم بر سر مطلب فقیر یہ عرض کر رہا تھا کہ ایسے پُرآشوب زمانے میں جب چار سو دہریت کی آندھیاں چل رہی تھیں اور نیچریت نے طوفان بو رکھا تھا اس حقیر فقیر نے اپنے ایمان پر آنچ نہیں آنے دی۔ یہ سب ابا جانی اور والدہ ماجدہ کی تربیت کی کرامت ہے اور پھوپھا پیر مغیث الدین کا فیض صحبت۔ ہمارے پھوپھا صاحب اپنے وقت میں مرجع خاص و عام تھے۔ درماندوں دکھیاروں کے ہمدرد۔ حاجت مندوں کے حاجت روا۔ نامراد خدمت با برکت میں آتے تھے اور بامراد واپس جاتے تھے۔ ایک روز یہ فقیر خدمت میں حاضر تھا کہ ایک مردِ مفلس آکر ملتجی ہوا کہ گھر میں تین دن سے فاقہ ہے۔ بچوں کے منہ میں کھیل تک نہیں گئی۔ مراد پوری کرو یا زہر دے دو کہ قصہ پاک ہو۔ پھوپھا صاحب نے تامل کیا۔ پھر آب صندل سے ایک نقش لکھ کر دیا اس ہدایت کے ساتھ کہ اسے سرہانے پائے تلے دبا دیجیو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اٹھے سے اس کے روز صبح کو چاندی کا ایک روپیہ ملکہ وکٹوریہ کی مورت والا تکئے کے نیچے سے برآمد ہوتا اور نیز چاندی کی ایک ڈلی۔ دنوں میں دلدر اس کے دور ہو گئے۔

ایک اور واقعہ نقل کرتا ہوں کہ کیونکر ایک عاشق کو وصال صنم میسر آیا۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر آنکھوں دیکھی سناتا ہوں۔ ایک دل زدہ اس حال میں حاضر خدمت ہوا کہ آنکھیں اس کی گنگا جمنا بنی ہوئی تھیں۔ پوچھا، یہ حال کیا بنایا ہے۔ کہا، قسمت نے یہ دن دکھایا ہے۔

پوچھا، گریہ کیوں کرتا ہے۔ بولا، یار عزیز یاد آتا ہے۔ پوچھا، کیا چاہتا ہے۔ بولا وصالِ یار۔ پہلے سمجھایا بجھایا، عشق کی تباہ کاریوں سے خبردار کیا جب دیکھا کہ دل کے ہاتھوں لاچار ہے تو ترس کھا کر کہا کہ کڑی اناری در کار

ہے۔ وہ ڈھونڈھ کر انار کی لکڑی لایا۔ آپ نے اس لکڑی کا قلم بنایا اور نقش ایک لکھ کر دیا کہ مینڈک کے منہ میں اسے رکھ اور مینڈک کو ندی کے کنارے داب۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ چالیس دن جب گذرے تو اس نے آکر پیر پکڑ لئے۔ حال پوچھا۔ کہا کہ بچھڑا یار مل گیا۔ دل کی مراد برآئی۔

دوسرا واقعہ اس طرح ہے اور یہ بھی ان گنہگار آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے۔ ایک عاشق باحال تباہ حاضر خدمت ہوا۔ فریاد کی کہ رقیب نے میری راہ میں کانٹے بوئے ہیں۔ یار کے کان میری طرف سے بھرے ہیں۔ اب وہ مجھ سے بدکا ہوا ہے۔ بیٹھے پہ ہاتھ نہیں رکھنے دیتا ہے۔ آپ نے کہا کہ چونتیس پتے آکھ کے لے کر آ۔ وہ بھاگا بھاگا جنگل گیا اور جھٹ پٹ چونتیس پتے آکھ کے توڑ لایا۔ آپ نے ان پتوں پر ببول کے کانٹے سے ایک نقش گودا۔ ہدایت کی کہ ٹھیک دوپہری میں تندور گرم کر اور یہ پتے اس میں جھونک دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ پندھرواڑہ نہ گذرا تھا کہ رقیب روسیاہ ہوا۔ روٹھا یار من گیا۔

ایسے بہت سے واقعات ہیں، کہاں تک بیان کروں۔ اس در سے کبھی کسی حاجتمند کو نامراد واپس جاتے نہ دیکھا۔ نوع بہ نوع کے نسخے، عملیات، ٹوٹکے ان کے ناخنوں میں تھے۔ مشتے نمونہ از خروارے اکا دکا ٹوٹکا اور کوئی کوئی حکمت کی بات جو ذہن میں اٹکی رہ گئی ہے نقل کرتا ہوں۔

دفینہ کیونکر نظر آوے

سیاہ تیتر پکڑ کر تین شب و روز اسے بھوکا رکھے چوتھے دن چونچ کھول کر پارہ بھر دے۔ پھر وہ پارہ نکال کر گائے کے دودھ میں پکائے اور تیتر کو کھلادے جب وہ بیٹ کرے تب اس بیٹ کو آٹے میں ملا کر گولی بنائے اور منہ میں

رکھ لے۔ دفینہ اگر سات پردوں میں ہوگا تو بھی نظر آجائے گا۔

ایضاً

کرک ناتھ مرغے کی چربی حاصل کرے۔ واضح ہو کہ کرک ناتھ مرغا بالکل سیاہ ہوتا ہے۔ اس کا گوشت بھی سیاہ ہوتا ہے۔ اس کی چربی حاصل کرکے آنکھوں میں لگائے۔ جہاں خزانہ دبا ہوگا نظر آجائے گا۔

ایضاً

شبھ گھڑی میں کالی گائے کا دودھ اور مکھن ملا کر کرک ناتھ مرغے کی زبان پر نکال لے۔ پھر وہ شخص جو الٹا پیدا ہوا ہو اپنی آنکھوں میں لگائے۔ مال جہاں بھی گڑا ہوگا اسے دکھائی دینے لگے گا۔

جیب خالی نہ ہونے کی ترکیب

اساڑھ کے مہینے میں سنیچر کے دن تالاب کے کنارے جا کر ایک جوڑا مینڈک کا جب وہ جفتی کھا رہا ہو پکڑے۔ نر کے منہ میں روپیہ رکھ کے تالاب کے ایک کنارے پورب کی سمت اور مادہ کے منہ میں اٹھنی رکھ کے تالاب کے دوسرے کنارے پچھم کی سمت گاڑ دے۔ یہ کام برہنہ ہو کر کرے بعد آٹھ دن کے کھود کر دیکھے۔ اگر روپیہ اڑ کر اٹھنی کے پاس پہنچے تو روپے کو خرچ کرے اور اٹھنی کو پاس رکھ لے۔ اگر اٹھنی اڑ کر روپے کے پاس پہنچے تو اٹھنی کو خرچ کرے اور روپے کو گرہ میں باندھ کر رکھے۔ انشاء اللہ جیب کبھی خالی نہ ہوگی۔

طریقہ عمر کے معلوم کرنے کا

طریقہ عمر کے معلوم کرنے کا یہ ہے کہ اس گھڑی جب سورج نکل رہا ہو جنگل میں جائے۔ سورج کے رُخ آنکھیں موند کر سیدھا کھڑا رہے اور اپنی پرچھائیں کا خیال دل میں لائے۔ پھر آنکھیں کھول کر اپنی پرچھائیں کو دیکھے۔ اگر پوری ہے تو عمر دراز ہوگی۔ اگر سر غائب نظر آئے تو برس پورا نہ ہوگا کہ گذر جائے گا۔

بیچ پھڑکنے اعضائے جسمانی کے

وہ گلفام خوش اندام زیرِ بحث نہیں جن کی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے۔ ان سے قطع نظر ہر آدمی کے اعضا وقتاً فوقتاً پھڑکتے ہیں۔ کسی عضو کا پھڑکنا اچھا ہوتا ہے۔ کسی کا بُرا۔ اگر ناک سیدھی طرف سے پھڑکے تو حاکم کی ناک کا بال بنے، زر و مال ملے۔ لب اگر اوپر کا پھڑکے محبوب کا بوسہ ملے۔ اگر گلا پھڑکے غذائے لذیذ کھانے کو ملے و نیز فنِ موسیقی میں کمال حاصل کرے۔ اگر بغل سیدھی پھڑکے تو یار چلا جائے بغل خالی رہ جائے۔ اگر اُلٹی پھڑکے تو بچھڑا دوست بغل میں آئے۔ شاد کام ہو جائے۔ اگر ناف پھڑکے مرض میں مبتلا ہو۔ اگر زیر ناف پھڑکے تو دوست کی طرف سے صدمہ اُٹھائے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ہمارے پھوپھا صاحب اپنے وقت کے بڑے عامل تھے۔ دعا میں اثر تھا۔ تعویز تیر بہدف ہوتا تھا اور تعویز کی چاروں اقسام خاکی، آبی، بادی، آتشی ان کے دائرہ اختیار میں تھیں۔ موکل قبضہ میں تھے۔ اور موکل بھی ایسے ویسے نہیں۔ ہماری پھوپھی اماں بیان کرتی تھیں کہ ان کے موکلوں میں زعفر جن کا پڑپوتا بھی تھا۔ میں نے ایک روز پھوپھی اماں کو اس باب میں کریدا تو یوں بیان فرمایا کہ بیٹے تمہارے پھوپھا صاحب کا یہ طور بندھا ہوا تھا کہ برس کے برس عاشورہ کے دن سیدانی بی کے

امام باڑے میں جا کے روضہ خوانی میں شریک ہوتے تھے۔ اس برس بھی ایسا ہی ہوا۔ روضہ خوانی ہو رہی تھی کہ اچانک لوگوں کی نظروں نے کیا دیکھا کہ قریب ہی ایک ناگ بل کھاتا ہے اور زمین پر پھن پٹختا ہے۔ دیکھنے والے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ تمہارے پھوپھا صاحب نے دیکھا تو قہر بھری نظروں سے اسے گھورا اور ڈانٹا کہ تو یہاں کیا کر رہا ہے ڈانٹ پڑنی تھی کہ ناگ غائب پھر جو دیکھا تو ایک لمبا تڑنگا آدمی سر جھکائے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ تمہارے پھوپھا صاحب نے ترش روئی سے پوچھا، یہاں کیا لینے آیا ہے۔ عاجزی سے بولا ثواب لینے۔ کہا اپنا حسب نسب بتا۔ بولا، زعفر جن کا پڑپوتا ہوں۔ ابنِ زعفر کہلاتا ہوں۔ عشقِ حسین ورثے میں ملا ہے۔ یہ سن کر تمہارے پھوپھا صاحب نرم پڑ گئے۔ بولے، پھر زہریلے کیوں بنے پھرتے ہو۔ زہر تھوکو، آدمی بنو اور ہمارے ساتھ رہو۔ اے لو وہ تو سچ مچ آدمی کی جون میں آگیا اور تمہارے پھوپھا صاحب کی خدمت میں رہنے لگا۔ پتلی کنچے کی طرح چمکتی تھی۔ مگر گردش نہیں کرتی تھی۔ تمہارے پھوپھا صاحب نے کسی کام کو کہا۔ فوراً غائب۔ دم کے دم میں کام انجام دیا اور پھر حاضر۔

پھوپھا صاحب کی یہ سب کرامات اپنی جگہ۔ مگر ابا جانی کبھی ان کے قائل نہیں ہوئے وہ پھوپھا صاحب کے عملیات کو خلاف اسلام جانتے تھے اور بدعت میں شمار کرتے تھے۔ مگر اس باعث کہ پھوپھا صاحب رشتہ میں بڑے تھے ان کے سامنے منہ نہیں کھولتے تھے۔ اصل میں پھوپھی اماں، ابا جانی سے عمر میں بڑی تھیں اور میاں جانی انہیں مانند اپنی والدہ کے جانتے تھے کہ ان کی والدہ ماجدہ یعنی راقم الحروف کی دادی حضرت ان کی کم عمری ہی میں دنیا سے سدھار گئی تھیں۔ پھر پھوپھی اماں ہی نے انہیں پال پوس کر بڑا کیا اور تربیت دی۔ یہ باعث تھا کہ پھوپھی اماں خاندان میں سب سے بڑی مانی جاتی تھیں۔ ان کے ہونٹوں سے نکلا حکم حاکم کی حیثیت رکھتا تھا۔

پھوپھی اماں واہ واہ سبحان اللہ کیا تال مکھانے کا سالن بناتی تھیں۔ باقی رہا قورمہ تو خدا کے رزق قسم ہم نے پچھلے چالیس سال سے قورمہ نہ کھایا نہ آنکھ سے دیکھا۔ نہ وہ پکانے والے رہے نہ زعفران اور کیوڑہ خالص مہیا ہیں، پھر قورمہ کیسے تیار ہو اور چراغ حویلی سے تو قورمہ کا جنازہ اسی روز نکل گیا تھا جس روز پھوپھی اماں کی آنکھ بند ہوئی تھی۔ اب جو ہم قورمہ کھاتے ہیں تو قورمے کا منہ چڑاتے ہیں۔

ہاں پھوپھی حضرت جن دنوں لکھنؤ سے آجاتی تھیں، چراغ حویلی کے دسترخوان پر ایک نئی بہار آجاتی تھی۔ اناس کا زعفرخوب، شش رنگا مرغوب، شش رنگے کی ایک رکابی میں چھ ذائقے سموئے جاتے تھے اور چھ رنگ چمک دکھاتے تھے۔ ارے اب ہم کیا کھاتے ہیں۔ خالی چپاتی، گوشت اور چپاتی بھی اب کہاں میسر ہے۔ وہ تو ہمارے میاں چپاتی کے ساتھ چلی گئی۔ کیا چپاتی پکاتے تھے۔ ہر چپاتی ہاتھی کے کان سے بڑی، ورق سے زیادہ پتلی کہ پوری چپاتی چٹکی میں آجائے۔ میاں چپاتی ابا جانی کے چہیتے باورچی تھے۔ میاں چپاتی کو بھی ان سے بہت لگاؤ تھا۔ جب ابا جانی کی آنکھ بند ہوئی تو ہم سے زیادہ میاں چپاتی روئے۔ ٹھنڈے سانس بھرتے تھے اور کہتے تھے کہ قدردان تو چلا گیا، اب میرے بنائے ہوئے پستہ کے سالن پر کون داد دے گا اور ہوائی چپاتی پر کون شاباشی دے گا۔ بس اسی غم میں باورچی خانے سے کنارہ کش ہو گئے اور چھ مہینے کے اندر اندر چٹ پٹ ہو گئے۔

حیف صد حیف کہ زمانہ بدل گیا اور ذائقے رخصت ہو گئے۔ تصور کیا چاہیے کہ ہم کتنے ذائقوں کے ماتم دار ہیں۔ اب چراغ حویلی کے دسترخوان پر نہ پستے تال مکھانے کا سالن ہوتا ہے۔ نہ کیوڑے زعفران سے مہکتا ہوا قورمہ، نہ سلطانی دال، نہ اٹھارہ ورقی پراٹھے۔ نہ مزعفر، متنجن نہ یاقوتی کی کلیاں نہ شش رنگے کی طشتریاں نہ زعفرانی سویاں۔ سب لذتیں نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں۔

لذتوں ذائقوں پر کیا موقوف ہے۔ اس زمانے کا کونسا نقشہ اب باقی رہ گیا ہے۔ ابا جانی کا کیا اثر و رسوخ تھا۔ انہیں کے منہ سے فرنگی حاکموں نے اس ہیچ مقدرت کو خان بہادری کے خطاب سے نوازا۔ بعد میں آنے والے حاکموں نے بھی اپنے پیشرووں کی وضع کو خوب نبھایا کہ جو کلکٹر بہادر اس ضلع میں تعینات ہوتے ہیں وہ اس بے بضاعت کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ جب کبھی کلکٹر بہادر کا اس نواح میں ورود مسعود ہوتا ہے، حویلی کو مقرر اپنے قدوم میمنت لزوم سے زینت بخشتے ہیں اور کھانا تناول فرما کر حویلی کے دسترخوان کو عزت دیتے ہیں۔ مگر فقیر صاف صاف عرض کر دیتا ہے کہ یہ دسترخوان ابا جانی کے زمانے کا دسترخوان نہیں کہ پھوپھی اماں پھوپھی حضرت دونوں اس جہان سے سدھار گئیں اور میاں چپاتی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے کہ اب جنت میں ٹکی لگاتے ہیں۔ پھر بھی کلکٹر بہادر ہونٹ چاٹتے جاتے ہیں اور دوبارہ آ کر کھانا تناول فرمانے کا وعدہ فرما کر رخصت ہوتے ہیں۔ موجودہ کلکٹر بہادر دام اقبالہٗ تو ہمارے دسترخوان کا کلمہ پڑھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً قورمہ بریانی کی فرمائش کرتے ہیں۔ کاش انہوں نے ابا جانی کے زمانے کا دسترخوان دیکھا ہوتا۔

(قطع کلام ہوتا ہے۔ مگر مجھے اس ذکر سے اپنے گمشدہ ذائقے یاد آ گئے۔ بوجان اپنے بھلے وقت میں ماش کی دال بکھرواں کیا خوب پکاتی تھیں کہ فرش پر بکھیر دو اور چاول کے دانوں کی طرح چن لو۔

"بوجان، کبھی آپ ماش کی دال بکھرواں پکایا کرتی تھیں۔ اب تو زمانہ ہی ہو گیا وہ دال کھائے ہوئے۔"

بوجان نے میری بات بات سن کر ٹھنڈا سانس بھرا بولیں "بیٹے وہ بھلے وقتوں کی باتیں تھیں۔ اب ویسی دال پک نہیں سکتی۔"

"کیوں نہیں پک سکتی۔"

"بیٹے، وہ دال تو مٹی کی ہنڈیا میں پکا کرتی تھی۔"

"بوجان، مٹی کی ہنڈیا نایاب تو نہیں ہے۔ کل ہی لے آؤں گا۔"

"مٹی کی ہنڈیا تو لے آؤ گے۔ مگر میرے چاند مٹی کا چولہا کہاں سے مہیا کرو گے۔"

"مٹی کا چولہا" میں چکرایا "بوجان، مٹی کی ہنڈیا کی بات تو میری سمجھ میں آتی ہے۔ مگر مٹی کے چولہے کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مطلب تو آنچ سے ہے۔ وہ گیس کے چولہے میں بھی ہوتی ہے۔"

"بیٹے آنچ اور آنچ میں بھی تو فرق ہوتا ہے۔ جری لکڑیوں کی دھیمی آنچ پہ پک کر ہنڈیا کا جو مزہ نکلتا تھا وہ تمہارے گیس کے چولہوں پہ پکی ہوئی ہنڈیا کا نہیں نکل سکتا۔"

شاید یہی احساس تھا کہ بوجان رفتہ رفتہ باورچی خانے سے بالکل ہی بے تعلق ہو گئی تھیں۔ زبیدہ نے پکا کر جو سامنے رکھ دیا اسے بلا تبصرہ کھا لیا۔ نہ تعریف نہ تنقیص۔ آشیانے کے کچن میں جہاں زبیدہ نے بڑے ذوق و شوق سے گیس کے چولہے بازار سے منگا کر فٹ کیے تھے۔ بوجان نے بس ایک دفعہ قدم رکھا اور ان چولہوں کو اور ان پر چڑھے پریشر ککر کو دیکھ کر الٹے پیروں واپس ہو گئیں۔ بوجان جو کچھ بھی تھیں، چراغ حویلی کے باورچی خانے میں تھیں۔ کتنی مگن رہتی تھیں۔ دھوئیں سے بھرے اس بڑے باورچی خانے میں۔ ۔ ۔ ۔ جہاں بڑے بڑے مٹی کے چولہوں میں ہر دم موٹی موٹی لکڑیاں سلگتی رہتی تھیں اور ہر دم کوئی نہ کوئی ہنڈیا ان پر چڑھی ہی رہتی تھی۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو وہ رنگا رنگ دسترخوان جس کا میاں جان نے ذکر کیا، لپٹ چکا تھا۔ میاں جان کی پھوپھی اماں اور پھوپھی حضرت دونوں اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں، ان کے ابا جانی سدھار چکے تھے اور میاں چچا جی بھی منوں مٹی تلے جا سوئے تھے۔ اب وہ باورچی خانہ بوجان کی قلمرو تھا۔ خیر)

ابا جانی خود تو دو لقموں میں سیر ہو جاتے تھے۔ کھاتے کیا تھے، سونگھتے تھے۔ دسترخوان

تو اصل میں مہمانانِ عزیز اور یارانِ باتمیز کے لئے بچھتا تھا۔ جہاں اور وضعداریاں تھیں۔ ایک وضعداری یہ بھی تھی۔ ابا جانی کی وضعداری کا عالم تو یہ تھا کہ کہیں ایک دفعہ پھوپھی حضرت اور پھوپھا حضور کو ماہِ محرم میں ادھر آنا پڑ گیا۔ محض ان کی خاطر ابا جانی نے ایک مجلس کا اہتمام کیا۔ اگلا برس جب آیا اور وہ تاریخ قریب آئی تو اپنی وضع کا پاس کرتے ہوئے پھر مجلس کا اہتمام کیا۔ بس پھر وہ مجلس ہر برس ہونے لگی۔ اگرچہ خود ابا جانی گریہ اور ماتم کے قائل نہیں تھے۔ گریہ کا فریضہ ان کی طرف سے اس مجلس میں پنڈت سوم دت آنجہانی ادا کرتے تھے۔ کس اہتمام کے ساتھ دو رومال لے کر مجلس میں آتے تھے۔ ادھر مصائب شروع ہوئے ادھر ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا بہنے لگی۔ جب ایک رومال آنسوؤں سے شرابور ہو جاتا تو دوسرا رومال نکالتے۔ مجلس کے ختم پر دونوں رومال آنسوؤں سے تر بتر ہوتے۔

اپنا پنڈت گنگا دت اس بزرگ کی اکلوتی اولاد تھی۔ مجھے یاد ہے کہ بیٹے کو ان کی ایک ہی نصیحت تھی۔ "بیٹے گلہری بن گلہری۔ اسی میں تیرا کلیان ہے۔"

میں اس نصیحت پر بارہا چکرایا۔ ایک روز جسارت کر کے اس ہیچمداں نے پوچھا کہ "پنڈت چچا، گلہری بننے میں کیا بھید ہے؟"

تب اس بزرگ نے یوں فرمایا۔ "بھتیجے، یہ تب کی بات ہے جب ہمارے سری رامچندر جی لنکا میں پہنچنے کے لئے سمندر پہ پُل باندھ رہے تھے۔ ہنومان جی کی سینا پتھر ڈھونے پہ لگی ہوئی تھی۔ ادھر سے ایک گلہری کا گذر ہوا۔ اسے اچنبھا ہوئی کہ آج یہاں کیا ہو رہا ہے۔ پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ سری رامچندر جی کی آگیا سے یاں پہ پل بن رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کام میں مجھے بھی بھگوان کی سہائتا کرنی چاہیئے۔ اس نے یہ کیا کہ منہ میں ایک کنکری دبائی اور پتھر ڈھونے والے بندروں کے ساتھ ساتھ چلی۔ جہاں انہوں نے پتھر ڈالے وہاں اُس نے یہ کنکری ڈال دی۔ دیر تک وہ یہی کرتی رہی۔ بندر اسے دیکھ کے ہنسے۔ ایک بندر نے اسے اُٹھا کر الگ پھینک دیا۔ کہا کہ پرے ہٹ، ہمیں کام کرنے دے۔ گلہری بلا

کرنے لگی۔ سری رامچندر جی نے یہ دیکھا تو اسے اُٹھا کر پیار سے گود میں بٹھا لیا۔ بندروں سے کہا کہ بے بھلے بندرو۔ جو تمہارے بس میں ہے تم کر رہے ہو۔ جو گلہری کے بس میں ہے۔ گلہری کر رہی ہے۔ سو اس کا اپمان مت کرو۔ یہ کہہ کے انہوں نے شفقت سے گلہری کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیرا۔ بھگوان کی شفقت بھری انگلیوں کے نشان آج بھی گلہری کی پیٹھ پہ موجود ہیں"۔

پنڈت سوم دت آنجہانی رامائن کا پاٹھ کس استغراق سے کرتے تھے۔ رامائن ان کے ناخنوں میں تھی۔ گلستان انہیں ازبر تھی۔ پوجا پاٹ کتنے خضوع و خشوع سے کرتے تھے۔ پیشانی پہ کتنا لمبا تلک لگاتے تھے۔ عید پر انگرکھا زیبِ تن کر کے مفرِ آتے۔ اباجانی سے بغل گیر ہوتے، میرے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے اور عیدی عطا کرتے۔ اسی وضعداری سے ابا جانی ہولی دیوالی پر ان کے یہاں جاتے۔ پنڈت گنگا دت وضع احتیاط برتتے۔ ابا جانی کے روئے مبارک کو نہ تو گلال سے آلودہ کرتے نہ رنگ ڈالتے کہ ابا جانی تو ان مشاغل کو خرافات جانتے تھے اور ہندو رسوم کو شرک سے تعبیر کرتے تھے مگر دوستوں کے دوست تھے اور وضع کے پابند تھے۔ سو ہولی دیوالی پر دوست کے یہاں جانا ضرور تھا۔ تھالی میں سے ایک الائچی اور تھوڑی سونف اُٹھا کر منہ میں رکھ لیتے۔ لیجئے دوست کے تیوہار میں شریک ہو گئے۔ پنڈت سوم دت باپ کی کسر بیٹے کے ساتھ نکالتے۔ میرے منہ پہ اتنا گلال ملتے کہ میں بندر بن جاتا۔ پھر گنگا دت پچکاری چلا کے مجھے ٹیسو رنگ میں شرابور کر دیتا۔ ابا جانی سونف الائچی چباتے رہتے اور خاموش رہتے۔ دوست کی اس روش پر کبھی معترض نہیں ہوئے۔ اللہ اللہ کیا رواداری تھی اور کیا وضعداریاں تھیں۔

ابا جانی اس دارِ فانی میں اسی برس جئے۔ سفرِ حیات گلستان محل سے شروع ہوا اور چراغ حویلی میں آ کر انجام پذیر ہوا۔ پوری زندگی راہِ اعتدال پر گامزن رہے۔

جو روش ایک دفعہ پکڑ لی اس سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ صبح منہ اندھیرے تاروں کی چھاؤں میں اُٹھنا، مگدر ہلانا، تازہ پانی سے غسل کرنا اور فجر کی نماز پڑھنا۔ فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کہ شہد باسی روٹی اور عرق ماء اللحم سے عبارت تھا۔ پھر مطب کرنا۔ جاڑے گرمی برسات وہی ایک طور، حتیٰ کہ کبھی لباس میں بھی فرق نہیں دیکھا گیا۔ لٹھے کا چوڑی دار پائجامہ، ململ کا کرتا، چکن کا انگرکھا کہ گرمیوں میں پہنتے تھے۔ مہاوٹ کے جاڑوں میں بھی زیبِ تن کئے رہتے تھے۔ مگر کیا صحت تھی کہ بخار جاڑا کیا معنی کبھی چھینک بھی نہیں آئی۔ بتیسی آخر وقت تک سلامت رہی اور پتلی آنکھ کی آنکھ بند ہونے تک روشن رہی۔

ابا جانی نے فکر و پریشانی کو کبھی قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ آخری عمر میں بس ایک ملال دامن گیر ہو گیا تھا کہ ان کے اُٹھ جانے کے بعد خاندانی مسندِ حکمت پر کون بیٹھے گا۔ کفِ افسوس ملتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے صاحبزادوں کو علی گڑھ بھیج کر کتنی رکعت کا ثواب کمایا۔ ایک صاحبزادے دین سے بیگانہ ہو گئے۔ دوسرے صاحبزادے نے فرنگی کی چاکری کر لی۔

ابا جانی بس ایک ملال دل پر دھر کر لے گئے۔ مگر اس کے باوصف آخری گھڑیوں میں بہت پُرسکون نظر آتے تھے۔ کس سادگی سے پردہ کیا کہ لیٹے لیٹے ایک ہچکی لی اور آنکھیں موند لیں۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون۔

فرزندِ اکبر ہونے کی بنا پر اس خاکسار ہی نے ابا جانی کو قبر میں اُتارنے کا شرف حاصل کیا۔ جب میں قبر میں اُترا تو خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ قبر خوشبو سے مہک رہی تھی اور جب ابا جانی کا جسدِ مبارک میرے ہاتھوں میں آیا تو وہ پھول کی مثال ہلکا تھا۔ میں حیران کہ یا الٰہی ابا جانی تو دوہرے بدن کے تھے۔ کاٹھی بنی ہوئی تھی اور اس گھڑی اتنے سُبک ہیں کہ جیسے آدمی کی لاش نہ ہو پھولوں کی ڈالی ہو۔

چراغ حویلی سے ابا جانی کا جنازہ کیا نکلا کہ پھول سے خوشبو نکل گئی۔ کیا امی جی
رہتی تھی۔ مطب مریضوں سے بھرا ہوا۔ دیوان خانے میں ملاقاتیوں کی چہک مہک۔
اب مطب سنسان تھا۔ دیوان خانہ ویران تھا۔ ڈیوڑھی سونی پڑی تھی۔

ہمارے ابا جانی طب کے آخری چشم و چراغ تھے۔ وہ دنیا سے سدھارے
تو پھر خاندان کی مسند طب پر کوئی بیٹھنے والا نہ رہا۔ ابا جانی اس فن شریف کے رموز و نکات
کو کسے منتقل کرتے سینہ پہ دھر کے لے گئے۔ ان کا ملال اس ناخلف کے دل پر
داغ ہے۔ مگر کیا کرتا طبیعت سے مجبور تھا۔ ابا جانی نے سکھانے پڑھانے کی اپنی
سی کوشش کی مگر طبیعت نے اس ہنر سے میل نہیں کھایا یا شاید تقدیر ہی میں فرنگی
کی چاکری لکھی تھی۔ ابا جانی کا اثر و رسوخ کام آیا۔ نائب تحصیلداری کی اسامی پر
تقرری ہو گئی۔ اس چاکری نے فقیر کو بہت خراب کیا۔ آج یہاں کل وہاں۔ روز روز
کے تبادلوں نے کہیں جم کر بیٹھنے نہ دیا اور جس شہر میں تبادلہ ہوتا وہ شہر کاٹ کھانے
کو آتا۔ ایک شہر بھلا لگا مگر وہاں اور ہی افتاد پڑی۔ الٰہی کسی کو مسافرت میں دل زدہ
مت کیجیو۔ باقی شہروں میں سو طرح کے رنج کھینچے۔ مگر اس شہر میں آ کر رنج عشق
کھینچنا پڑا کہ سب رنجوں سے سوا تھا۔ صاحبو وہ شہر ناپرساں نکلا۔ شربتِ وصل
تو دور رہا اس عشوہ طراز نے تو ایک جھلک دکھا کر شربتِ دیدار کو بھی ترسا دیا۔ کتنے
پاپڑ بیلنے اور خوار ہونے کے بعد ملاقات کی گھڑی آئی۔ مگر کیا آئی، وصل کے نام
پر وہ خام پارہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ پھر تو ایسی گئی کہ پھر شکل نہیں دکھائی۔ کتنے دنوں اس
شہر میں خراب پھرتا پھرا۔ سدھ بدھ کھو بیٹھا۔ طبیعت خفقانی ہو گئی۔

انہیں دنوں ایسا ہوا کہ بڑے دن کی چھٹیوں میں گھر آنا پڑا۔ ابا جانی نے میری صورت
دیکھی تو ٹھٹک گئے۔ آخر زمانے کا گرم و سرد دیکھے ہوئے تھے۔ پھر در پر ان کے ایسے
مریض بھی تو آتے تھے کہ انہیں کوئی بیماری نہیں ہوتی تھی۔ مگر وہی سب سے بڑھ

کر بیمار ہوتے تھے۔ ابا جانی نے اس بیمار کا علاج خوب سوچا کہ جھٹ پٹ تلاش
کر کرا کے ایک نیک بخت کے ساتھ ہمیں رشتہ مناکحت میں باندھ دیا۔ ساتھ ہی
یہ بندوبست کیا کہ حکام بالا سے کہہ سن کر ہمارا تبادلہ دور کے شہر میں کرا دیا۔

علاج کارگر ہوا۔ ازدواجی ذمہ داریوں نے مجھے الجھا لیا۔ پھر آنکھ اوجھل پہاڑ
اوجھل۔ جب وہ شہر ہی چھٹ گیا تو اس شہرِ خوبی کا خیال بھی دور ہوتا چلا گیا۔ یوں
اب بھی جب اس کا خیال آ جاتا ہے تو دل تلملا جاتا ہے۔ خیر تو جب طوفان ذرا
تھما تو اپنی سرکاری ذمہ داریوں کا بھی دھیان آیا۔ پھر میں نے دلجمعی سے اپنے فرائض
منصبی بجا لانے شروع کئے۔ پھر تو ترقی کے در وا ہو گئے اور درجات بلند حاصل ہوتے
چلے گئے۔ آخر الامر ڈپٹی کلکٹری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوا۔ اس منصب کو فقیر
نے اس خوش اسلوبی سے نبھایا اور سرکار انگلیسیہ کی وہ خدمات انجام دیں کہ حکام بالا
نے خوش ہو کر ریٹائرمنٹ کے وقت مجھے خان بہادری کا خطاب عطا فرمایا اور
آنریری مجسٹریٹ کے منصب سے نوازا کہ ہنوز جاری ہے۔ آگے اس ڈیوڑھی
پر مریضوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اب داد خواہوں کا مجمع ہوتا ہے۔ مگر ڈیوڑھی کی وہ
رونق اجداد کے کسبِ کمال سے تھی، یہ رونق فرنگی حکام کی نظرِ کرم کی مرہونِ منت
ہے۔ سو اس کا کیا اعتبار، آج ہے کل رہے رہے نہ رہے۔ آسمان کا رنگ جوں جوں
بدلتا ہے توں توں فقیر کا دل ہولتا ہے۔ چراغ حویلی دائم آباد رہے مگر میرے دل
میں وسوسہ بیٹھ گیا ہے۔ تیور جو زمانے کے اچھے نہیں ہیں۔

۵

میں نے دیکھا کہ آشیانے کی منڈیریں سپاٹ ہیں، نہ کوئی برجی، نہ کوئی ممٹی۔ میرا دل بیٹھ گیا اب سے پہلے یہ بات میرے دھیان ہی میں نہیں آئی تھی۔ نئے گھر کا بھی عجب نشہ ہوتا ہے نئی تعمیر ایسا سحر باندھتی ہے کہ تعمیر کی خامیاں اور کمیاں نظر ہی نہیں آتیں۔ وقت کے ساتھ بالعموم موسموں کے اثر سے یہ نشہ رفتہ رفتہ اترتا ہے اور سحر ٹوٹتا ہے پھر یہ خامیاں اور کمیاں نظر آنی شروع ہوتی ہیں۔ مجھے تعمیر میں اس نقص کا احساس پرندوں کے واسطے سے ہوا۔ میں نے دیکھا کہ پرندے آشیانے کی منڈیروں سے کنی کاٹ کر نکل جاتے ہیں اور قریب میں کھڑے ہوئے درختوں کی پھننگوں پر جا کر پڑاؤ کرتے ہیں۔ میرے لیے ان کا یہ طرز عمل تعجب خیز تھا اور مایوس کن بھی۔ مجھے کتنا اشتیاق تھا کہ رنگ برنگے پرندے ہمارے آشیانے کی منڈیروں پر آ کر ٹھکانا کریں، چہچہائیں۔ توقع تو یہی تھی۔ منڈیروں میں پرندوں کے لیے ایک کشش ہوتی ہے پرندہ کتنے ہی لمبے سفر پہ رواں دواں ہو مگر رستے میں کوئی منڈیر نظر آ جائے تو وہ اس پہ ضرور اتر پڑتا ہے بیشک گھڑی بھر بعد پھر اڑ جائے۔

میں نے پرندوں کے اس طرز عمل کی توجیہہ پہلے تو یہ کی کہ آشیانہ ابھی نیا نیا ہے نئی دیواریں اور منڈیریں پرندوں کے لیے اجنبی اجنبی ہوتی ہیں شاید وہ انہیں اپنی کشادہ فضا میں رخنہ نظر آتی ہیں مگر موسموں کے عمل کے ساتھ ساتھ منڈیریں پرندوں کے لیے مانوس ہوتی چلی جاتی ہیں اور کسی کسی منڈیر سے تو ان کا انس اتنا بڑھ جاتا ہے کہ ہر پھر کر وہ اسی پہ آ کر پڑاؤ کرتے ہیں اور کسی کسی پرندے کا رشتہ تو منڈیر کے ساتھ اتنا گہرا ہو جاتا ہے

کہ وہ وہاں اتر کر بھول ہی جاتا ہے کہ اسے یہاں سے اڑان بھی کرنی ہے۔

فاختہ، کبوتر، چیل، یہ وہ پرندے ہیں جن کا منڈیروں سے رشتہ بڑھتے بڑھتے بالعموم یہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ میں اتنا سوچ پایا تھا کہ اچانک میرے دھیان میں یہ بات آئی کہ پرندے منڈیر پہ اتر کر ممٹیوں اور برجیوں پہ بیٹھنا زیادہ پسند کرتے ہیں پھر ان کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ جس منڈیر پہ وہ اتریں اس کی دیوار اونچی ہو۔ دانہ دنکے کے متلاشی پرندے جیسے گوریا، چڑیاں یا کوے پست دیواروں اور سپاٹ منڈیروں کے ساتھ بھی گزارہ کر لیتے ہیں بلکہ شاید انہیں کو ترجیح دیتے ہیں کہ وہاں سے صحن میں پڑے ہوئے ٹکڑے نوالے تک رسائی آسان رہتی ہے مگر جو پرندے دانے دنکے سے بے نیاز آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرتے ہیں وہ نیچے اترتے ہوئے فلک بوس برجیوں اور ممٹیوں پر ڈیرا کرنا پسند کرتے ہیں کوئی چینی کبوتر آسمان پر تارا بن جانے کے بعد جب نیچے آنے لگتا ہے تو کوئی اونچی ممٹی کوئی فلک بوس برجی اسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور وہاں اتر کر وہ اتنا مگن ہوتا ہے کہ یہ بھول ہی جاتا ہے کہ اسے اپنی چھتری پر واپس جانا ہے اور چیل تو اونچی ممٹی پہ بیٹھ کر فوراً ہی مراقبہ میں چلی جاتی ہے مگر میں نے سوچا، آشیانے کی نہ تو دیواریں اونچی ہیں نہ اس کی منڈیروں پر کوئی ممٹی اور برجی قسم کی کوئی چیز ہے۔ بلند پرواز پرندوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ان کے پاس کیا ہے۔

پہلے مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ تعمیر کے دوران میں نے اس بات پر دھیان کیوں نہیں دیا تھا لیکن میں دھیان کیسے دیتا۔ میری تو سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے تعمیر کا بچھا ہوا نقشہ مجھے تو بس اینٹ گارے کا بلوہ نظر آتا تھا۔ اس بلوے میں سے کیا شکل ابھرے گی مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا ہاں زبیدہ کی نظر ساری جزئیات اور تفصیلات پہ تھی۔ بھلا اسے ممٹیوں اور برجیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پھر مجھے ساجد پر غصہ آیا۔ مکان کا نقشہ میں نے ساجد ہی سے بنوایا تھا؟

وہ میرے ساتھ دفتر میں رہ چکا تھا مجھ سے جونیئر تھا رفتہ رفتہ خاصی دوستی اور بے تکلفی تھی پھر وہ امریکہ چلا گیا وہاں سے وہ بہت ماڈرن قسم کا آرکیٹکٹ بن کر آیا اور اپنے پیشے میں مصروف ہو گیا پھر میرا اور اس کا ٹاکرا ہی نہیں ہوا مکان کے نقشہ کا جب مسئلہ پیدا ہوا تو مجھے اس کا خیال آیا میں اس سے جا کر ملا۔ بہت خوش ہوا۔ مکان کے ذکر پر اس نے خود ہی پیشکش کی کہ اخلاق بھائی تمہارے مکان کا نقشہ میں بناؤں گا اور دیکھنا بارہ مرلہ کی جگہ کو اس طرح استعمال میں لاؤں گا کہ وہ ایک کنال میں پھیلی کوٹھی نظر آئے گی اس وقت اس نقشہ سے میں مطمئن تھا مگر اب مجھ پر اس کے نقص کھل رہے تھے میں ساجد کے پاس گیا اور کہا کہ "بھئی ساجد تم نے تو خالص مغربی سٹائل میں ہمارا مکان کھڑا کر دیا کچھ اس خاکسار کے دیسی مذاق کا بھی لحاظ رکھا ہوتا۔"

"اچھا۔ کیا کمی رہ گئی اس گھر میں؟"

"یار! وہاں ممٹی کوئی نہیں ہے"

"ممٹی! یہ کیا شے ہوتی ہے"

"کمال ہے ساجد، تم اپنے پرانے طرز تعمیر سے اتنے نا آشنا ہو، ممٹی کو نہیں جانتے۔ پرانے روایتی مکانوں کی دیواریں بہت اونچی ہوا کرتی تھیں، منڈیریں ان کی خاص وضع کی ہوتی تھیں اور گوشوں میں کوئی برجی کوئی ممٹی ہوتی تھی"

"اچھا اچھا برجی میں سمجھ گیا مگر اخلاق بھائی تم نے مجھ سے مکان کا نقشہ بنوایا تھا قلعہ کا نقشہ بنانے کو تو نہیں کہا تھا۔"

"نہیں یار قلعہ تو اور ہی شے ہوتی ہے اس میں تو بہت کچھ ہوتا ہے اب جیسے ہماری چراغ حویلی تھی جس میں ......"

"یار اخلاق بھائی!" ساجد نے فوراً میری بات کاٹی "ایک تو میں اس بات سے بہت تنگ ہوں کہ ادھر سے جو بھی آیا ہے وہ ایک پودینے کا باغ اور ایک حویلی ضرور

چھوڑ کر آیا ہے" زور سے ہنسا۔ میں بھی ہنس دیا۔ پھر کہنے لگا "خیر پودینے کے باغ تو میرا دردِ سر نہیں ہیں مگر ادھر رہ جانے والی حویلیوں نے مجھے بہت پریشان کیا ہے بھائیوں کے نام دس دس اور پانچ پانچ مرلے کے پلاٹ قرعہ میں نکلے ہیں مگر نقشہ بنوانے آتے ہیں تو حویلی کا تصور دماغ میں لے کر آتے ہیں۔ ایک بزرگ مجھے ہدایت دینے لگے کہ میرے عزیز انگنائی کشادہ ہونی چاہیے ہم نیم کا پیڑ لگائیں گے چاہتے ہیں کہ ساون میں بٹیا کے جھولے کا کچھ بندوبست رہے میں نے عرض کیا کہ قبلہ ہمارے پاس دس مرلہ جگہ ہے آپ نے اپنی جو ضروریات بتائیں ان کے پیش نظر کوارٹر ایا خاصا رکھا گیا ہے۔ انگنائی دنگنائی تو میں جانتا نہیں۔ چھوٹے سے لان کی گنجائش نکلتی ہے اس میں میری دانست میں تو کچھ پودے ہی لگائے جا سکتے ہیں آپ بے شک برگد کا پیڑ کھڑا کر لیں۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ آپ نئے ارنی ٹیکٹ مغربی طرز تعمیر کو اپنے اوپر اتنا سوار کر لیتے ہیں کہ اپنے یہاں کے طرز تعمیر کو خاطر ہی میں نہیں لاتے یا اس سے نا آشنا ہوتے ہیں نہ یہاں کی آب و ہوا کا لحاظ رکھتے ہیں نہ یہاں کے رہن سہن کا۔"

"اخلاق بھائی آپ کو شاید یہ احساس نہیں ہے کہ آپ کا رہن سہن کتنا بدل چکا ہے آپ کو شکایت ہے کہ آپ کے مکان کی دیواریں نیچی ہیں اونچی چھتوں دیواروں والے مکانوں کا زمانہ گذر گیا۔ اب ائرکنڈیشنر آ گیا ہے۔

"مگر میں ائرکنڈیشنر افورڈ نہیں کر سکتا۔ خس کی ٹٹی البتہ افورڈ کر سکتا ہوں۔"

"مگر اخلاق بھائی خس کی ٹٹی کو یہ ہمارا زمانہ افورڈ نہیں کر سکتا اور جہاں نمک مرچ تک میں ملاوٹ ہوتی ہے وہاں آپ کو اصلی خس کہاں مل جائے گی تو جہاں آپ نے مکان کی تعمیر میں اتنے لاکھ خرچ کر دیئے ہیں وہاں چند ہزار خرچ کر کے ایک ائرکنڈیشنر لے لیجیے۔"

ساجد نے میری ایک نہیں چلنے دی اپنی کہے گیا آخر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "ساجد" تم کچھ ہی کہو مگر تمہارا ایک جرم میں معاف نہیں کر سکتا۔"

"کیا ؟"

"تم نے اتنی بڑی عمارت میرے لیے کھڑی کر دی مگر اس میں تم ایک ممٹی کی گنجائش پیدا نہ کر سکے۔

ساجد نے قہقہہ لگایا اور چلتے چلتے کہا کہ "اخلاق بھائی آپ کی ایک ممٹی کے لیے میں اپنی ماڈرن آرکیٹیکٹ والی ریپوٹیشن کو خاک میں نہیں ملا سکتا تھا۔"

میں نے جب زبیدہ سے مکان کے اس نقص کا ذکر کیا تو اس نے بھی اس نقص کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ الٹا مجھے الزام دینے لگی "اخلاق جب مکان بن رہا تھا تو میں نے تمہاری کتنی منتیں کی تھیں کہ ان راج مزدوروں کا کوئی اعتبار نہیں میں ہر وقت ان کے سر پہ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ تم بھی تھوڑی بہت نگرانی کر لیا کرو۔ کوئی نقص نظر آئے تو فوراً ٹوک دیا کرو اس وقت تو تم نے میری سنی نہیں اب تم روز گھر میں ایک نقص نکال دیتے ہو۔" پھر فوراً ہی ابوجان سے مخاطب ہوئی "بوجان آپ سن رہی ہیں اپنے بیٹے کی باتیں۔"

بوجان اپنے مراق میں بیٹھی تھیں ابھی تک انہوں نے ہماری باتوں پہ دھیان نہیں دیا تھا۔ مخاطب کیے جانے پر چونکیں "کیا ہوا۔"

"آپ کے بیٹے کو یہ مکان پسند نہیں آیا۔ کہتے ہیں کہ ناقص بنا ہے۔"

"اے بیٹے کیا نقص ہے اس میں۔"

اب مجھے اپنی بات کی وضاحت کرنی پڑی "بوجان آپ کو چراغ حویلی کی چھت یاد ہے چاروں طرف کتنی اچھی جالی بنی ہوئی تھی اور چاروں گوشوں میں کتنی خوبصورت

برجیاں بنی تھیں اور ممٹیاں۔"

بوجان کو اشارہ مل گیا بس جاری ہو گئیں۔ "چراغ حویلی کی برجیاں تو ایسی خوبصورت تھیں کہ حویلی قلعہ نظر آتی تھی۔ تھی بھی تو اتنی اونچی سٹیشن سے اس کی برجیاں نظر آنے لگتی تھیں۔ اللہ رکھو نگر میں سب سے اونچی عمارت تھی اور پھاٹک کتنا اونچا تھا کہ ہاتھی مع ہودے کے اس میں سے گذر جائے قدم رکھتے ہوئے لگتا کہ قلعہ میں داخل ہو رہے ہیں۔"

چراغ حویلی کا بلند و بالا پھاٹک میرے تصور میں گھوم گیا محرابی پیشانی جس پہ دائیں بائیں دو بڑی بڑی مچھلیاں بنی ہوئی تھیں خیر وہ تو حویلی تھی اور حویلی کے دروازے ہاتھی کے حساب ہی سے بنائے جاتے تھے چاہے ہاتھی ڈیوڑھی میں بندھا ہو یا نہ بندھا ہو پھر آخر ہاتھی کی سواری کرنے والوں کے بھی تو کچھ قد ہوتے تھے مگر چھوٹے مکانوں کے دروازے بھی کتنے چوڑے اور اونچے ہوتے تھے۔ دو پٹوں والے پیتل کی موٹی موٹی کیلوں سے مرصع کنواڑ، دائیں بائیں اونچی چوکیاں ستونوں کے ساتھ، ان کے اندر لمبے اور گہرے طاق، چوکھٹ اونچی، کشادہ ڈیوڑھی، ان دروازوں کے مقابلے میں مجھے آشیانے کا پستہ قد گیٹ کتنا بے وقار نظر آیا۔ کوٹھیوں کے گیٹ تو موٹر کے حساب سے بنائے جاتے ہیں مگر عجیب بات ہے' میں نے سوچا' سواری کے قد کے ساتھ آدمی کا قد بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

بہرحال میں نے سوچا کہ اب آشیانہ منہدم ہو کر دوبارہ تو تعمیر ہو نہیں سکتا۔ انہیں در و دیوار کے ساتھ گذر بسر کرنی ہے۔ برسات لگ چکی تھی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ ہارسنگھار کا ایک پودا لا کر لان کے ایک گوشہ میں لگا دیا۔ پرندوں کو تو کسی نہ کسی طرح آشیانے میں اتارنا ہی تھا مجھے گمان سا تھا کہ شاید پرندے مہکتے درخت پہ اترنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

برسات کا احوال مت پوچھو۔ ساون کے پہلے ہی ڈونگرے کے ساتھ آشیانے کی
چھتوں نے ٹپ ٹپ شروع کر دی۔ زبیدہ کو اب پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ آشیانہ اتنا پختہ
نہیں بنا ہے جتنا وہ سمجھ رہی تھی اب اسے اپنی چوک کا احساس ہوا کہ لنٹر پڑتے وقت
اوپر جا کر اس نے نگرانی نہیں کی تھی۔ ٹھیکیدار اسے جل دے گیا۔ میٹیریل بچا لیا۔ ریت
زیادہ کھپا دی۔ چھتوں کو تو ٹپکنا ہی تھا بس اس واقعہ کے ساتھ ہی برسات کے بارے
میں میرے اور زبیدہ کے ردعمل میں فرق پیدا ہوتا چلا گیا جب گھٹا گھر کر آتی تو میری
خواہش یہ ہوتی کہ اسے موسلا دھار برسنا چاہیے زبیدہ کی دعا ہوتی کہ خالی گرج کر
گذر جائے۔ سو میں ڈونگرے کی آس لگا کر برآمدے میں آ بیٹھتا اور زبیدہ تسبیح
لے کر پچھلے حصے میں کھڑے پستہ قد کیکر کی طرف دوڑتی۔ یہ کیکر اس زمین میں پہلے
سے کھڑا تھا زبیدہ نے تو چاہا تھا کہ اسے کاٹ دیا جائے کہ اس سے تعمیر میں کھنڈت
نہ پڑے مگر میں نے اسے نہیں کٹنے دیا۔ زبیدہ کو اس برسات میں اس کی افادیت
کا احساس ہوا۔ گھٹا جب گھر کر آتی تو وہ تسبیح لے جا کر اس کی شاخ سے باندھ دیتی۔

"یہ کیا چکر ہے؟"

"یہ بی بی فاطمہ کے نام کی تسبیح ہے اسے صحن میں کھڑے درخت میں باندھ دیا جائے
تو پھر بارش نہیں ہوتی۔"

"مگر زبیدہ یہ ساون کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہے اور نہ دھوپ اور لو سے
ستائی ہوئی خلقت کے ساتھ۔"

"ہاں تم یہ باتیں کرتے رہو۔ بارش ہونے کے ساتھ جب چھتیں ٹپکتی ہیں تو مصیبت
تو مجھے جھیلنی پڑتی ہے۔"

چھتیں جیسی پڑی تھیں ان کا پتہ تو برسات کے واسطے سے چل گیا باقی عمارت
کی کیفیت کا کس طور پتہ چلتا۔ مگر اب شک تو پوری عمارت کے بارے میں پیدا ہو

گیا تھا کمرے کی ایک دیوار میں دراڑ دیکھ کر زبیدہ اس تشویش میں پڑ گئی کہ کہیں عمارت
کی بنیاد تو نہیں بیٹھنے لگی ہے اب میں نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لیا کہ اسے عمارت کی طرف سے
اطمینان دلاؤں "نہیں زبیدہ۔ بنیاد عمارت کی پختہ رکھی گئی ہے۔"

"کیا پتہ ہے۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا۔" زبیدہ نے افسردہ لہجہ میں کہا اور چپ ہو
گئی پھر بولی "میں تو اس وقت سے ڈرتی ہوں جب عمارت سانس لے گی۔"

"اس کا کیا مطلب ہے۔"

"بات یہ ہے کہ عمارت بن چکنے کے بعد ایک مرتبہ سانس لیتی ہے کوئی کوئی عمارت
تو سانس لینے کے ساتھ ہی بیٹھ جاتی ہے۔"

خیر یہ تشویش لمبی نہیں کھنچی۔ برسات کے ساتھ بات آئی گئی ہو گئی۔ زبیدہ جیسے
بھول ہی گئی ہو کہ کبھی برسات بھی آئی تھی اور چھتیں ٹپکی بھی تھیں وہ آشیانے کے در دیوار
کے بیچ اب اتنی ہی مگن تھی جتنی برسات سے پہلے ہوا کرتی تھی میں کبھی کبھی بے اطمینان
ہو جاتا تھا۔

"زبیدہ اس گھر میں کوئی طاق نہیں ہے۔"

"طاق؟" زبیدہ نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

"ہاں ایک دو طاق گھر میں ہونے چاہیے تھے اسی طرز کے محرابی شکل والے۔
دیکھو نا بجلی اب گھنٹوں کے حساب سے جاتی ہے اور تمہیں موم بتی ٹکانے کے لیے کوئی
مناسب جگہ میسر نہیں آتی طاق ہوتے تو ان میں شمعدان رکھے ہوئے بھلے لگتے اور
کمرے میں روشنی بھی اچھی ہوتی۔"

"ہاں۔ اور پھر طاق دھوئیں سے رچ جاتے۔ پھر کمرے کتنے خوبصورت لگتے۔"
زبیدہ نے طنز بھرے لہجہ میں کہا۔ چپ ہو گئی۔ پھر بولی "اخلاق، تمہیں وہیں رہنا
چاہیے تھا اپنی چراغ حویلی میں۔"

بوجان بیچ میں بول پڑیں" دلہن تم ٹھیک کہتی ہو میاں جان نے تو مرتے مرتے سمجھایا کہ جہاں ہو وہیں بیٹھے رہو خدا جو دکھائے سو دیکھو۔ میں نے بھی کہا کہ کان کاٹے کوسوں جا رہے ہو۔ مگر اخلاق کے باپ کو تو پاکستان سے عشق ہو گیا تھا۔ اِدھر میاں جان کی آنکھ بند ہوئی اُدھر چل کھڑے ہوئے مگر ان کی قسمت میں برتنا نہیں تھا یہاں آکر کتنے دن جیئے۔ ادھر آئے ادھر گئے۔"

"ان کے حق میں اچھا ہی ہوا۔"

"اے ہے یہ کیا بات ہوئی۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں بوجان۔ کتنے صدموں سے بچ گئے۔"

تو خیر آشیانے کے بارے میں میری بے اطمینانی بھی لمبی نہیں کھنچی۔ آشیانے ہی کی تقریب سے پریشانیوں کا ایک ریلا آیا اور اس بے اطمینانی کو بہا کر لے گیا۔ میں نے بتایا نا کہ دفتر سے ہاؤس بلڈنگ والوں سے مختلف بنکوں سے تو میں نے قرضے لیے ہی تھے، آخر میں کچھ دوستوں عزیزوں سے بھی چھوٹے چھوٹے قرضے ہی کوئی دو دو ہزار ڈھائی ڈھائی ہزار روپے والے لے ڈالے تھے۔ میرا خیال تھا کہ کم از کم یہ لوگ میری مشکلات کو دیکھتے ہوئے تھوڑا توقف کریں گے مگر وہ ہاؤس بلڈنگ والوں اور بنکوں سے بڑھ کر بے صبرے نکلے ان سے پہلے ان کے تقاضے شروع ہو گئے اور سب نے ایک دم سے تقاضے کیے اِدھر ایک بنک سے بھی یاد دہانی کا پروانہ آگیا کہ آپ نے ابھی تک قسطوں کی ادائیگی شروع نہیں کی ہے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"زبیدہ، یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے قرض خواہ تو مہلت دینے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں"۔

"ہاں یہ تو بڑی مصیبت ہے کمبختی مارے ہماری بوٹیاں نوچے ڈال رہے ہیں"۔

"اگر میں ان سب کے قرض اکٹھا چکانا کر دوں تو گھر میں فاقے پڑ جائیں گے۔

اور پھر بھی سب کی ادائیگی نہیں ہوگی۔ آخر ایک تنخواہ میں کتنوں کو بھگتاؤں گا۔"

"اخلاق تمہیں اب اور کوئی سبیل نکالنی چاہیے ایک سوکھی تنخواہ سے اب گاڑی نہیں کھنچے گی۔ اور تمہاری نوکری میں تو بالائی آمدنی بھی نہیں ہے"۔

"آخر کیا سبیل نکالی جائے۔ میری تو سمجھ میں کچھ آتا نہیں۔"

"سوچو۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ دنیا کو دیکھو کس کس طریقے سے لوگ کمائی کر رہے ہیں۔ تمہاری طرح خالی تنخواہ پہ تکیہ کر کے تو کوئی بھی نہیں بیٹھا ہوا۔"

قرض خواہوں کا دباؤ، ان سے بڑھ کر زبیدہ کا دباؤ۔ مجھے اضافی آمدنی کے لیے سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ صدیقی صاحب کا خیال آیا اور سمجھا کہ میری مشکلات کا حل نکل آیا۔ صدیقی صاحب ہمارے دفتر کے اکاؤنٹس سیکشن میں تھے معمولی تنخواہ تھی بائیسکل پہ دفتر آتے جاتے تھے۔ ایک دن اچانک سکوٹر کو فراٹے سے چلاتے ہوئے آئے۔ رفقائے کار ان کے سکوٹر کو دیکھ کر حیران بھی ہوئے خوش بھی ہوئے۔ خوشی میں ان سے مٹھائی بھی کھائی۔ مگر دفتروں میں تاڑنے والے بھی ہوتے ہیں جو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں بس صدیقی صاحب ایک ایسے ہی رفیق کار کی خصوصی توجہ کا مرکز بنے اور مشکل میں پھنس گئے۔ حساب کتاب میں گھپلا نکلا۔ بقول بعض لمبا غبن کیا تھا۔ بہرحال سفارشیں کرا کے کیس کو دبوایا۔ پھر استعفےٰ دیدیا۔ دفتر سے فراغت پا کر سارے جھنجھٹ سے چھوٹ گئے۔ اِدھر سے فراغت پا کر اپنا کاروبار شروع کیا۔ ایک ڈائجسٹ نکالا جو چھ ماہ کے اندر اندر بیسٹ سیلر بن گیا اور سال کے ختم ہوتے ہوئے صدیقی صاحب نے سکوٹر کو ریٹائر کر دیا اور کار خرید لی۔ مجھ سے ان کے تعلقات شروع سے خوشگوار چلے آتے تھے۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "اخلاق صاحب کچھ ہمارا ہاتھ بٹائیے"۔

"کیسے"

"کچھ ہمارے لیے لکھیے"۔

"صدیقی صاحب کیسی باتیں کرتے ہیں لکھنے والوں سے لکھوائیے، میرا اس فن شریف سے کیا تعلق ہے۔"

"آپ نے اتنی کتابیں پڑھی ہیں لکھنا چاہیں تو آپ لکھ بھی سکتے ہیں۔"

"کتابیں پڑھنے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اسے لکھنا بھی آتا ہو۔ میں کتاب پڑھتا ضرور ہوں، لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔"

"اخلاق صاحب ایک مرتبہ آپ قلم اٹھائیے پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ میں لکھنے کی کتنی صلاحیت ہے یوں کیجیے کہ ہمارے لیے انگریزی سے کسی جاسوسی ناول کی تلخیص کر دیجیے ان ناولوں پر تو آپ کی نظر ہوگی۔"

"نہیں صدیقی صاحب، یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔"

"آپ ہمت تو کیجیے اور ایک بات میں عرض کر دوں آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی یہ گارنٹی دیتا ہوں کہ ایک سال کے اندر اندر آپ رکشاؤں کے جھمیلے سے نکل جائیں گے۔ چار پہیوں والی آپ کے قدموں تلے ہوگی۔

میں نے مشکل سے جان چھڑائی مگر تھوڑے عرصے کے بعد صدیقی صاحب پھر آکر مجھ سے ملے۔ اب کے ان کا رنگ اور تھا۔ کہنے لگے۔ "اخلاق صاحب، آپ کی دعاؤں سے اور اللہ تعالٰی کے فضل و کرم سے پیسہ تو ہم نے دال روٹی لائق کما لیا ہے اب سوچتے ہیں کہ پاکستان کی بھی کچھ خدمت کرنی چاہیے"

"اچھا خیال ہے" میں یہی کہہ سکتا تھا اور کیا کہتا۔

"اس کا خیال مجھے مڈل ایسٹ کا دورہ کرتے ہوئے آیا۔

آپ کو پتہ ہے کہ ہمارا ڈائجسٹ مڈل ایسٹ میں بہت نکلتا ہے میں نے پچھلے دنوں وہاں کا ایک سروے کیا۔ بہت بڑی مارکیٹ ہے صاحب۔ اور بہت امکانات

ہیں کوئی کام کرنے والا ہے۔ اس وقت تو وہاں انڈیا چھایا ہوا ہے اور صاحب کس کمال سے وہ اپنے کلچر کا پروجیکشن کرتے ہیں وہاں سے مجھے خیال آیا کہ ہم وہاں پاکستان کا پروجیکشن کیوں نہ کریں۔ آخر ہماری بھی ثقافت ہے، ادب ہے، آرٹ ہے تو اس سلسلہ میں آپ ہماری کیا مدد کریں گے۔ کچھ لکھنا پسند کریں گے کوئی کتاب بس ایسی کہ پاکستانی کلچر پر حرفِ آخر ہو۔ بہت ضرورت ہے ایسی کتاب کی۔"

"صدیقی صاحب آپ کو پتہ ہی ہے کہ لکھنے کے معاملہ میں میں صفر ہوں"

خیر یہ تو آپ کی کسرِ نفسی ہے اچھا اس پر بعد میں بات کریں گے۔ بہرحال اس معاملہ میں آپ ہمیں مشورہ تو دے سکتے ہیں۔"

"ہاں اس کے لیے حاضر ہوں۔ پتہ نہیں میرا مشورہ آپ کے کام آسکے گا یا نہیں۔"

"یہ آپ ہم پر چھوڑ دیجیے بس آپ ہمارے مشیر بن جائیے اور اس مقصد کو پیش رکھتے ہوئے کوئی منصوبہ بنا دیجیے اور میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا پوری خدمت کروں گا۔"

میں نے وعدہ کیا اور چلا آیا۔ مگر ہوا یہ کہ اسی دوران میں تعمیر کا بکھیڑا شروع ہو گیا اور مکان کی تعمیر تو ویسے ہی آدمی کی مت مار دیتی ہے سو وعدہ پورا کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ صدیقی صاحب کا ایک دو مرتبہ پیغام بھی آیا۔ مگر میں مکان کے جھمیلے میں ایسا پھنسا ہوا تھا کہ ان کے پاس جا ہی نہیں سکا۔

میں نے سوچا کہ صدیقی صاحب سے چل کر بات کرتے ہیں ادب اور فنونِ لطیفہ کے ذیل میں کیا کچھ پیش کرنا چاہیے اور کس طرح پیش کرنا چاہیے اس پر بہت سوچ بچار کر کے میں صدیقی صاحب کے پاس پہنچا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے بہت تپاک سے ملے جب میں نے انہیں ان کا منصوبہ یاد دلایا تو افسردہ ہو کر بولے کہ "اخلاق صاحب آپ کے پیچھے ہم اتنا دوڑے اور آپ ہاتھ نہیں آئے اب

تو وہ ویسا ہی لگ گیا۔"

"کیوں کیا ہوا۔ پاکستان کو اب اپنے پروجیکشن کی ضرورت نہیں رہی۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے اصل میں مارشل لا نے تو سارے بزنس ہی کو ٹھپ کر دیا۔ اور پری سنسر شپ نے تو ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کوئی معقول کتاب چھاپی ہی نہیں جا سکتی۔"

دلیل دل کو لگنے والی تھی۔ میں قائل ہو گیا۔ خیر دیر تک ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے گذرے ہوئے اچھے زمانے کی باتیں کر کے اپنے آپ کو تسکین دیتے رہے باتیں کرتے کرتے صدیقی صاحب بولے "اخلاق صاحب ایک پروجیکٹ ہے اس میں آپ ہمیں کچھ مشورہ دیجیئے۔"

"کیا ؟"

"اسلامی بنکاری پر ایک کتاب لکھوانی ہے اس کے لیے کوئی آدمی تجویز کیجیے۔"

"صدیقی صاحب اس کے لیے تو کسی ماہر اقتصادیات سے رجوع کیجیے۔"

"معاف کیجیئے میں نے انہیں ٹوہ کے دیکھ لیا ہے اسلام کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے۔" تھوڑا رک کر "اخلاق صاحب آپ اس موضوع پر لکھیں تو کیا رہے۔"

"میں ؟" اس تجویز پہ میں حیران رہ گیا "صدیقی صاحب اس موضوع پر تو میرا کوئی مطالعہ نہیں ہے۔"

"اخلاق صاحب ہمیں کوئی فاضلانہ مقالہ درکار نہیں ہے بس موٹی موٹی باتیں ہونی چاہییں۔"

میں نے بڑی مشکل سے اس پیش کش سے پیچھا چھڑایا۔

"اچھا خیر اس پروجیکٹ کو چھوڑتے ہیں ایک اور پروجیکٹ میرے ذہن میں ہے آپ فارسی تو ماشاءاللہ خوب جانتے ہیں مجھے یاد ہے آپ حافظ شیرازی کے

شعر بہت سنایا کرتے تھے ہم آپ کی فارسی دانی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔"

"اچھا خیال ہے لائیے آپ کے لیے ہم حافظ کا ایک انتخاب کیے دیتے ہیں۔"

"حافظ کا انتخاب" صدیقی صاحب سوچ میں پڑ گئے "نہیں اخلاق صاحب۔ حافظ کا زمانہ گذر گیا اب اسے کون پڑھتا ہے۔"

"صدیقی صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ حافظ تو سدا بہار ہے۔"

"ارے اخلاق صاحب۔ حافظ کو تو اب ایران میں بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ اس وقت تو ایسے شاعر کو پسند کیا جاتا ہے جس کے پاس دینے کے لیے پیغام ہو۔ گل و بلبل اور جام و سبو والی شاعری تو زوال کے زمانے کی یادگار ہے۔"

میں نے صدیقی صاحب کو حیرت سے دیکھا "صدیقی صاحب آپ بھی انقلابیوں والے روزمرہ میں باتیں کرنے لگے۔"

"لاحول ولاقوۃ - انقلابیوں پہ تو میں لعنت بھیجتا ہوں انہوں نے تو ملک کا بیڑا غرق کیا ہے ساری نئی نسل کو لادین بنا دیا۔ صاحب میں تو اسلامی انقلاب کا قائل ہوں۔ ہاں لیجیئے وہ بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔ ہمارے پاس ایران سے اسلامی انقلاب کے بارے میں بہت لٹریچر آیا رکھا ہے اسے سامنے رکھ کر اردو میں اسلامی انقلاب کے بارے میں ایک بہت اچھی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اخلاق صاحب آپ یہ کام کر سکتے ہیں اس میں اردو کی بھی خدمت ہے اور اسلام کی بھی۔"

"لو لو میں ؟ .... نہیں صدیقی صاحب میرے لیے یہ خدمت انجام دینا ذرا مشکل ہے۔"

"اچھا" صدیقی صاحب مایوس ہو گئے "آپ کی خوشی۔ پھر کوئی آدمی ہمیں بتائیے عالم فاضل آدمی کی ضرورت نہیں ہے بس فارسی کی شدھ بدھ رکھتا ہو میٹریل سارا ہم مہیا کریں گے اسے تو بس دائیں بائیں کرنا ہوگا۔"

"میں کتنی مشکلوں سے جان چھڑا کر وہاں سے واپس ہوا۔ گھر پہنچ کر دیر تک میں ڈھیر ہوا پڑا رہا۔ جیسے پتھر ڈھو کر آیا ہوں۔

"اخلاق کیا بات ہے بہت چپ چپ نظر آ رہے ہو۔"

"آج میں صدیقی صاحب کے پاس گیا تھا۔"

"ہاں ہاں وہ تو مجھے یاد ہی نہیں تھا۔ ان سے کوئی بات طے ہوئی؟"

"نہیں"

"نہیں؟ تم تو بڑے یقین سے کہہ رہے تھے کہ ان کے ساتھ معاملہ طے ہو جائے گا۔"

"پہلے جو انہوں نے بات کی تھی میں اس حساب سے سوچ رہا تھا۔"

"اب کیا ہو گیا۔"

"اب؟ .... اب یہ ہوا کہ زمانہ بہت آگے نکل گیا، میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں۔"

زبیدہ بجھ سی گئی۔ خاموشی سے اٹھی اور کچن میں چلی گئی۔ دیر بعد کچن سے نکلی تو پچھواڑے والی دیوار کی طرف چلی گئی۔ وہاں پڑی ہوئی دو اینٹوں پہ پنجے ٹکا کر ایڑیاں اٹھا کر دیر تک پچھواڑے کے منظر کا جائزہ لیتی رہی۔ زبیدہ کا اب یہ طور بن گیا تھا کہ دن میں ایک دفعہ ضرور جب بھی اسے گھر کے کاموں سے فراغت ہوتی یا جب بھی گھر کے کاموں سے بور ہو جاتی اس طرف جاتی اور پچھواڑے کا مشاہدہ کرنے لگتی۔ گھر کی چار دیواری میں بند عورتوں کو باہر جھانکنے کا کتنا شوق ہوتا ہے باہر کھلنے والی کوئی کھڑکی یا ایسی دیوار جہاں سے باہر جھانکا جا سکے ان کا مرجع بن جاتی ہے۔ کس شوق کے ساتھ وہ وہاں سے باہر کا نظارہ کرتی ہیں یہ ان کی آؤٹنگ ہوتی ہے باہر دیکھنے کے لیے بیشک کچھ نہ ہو لیکن نظر کو منظر کی یکسانیت سے تو نجات ملتی ہے

چار دیواری کی تنگی سے نکل کر ایک کشادہ فضا میں نظر کو سفر کا موقع میسر آتا ہے نظر کے ساتھ ذات بھی ایک وسیع تر دنیا میں سانس لیتی محسوس ہوتی ہے اتنا تو تھا ہی مگر زبیدہ کے لیے اس منظر میں شاید اس سے زیادہ معنی تھے مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس واقعہ کے بعد سے پچھواڑہ زبیدہ کے لیے زیادہ پُر معنی زیادہ پراسرار بنتا چلا جا رہا ہے۔

بوجان نے برآمدے میں اپنی چوکی پہ بیٹھے بیٹھے کتنی مرتبہ بے چینی کے ساتھ زبیدہ کو دیکھا۔ آخر ضبط نہ ہوا۔ پکاریں "دلہن بس بھی کرو۔ آجاؤ۔" زبیدہ ادھر سے واپس ہوئی اور بوجان کے پاس آ بیٹھی۔

"دلہن یہ جو تم وقت بے وقت ادھر جا کھڑی ہوتی ہو یہ بات ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ مت جھانکا کرو ادھر۔ مجھے شک آ دے ہے۔"

"بوجان اس روز کے بعد سے تو ادھر ایسا سناٹا ہوا ہے کہ نہ کوئی آدمی نظر آتا ہے نہ کوئی آواز سنائی دیتی ہیں۔"

"رات کو تو بہت آوازیں سنائی دیتی ہیں کمبخت چوکی والا آدھی رات سے جو آوازیں لگانی شروع کرتا ہے تو فجر تک لگاتا ہی رہتا ہے۔"

"مگر دن میں جانے سب کہاں دفن ہو جاتے ہیں۔ ہو کا عالم ہوتا ہے پھاٹک بھی بند پڑا رہتا ہے میں تو جانوں اس روز کے بعد سے کھلا ہی نہیں جیسے اب اندر کوئی ہے ہی نہیں۔"

بوجان نے لمبا ٹھنڈا سانس لیا "جانے کس ماں کے لال تھے۔ تینوں جوان تھے بچارے۔"

"بچارے تو وہ نہیں تھے۔"

"دلہن ہمیں کیا پتہ کہ وہ کون تھے کیا کیا تھا انہوں نے۔"

"بوجان آخر کچھ تو انہوں نے کیا ہوگا کہ.......،، آگے کچھ کہتے کہتے زبیدہ جھجک گئی۔

"ہاں کچھ تو کیا ہوگا،، بوجان چپ ہوئیں پھر سوچتے ہوئے بولیں "پتہ نہیں کمبختوں کے دماغ میں کیا کیڑا کلبلا یا تھا یا آنکھوں پر پردے پڑ گئے تھے" بوجان چپ ہو گئیں۔

زبیدہ بھی جواب میں کچھ نہیں بولی۔ کتنی دیر بوجان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہی مگر چپ۔

۶

تھکا ہارا میں دفتر سے آیا ہی تھا کہ زبیدہ نے ایک لمبا سا لفافہ ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"کیا ہے یہ؟"

"پڑھ لو"

میں نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا کہ کہاں سے آیا۔ ہاؤسنگ فنانس کارپوریشن کی طرف سے تھا" اچھا، اچھا۔ قسط کا تقاضا کیا ہوگا۔ ٹھیک ہے۔ اب ہمیں انہیں باقاعدگی سے ادائیگی شروع کرنی چاہیئے"

"تقاضا نہیں نوٹس ہے" زبیدہ نے جلے کٹے لہجہ میں کہا "کچھ لبنت کی خبر ہے۔ وہ ہمارا گھر نیلام کرنے لگے ہیں"

میں نے یہ سنتے ہوئے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ جلدی جلدی پڑھا۔ واقعی وہ تو نوٹس تھا اور نوٹس بھی ایسا ویسا نہیں۔ خبردار کیا گیا تھا کہ پچھلی ساری قسطیں معہ سود پندرہ دن کے اندر اندر ادا کر دی جائیں۔ بصورتِ دیگر محکمہ مکان کو نیلام کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ میں پریشان ہوا کہ پندرہ دن کے اندر اندر اتنی لمبی رقم کا انتظام کہاں سے کروں گا۔ کیسے کروں گا۔ مگر چہرے سے میں نے اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔ کچھ ایسا تاثر دینے کی کوشش کی جیسے یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ قدرے بے اعتنائی سے کہا۔

"اچھا دیکھتے ہیں۔"

زبیدہ کو ایسے خشک ردِ عمل کی بالکل توقع نہیں تھی۔

"غور سے پڑھا بھی ہے۔ بے پروائی سے کہہ دیا کہ دیکھتے ہیں۔ کیا دیکھو گے۔ اتنی لمبی رقم کا انتظام پندرہ دن میں کہاں سے ہو جائے گا۔ میں پہلے ہی کہتی تھی کہ دیکھو قسطیں مہینے کے مہینے ادا کرتے رہو نہیں تو بہت سود چڑھ جائے گا۔ مگر تم نے میری ایک نہ سنی۔"

"زبیدہ تمہیں پتہ ہے کہ مہینے پر کتنی قسطیں ادا کرنی پڑتی ہیں۔ جس قسط کو روکتا اسی کی طرف سے نوٹس آجاتا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی کی قسط تو رکنی ہی تھی۔"

"کیوں رکنی تھی۔"

"جہاں جہاں سے ہم نے مکان کے لئے قرض لیا تھا ان سب کی قسطیں باقاعدگی سے ادا کی جاتیں تو ہم کھاتے کیا۔ گھر کے خرچ کے لئے کوڑی نہیں بچنی تھی۔"

"نہ کھاتے فاقے کر لیتے۔"

اس پہ مجھے یاد آیا کہ جب مکان کی تعمیر کے دوران قرضے پہ قرضہ لیا جا رہا تھا اور اس پر میں نے فکر مندی کا اظہار کیا تھا تو زبیدہ نے اسی قسم کا اعلان بڑے اعتماد سے کیا تھا کہ اپنا گھر بن جانا چاہیے، سب قرضے ادا ہو جائیں گے، اپنا گھر ہو تو آدمی فاقے بھی کر سکتا ہے۔ نہیں کھائیں گے تر نوالہ، روکھی سوکھی کھا کے سب قرضے اتار دیں گے۔ مگر مکان بن جانے کے بعد زبیدہ نے اس اعلان کو کہاں یاد رکھا۔ گھر کے اخراجات اسی طرح جاری رہے بلکہ نئے مکان کی فرنشنگ کے چکر میں اخراجات کچھ بڑھ ہی گئے۔ اور میں قرضوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ہر قرضے کی شرط یہ تھی کہ قسط ماہانہ ادا کی جائے۔ میں پریشان کہ یا اللہ کونسی قسط ادا کروں کونسی ادا نہ کروں۔ جس قسط سے ذرا ہاتھ کھینچا اس قسط کے سلسلہ میں یاددہانی کا پروانہ موصول ہو گیا۔

اصل میں اپنے گھر کے ہنی مون کی مدت بہت مختصر رہی۔ ابتدا کے دن تو خوشی خوشی

گذر گئے۔ خوشی سی خوشی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ اپنے بنائے ہوئے گھر میں بسر کرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ کتنا اطمینان، کتنی آسودگی ہوتی ہے اپنی ڈالی ہوئی چھت تلے سونے جاگنے میں۔ مگر جب قسطوں کی ادائیگی کا مرحلہ آیا اور یاددہانیوں کے پروانے آنے شروع ہوئے تو پھر تصویر کا دوسرا رخ سامنے آیا۔ بوجان نے تو مجھے بس یہ تصویر دکھائی تھی کہ آدمی کا اپنا کونہ نہ ہو تو بے ٹھکانا رہتا ہے۔ ساری مزاحمت کے باوجود یہ خیال میرے اندر سرایت کر گیا۔ لگنے لگا کہ میں اسی باعث اکھڑا اکھڑا پھرتا ہوں کہ اپنا کوئی ٹھیا نہیں ہے۔ اگر اپنا مکان بنا لوں تو زندگی میں ایک جماؤ آجائے گا۔ مگر مکان بنانے کے تھوڑے ہی دن بعد کھلا کہ میں تو اور بکھر گیا ہوں۔ ہاؤسنگ فنانس کارپوریشن میں، بنکوں میں، اپنے دفتر کے اکاؤنٹ سیکشن میں — کہاں کہاں بکھرا پڑا ہوں۔ شاید یہ اس نئے زمانے کی زندگی کا خاصہ ہے کہ آدمی جتنا اطمینان کے لئے جتن کرتا ہے اتنا ہی اپنی پریشانیوں میں اضافہ کرتا ہے، آسائش کے جتنے اسباب مہیا کرتا ہے اتنا ہی بے آرامی کا سامان کرتا ہے جتنا زندگی میں ترتیب کا اہتمام کرتا ہے اتنا ہی بکھرتا چلا جاتا ہے اور اپنا مکان، یہ تو بور کے لڈو ہیں کہ کھائے تو پچھتائے نہ کھائے تو پچھتائے۔ بہرحال اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس پچھتاوے سے تو اپنی وہ حسرتِ تعمیر ہی اچھی تھی۔

"خیر اس وقت تو جی جلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" میں نے قصہ مختصر کرنے کی کوشش کی۔ "صبح دفتر نہیں جاؤں گا۔ اسی مار پہ نکلوں گا۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا۔"

"اگر تم ایسے ہی بندوبست کرنے والے ہوتے تو پہلے نہ کر لیتے۔ آج کہہ رہے ہو کہ کل کچھ کروں گا۔ کل کہو گے کہ پرسوں کروں گا۔ بس اسی آج کل میں میعاد گذر جائے گی اور وہ کمبختی مارے ہمارے گھر کی بولی لگانے کے لئے آن دھمکیں گے۔"

بوجان کہ اب تک خاموش بیٹھی تھیں تڑپ کر بولیں "خاک بھوبھل ان منہ جھلسوں

ے منہ میں آئے بڑے کہیں کے ہمارے گھر کی بولی لگانے والے۔

"اچھا صبح تو ہونے دو۔ کل دیکھیں گے۔" میں نے ایک مرتبہ پھر قصہ مختصر کرنے کی کوشش کی۔

"جب میں نے کہا تھا کہ ایک من چاول کا بندوبست کر دو، اچھے بُرے وقت کیلئے گھر میں پڑے رہیں گے تو اس وقت بھی تم نے یہی کہا تھا کہ اچھا کل کچھ کریں گے۔"

"ایک من چاول" بوجان بولیں۔ "ایک من چاول میں دلہن تم کتنے دن نکال لوگی شیطان کے کان بہرے، اگر دنگا فساد شروع ہوا تو جلدی تو نہیں نبٹ جائے گا۔

"ایک من چاول۔ اے دلہن خالی ایک من چاول سے کیا بنے گا۔ بازار تو سارے پٹ ہو جائیں گے۔ کوئی چیز نہیں ملے گی۔"

"بوجان آٹا تو بھرا رکھا ہے اور منگا کے رکھ لوں گی۔ دالیں بھی بھری رکھی ہیں۔"

"اری وہ تو مہینے کے خرچ کی ہوں گی۔ اس وقت گوشت تو ملے وِلے گا نہیں، دالوں پہ ہی گذارہ ہوگا۔

"سب دالیں منگا کے رکھ لو۔ نون مرچ، دھنیا، لہسن پیاز ہر چیز۔ وقت کا کوئی پتہ تھوڑا ہی ہے۔"

میں نے بوجان اور زبیدہ کی یہ گفتگو حیرت سے سنی۔ لگتا تھا کہ ساس بہو میں سنجیدگی سے کچھ بڑے مسائل پہ تبادلہ خیال ہوا ہے اور بعض انتظامی امور طے ہوتے ہیں اور یہ کہ مجھے اعتماد میں لینے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

"قصہ کیا ہے۔ کیا جنگ چھڑنے والی ہے؟"

"سن رہی ہو بوجان، تمہارے بیٹے کیا پوچھ رہے ہیں۔" زبیدہ کا لہجہ سخت طنزیہ تھا۔

"میرے لال، دنیا میں رہتے ہو تو دنیا کی خبر بھی رکھا کرو۔ تم تو باہر گھومنے

پھرنے والے ہو، تمہیں تو زیادہ پتہ ہونا چاہیے۔ ہم گھر میں بیٹھے اتنا کچھ سن رہے ہیں۔ نصیبن بوا بتا رہی تھی کہ دونوں طرف جھڑپیں تیز ہو رہی ہیں۔ وہ قتلام ہوگا کہ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔"

"اچھا!" بوجان کی باتوں سے میں محظوظ ہونے کے موڈ میں تھا۔

زبیدہ نے پھر نشتر چلایا۔ "بوجان اپنے بیٹے کا جواب سُن لیا۔ بھولے بن کر پوچھ رہے ہیں کہ اچھا۔ ان کی اُنہیں باتوں پہ تو میرا جی جلتا ہے۔"

"بیٹے، میرے چاند، تم کس مراق میں رہتے ہو۔ چاروں طرف شور مچا ہوا ہے۔ تمہیں کسی بات کی کوئی خبر ہی نہیں ہے۔"

"بس انہیں اتنا ہی پتہ ہوتا ہے جتنا کامریڈ انہیں بتا جاتا ہے۔"

"مگر بجنت مارے کامریڈ کو تو دنیا کی ہر بات کا پتہ ہوتا ہے۔ اسے اور کام ہی کیا ہے۔ جو روز جاتا گھر نہ بار۔ ٹک کے کہاں بیٹھے۔ جلے پاؤں کی بلی بنا گھومتا ہی رہتا ہے۔"

"جب ہی تو لوگ اس پہ اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں۔" زبیدہ کہنے لگی۔ "نصیبن بوا مجھ سے پوچھنے لگی کہ یہ آدمی تمہارے گھر کیوں آتا ہے۔ میں نے کہا کیوں بات ہے۔ کہنے لگی کہ یہ تو روس کا جاسوس ہے۔ بوجان یہ سُن کے ایک دفعہ تو میں سناٹے میں آگئی۔"

"اجی کوئی روس کا جاسوس ہے تو ہوا کرے، ہمیں کیا ہم کونسا روس کے خلاف مسکوٹیں کرتے ہیں۔ پھر بھی اگر کوئی لگائی بجھائی کرتا ہے تو کرے، ہماری جوتی سے روس سے، ہمارا کونسا لینا دینا ہے۔ جو وہ ہمیں دیتا ہو وہ نہ دے۔"

میں نے دیکھا کہ بات قسطوں کی ادائیگی کے مسئلہ سے چل کر روس پہ پہنچ گئی ہے۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا۔ اب زبیدہ کی طرف سے کسی نشتر کا اندیشہ نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر کی بات کر کے قصہ مختصر کیا اور بوجان کو احساس دلایا کہ ان کے دعا پڑھنے

اور سونے کا وقت آن پہنچا ہے۔ بوجان فوراً ہی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ادھر میں نے بھی اعلان کر دیا کہ بہت تھکا ہوا ہوں، بس سونا چاہتا ہوں۔

زبیدہ نے صبح ہی جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا۔ وہ دن تو اب گزر گئے تھے جب اس گھر میں تڑکے سے میری آنکھ کھل جاتی تھی اور پھر میں اس گھر میں چڑھنے والی تازہ تازہ صبح کا لطف اُٹھاتا تھا۔ دیر سے اُٹھنے کا معمول واپس آ گیا تھا۔ وہی پرانا دستور کہ زبیدہ نے جھنجھوڑا "اجی آج تمہیں دفتر جانا نہیں ہے؟" خیر یہ جملہ تو بہت پرانا ہو گیا تھا۔ نئے گھر میں آ کر جگانے کے کچھ نئے بہانے پیدا ہو گئے تھے "کچھ یاد ہے آج آپ کو قسط جمع کرنی ہے؟"

"اُٹھئے نا۔ آج بنک بھی جانا ہے۔ پراپرٹی ٹیکس جمع کرانے کی آج آخری تاریخ ہے۔" ویسے آج زبیدہ نے اس قسم کا کوئی نوٹس نہیں دیا۔ بس جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا۔ شاید مزاج کی درہمی کسی قدر ابھی باقی تھی۔

میں اُٹھ کر باتھ روم گیا۔ نہایا دھویا۔ برآمدے میں آ بیٹھا۔ فوراً ہی سامنے ناشتہ آ گیا۔ ناشتہ کے آتے ہی صبح کے مہمان بھی ایک ایک کر کے آن موجود ہوئے اور مجھے لگا کہ جیسے میں نئے سرے سے اکٹھا ہو رہا ہوں۔ رات تو زبیدہ کی باتیں سُن کر بالکل ہی بکھر گیا تھا۔ ایک مجذوب کے متعلق سن رکھا تھا کہ رات کو سوتے وقت ان کے اعضا بکھر جاتے تھے، صبح ہونے پر اعضا یکجا ہوتے اور بزرگ صحیح و سالم اُٹھ کھڑے ہوتے۔ مگر میرے اعضا دن نکلنے کے ساتھ بکھرنے شروع ہوتے۔ بس ادھر گھر سے قدم نکالا اور اعضا بکھرنے شروع ہوئے۔

ہاں تو میں اپنے صبح کے مہمانوں کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ بھی بتانا پڑے گا کہ ان مہمانوں کی آمد کی تقریب کیسے پیدا ہوئی۔ برآمدے کے سامنے اپنے مختصر سے سبزہ زار میں جو ہارسنگھار لگایا تھا وہ اب اچھا خاصا بڑا ہو گیا تھا۔ اس کے قریب انار۔ انار کے قریب

لگرونده۔ یہ چراغ حویلی کی طرح کوئی لمبے چوڑے احاطہ والا گھر تو تھا نہیں کہ نیم اور املی جیسے اونچے پیڑ لگائے جا سکتے۔ یہاں تو چھوٹے قد اور کم پھیلنے والے درخت ہی لگائے جا سکتے تھے۔ سو ہارسنگھار، انار، لگرونده۔ ساتھ میں چند پودے اور بیلیں۔ یہی بیلا، چنبیلی، موتیا، گلاب ان میں کسی کی بیل کسی کا پودا۔

اِن پیڑ پودوں کی وجہ سے اپنا یہ چھوٹا سا گھر جلد ہی شاد آباد ہو گیا۔ کیا کیا مہمان یہاں آ کر اُترا تھا۔ یہ جو خاکستری رنگ کی چڑیاں ہوتی ہیں ان کا کیا ہے جہاں نام کو بھی دانا دُنکا دیکھا، آن اکٹھی ہوئیں۔ ہر گھر میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لیتی ہیں۔ کڑیوں والے مکانوں میں انہیں اپنے گھر بنانے کی زیادہ سہولتیں حاصل تھیں۔ ذرا کڑی جھکی اور انہوں نے چار تنکے چن کر اپنا گھونسلہ بنا لیا۔ چھتیں کڑیوں سے بے نیاز ہوئیں تو پھر ان کی ساری توجہ روشندانوں پر ہو گئی۔ گھر میں جب گھونسلہ بنا لیا تو پھر گھر کے کھانے پینے میں بھی برابر کی شریک ہو گئیں۔ خیر ابھی اپنے گھر کا کوئی گوشہ ان کے گھونسلوں کی زد میں نہیں تھا۔ مگر صبح کے ناشتہ میں شریک ہونا ان کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ شاید بن چکی تھی۔ سیدھی وجہ یہ تھی کہ جب سے میں یہاں منتقل ہوا تھا، کمرے میں بند ہو کر ناشتہ کرنے کا طریقہ میں نے ترک کر دیا تھا۔

برآمدے میں بیٹھ کر ناشتہ کرتا تھا۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں چلا کہ اس نیک رسم کا آغاز کیسے ہوا۔ بس مجھے رفتہ رفتہ اس کا احساس ہوا کہ جب میں صبح ہی صبح برآمدے میں بیٹھ کر ناشتہ کرتا ہوں تو آس پاس کچھ چڑیاں بے چین بے چین سی نظر آتی ہیں۔ کوئی کوئی بے تاب ہو کر میز پر آن بیٹھتی ہے اور پلیٹ میں رکھے توس کو ندیدے دیدوں سے دیکھتی ہے۔ یہ دیکھ میں نے کھلے دل سے ان چڑیوں کا خیر مقدم کیا اور اپنے ناشتہ میں انہیں مستقل شریک بنا لیا۔ توس کے کنارے ریزہ ریزہ کر کے ڈال دیتا۔ وہ بڑے شوق سے اِن ریزوں کو چگتیں اور دم بھر میں چٹ کر جاتیں۔ اس

روز روز کی خاطر داری سے ان کی بے تکلفی اتنی بڑھ گئی کہ کوئی کوئی اُڑ کر ناشتہ کی میز پر آن بیٹھتی۔ تھوڑی دیر دور دور پھدکتی۔ پھر ایک دم سے قریب آ کر میرے سامنے رکھے توس پر چونچ مارتی۔ چڑیوں کی اس بے تکلفی پر اعتراض نہیں۔ اعتراض اس بات پہ ہے کہ اتنے قرب اتنی بے تکلفی کے بعد بھی چڑیاں آدمی پر اعتبار نہیں کرتیں۔ بہت وہمی اور شکی ہوتی ہیں۔ اعتبار کر کے بھی اعتبار نہیں کرتیں۔ ذرا کھٹکا ہوا اور پھر اکھا کر اُڑ گئیں۔ کوے کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ تو سرے سے اعتبار کرنا ہی نہیں۔ مریضانہ حد تک شکی۔ ہر وقت کان کھڑے رکھنا سمجھتا ہے کہ ساری دنیا اس کے درپئے آزار ہے۔ روٹی کا ٹکڑا ڈالو، فوراً آئے گا۔ مگر ٹکڑا ڈالنے والے پر اعتبار کر لے یہ نہیں ہو سکتا۔ تو کوے نے تو اعتبار کرنا سیکھا ہی نہیں۔ اس لئے اس کی کسی حرکت سے صدمہ بھی نہیں ہوتا۔ مگر چڑیاں تو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ انہیں آپ پر بہت اعتبار ہے اور پھر اچانک کسی ذرا سی بے معنی سی بات پر اپنی بے اعتباری کا اعلان کر دیتی ہیں۔ میں سمجھتا رہا کہ میں نے ان کا بہت اعتبار حاصل کر لیا ہے۔ مگر کبھی زور سے کھانس دیا یا چھینک آ گئی تو آن کی آن میں انہوں نے سارے آپس کے اعتبار کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ پھر اکھا کر یہ جا وہ جا۔ چاہے وہ اس کے بعد فوراً ہی واپس آ جاتیں مگر ایک مرتبہ تو ظاہر کر ہی دیا کہ انہوں نے مجھ پہ کچھ زیادہ اعتبار نہیں کیا تھا۔

خیر چڑیاں اعتبار کریں یا نہ کریں۔ مگر تکلف نہیں کرتیں۔ کھانے پینے کے معاملہ میں بہت ہی بے تکلف واقع ہوئی ہیں۔ تو صبح کے ناشتہ پر وہ بہت بے تکلفی سے میرے قریب آ جاتیں۔۔۔۔ مگر بلبل کے یہاں تکلف بہت ہے۔ میں توس کے کنارے ریزہ ریزہ کر کے قریب ہی ڈال دیتا۔ چڑیاں بے تکلف اُتر آتیں اور چگ لیتیں۔ ایک دن دیکھا کہ ایک بلبل آس پاس منڈلا رہی ہے۔ قریب آنے سے جھجکتی ہے۔ میں نے اس کی جھجک کا احترام کرتے ہوئے توس کے تھوڑے ریزے سامنے والے

ہارسنگھار تلے بکھیر دیئے اور خود واپس آ کر برآمدے میں اپنی جگہ آن بیٹھا۔ بلبل کسی قدر تامل کے بعد انار کی شاخ سے اُڑ کر ہارسنگھار پہ آئی۔ پھر جھجکتی جھجکتی شاخ سے اُتر اور ایک ریزہ چونچ میں داب پھرتی سے اُڑ پھر شاخ پہ جا بیٹھی۔ پھر اُس نے مجھ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ میری حرکات و سکنات کا جائزہ لیا۔ پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد پھر شاخ سے اُتری۔ پھر ایک ریزہ چونچ میں دابا اور پھر اسی پھرتی سے شاخ پہ جا بیٹھی۔ خیر یہ تکلف پہلے دن رہا۔ کسی قدر دوسرے دن۔ تیسرے دن اس نے شاخ سے اُتر کر اطمینان سے ریزے چن چن کر کھائے۔ چوتھے دن وہ اکیلی نہیں آئی۔ نر مادہ ساتھ آئے اور پھر وہ اس دسترخوان پہ چڑیوں کے مستقل شریک ہو گئے۔ بلبلوں کی شرکت نے ہارسنگھار کی چھاؤں میں بچھنے والے اس دسترخوان کو چار چاند لگا دیئے۔

چند دنوں بعد دیکھا کہ دو گڑسلیں بھی بر وقت آن اُترتی ہیں اور چڑیوں بلبلوں کی شریک بن جاتی ہیں۔ ان کی شرکت بھی بھلی لگی۔ لیکن جب ایک کوے نے یہاں آ کر اس سبھا میں کھنڈت ڈالی اور ان کے رزق پر ہاتھ صاف کیا تو مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اور وہ تو ان ریزوں پر اتنا ٹوٹ کر گرتا تھا اور اتنا جارحانہ رویہ اختیار کرتا تھا کہ چڑیا بلبلیں گڑسلیں سب تھوڑی دیر کے لئے کنارہ کش ہو جاتی تھیں۔ کتنی مرتبہ میں نے اسے اُڑانے کی کوشش کی، دھتکارا، شی شی کیا، مگر کوا تو بہت ڈھیٹ ہوتا ہے۔ مگر پھر مجھے خیال آیا کہ کوے کے خلاف میرے یہاں اتنا تعصب کیوں ہے۔ آخر یہ بھی تو پرندہ ہے اور وہ پرندہ ہے جسے گیتوں کی برہن کاگا کہہ کر پکارتی ہے۔ نام سے بھی کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ کاگا کا نام دھیان میں آتے ہی اس کے ساتھ میرا سلوک بدل گیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میرے دماغ میں زاغ و زغن پھنسے ہوئے تھے۔ اس واسطے سے کوے کے خلاف یہ تعصب تھا۔

پرندوں کی اس سبھا میں ایک غیر جنس بھی شامل ہو گئی۔ ہارسنگھار کی چھاؤں میں چگتے چگتے چڑیوں بلبلوں گڑسلوں نے محسوس کیا کہ بیچ ان کے ایک گلہری بھی آن گھسی ہے جو ان کے کھانے دانے میں حصہ بٹا رہی ہے۔ اس سے اس سبھا میں تھوڑی بدمزگی پیدا ہوئی۔ مگر گلہری نے پرندوں کے ردِ عمل پر دھیان نہیں دیا۔ اسے اپنے کام سے کام تھا۔ پنجوں میں توس کا ریزہ لے کر منہ میں رکھتی جیسے آدمی نوالہ توڑ کر منہ میں رکھتا ہے۔ آخر چڑیوں نے بھی اپنے رویے میں نرمی پیدا کی اور گلہری کے ساتھ افہام و تفہیم کر لی۔

خیر تو میں روز صبح کو ناشتہ کرتے کرتے توس کے کنارے الگ کر کے ریزہ ریزہ کرتا، ہارسنگھار تلے انہیں بکھیر دیتا۔ چڑیاں تو پہلے سے منتظر ہوتیں۔ اِدھر ریزے بکھرے گئے اِدھر وہ مختلف گوشوں سے اُڑ کر آئیں اور چگنے لگیں۔ بلبلیں عین وقت پر آتیں اور ان کی شریک بن جاتیں۔ گڑسلیں بھی ان کے آگے پیچھے آن پہنچتیں۔

ادھر گلہری منڈیر پر دوڑتی ہوئی آتی، تیزی سے نیچے اُترتی اور ناشتے میں شامل ہو جاتی۔ کوا کبھی آتا کبھی نہ آتا۔ جب آتا تو ٹوٹ کر گرتا، اناپ شناپ کھاتا اور فوراً ہی اُڑ جاتا۔

بس یہ وہ وقت ہوتا جب میں محسوس کرتا کہ میں اکٹھا ہو رہا ہوں۔ رنگارنگ مہمان اُترتے جاتے اور میرے بکھرے ریزے اکٹھے ہوتے جاتے، دیکھتے دیکھتے میں سارا اکٹھا ہو جاتا۔ لگتا کہ اب میں پورا ہوں، بالکل سالم۔

"کس مراق میں بیٹھے ہو۔ آج دفتر جانا نہیں ہے؟" زبیدہ کی آواز۔ اس کے ساتھ ہی جیسے میں پھر بکھرنے لگا ہوں۔

"یاد ہے آج ہاؤسنگ والوں کی قسط بھی جمع کرانی ہے؟"

"وہ بھی یاد ہے۔"

یاد تو تھا۔ مگر ہارسنگھار نے جو پکڑ رکھا تھا۔ چڑیاں تو چگ کر اُڑ گئی تھیں۔ مگر ہارسنگھار نے میرا رستہ روک رکھا تھا۔ ان دنوں اس کا موسم تھا۔ گرمیاں جا چکی تھیں۔ اب تو بس دوپہر کی دھوپ میں بچی کچھی چٹکی بھر گرمی رہ گئی تھی۔ مگر وہ تو دوپہر کا قصہ تھا۔ شامیں اور صبحیں تو خنک ہو چکی تھیں۔ اس خنکی کے ساتھ ہارسنگھار کے مہکنے کا موسم شروع ہو گیا۔ شام کے ساتھ پھولنا شروع ہوتا۔ تاریکی میں رات کے ساتھ دمبدم پھولتا چلا جاتا۔ صبح کے دھندلکے میں کتنا ہنستا مہکتا دکھائی دیتا۔ چھاؤں میں اس کی آدھا سفید آدھا زعفرانی بستر بچھا نظر آتا۔ دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے پھولوں کا گرنا اور بستر کا دبیز ہوتے چلے جانا

ہارسنگھار کی مہک میں یہ اور کونسی مہک آن شامل ہوئی کہ میں مہکنے لگا۔ اچھا وہ۔ میں یاد کر کے کتنا حیران ہوا۔ میں یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ مہک میری زندگی سے نکل گئی، کہیں کھو گئی۔ ارے لو وہ تو میرے اندر ہی کہیں گم ہوئی تھی۔ ہارسنگھار کی مہک اسے اندر سے باہر کھینچ لائی۔ پھولوں کے ساتھ یہی تو پریشانی ہے۔ آدمی کو شگفتہ کرنے کے ساتھ ساتھ اداس بھی کرتے ہیں کہ ان کی خوشبو ماضی کی دور دراز گلیوں سے حافظہ کی کسی عقبی کوٹھری سے، کہاں کہاں سے کھوئی ہوئی خوشبوؤں کو کھینچ کر لے آتی ہے۔ مجھے یاد آیا اور میں حیران ہوا کہ اچھا وہ میں تھا، ایک خوشبو نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ پھر بے یقینی کی ایک لہر کہیں سے اُمنڈ آئی نہیں، میں تو یہ ہوں جو اب ہوں۔ وہ کوئی اور تھا۔ کتنی دیر میں اس لہر میں بہتا رہا۔ پھر ایک اور خیال آیا کہ اپنے سے ذرا ہٹ کر اس کو دیکھنا تو چاہیے جو شاید میں ہی تھا اور جیسے میں نہیں کوئی اور تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے ذرا اپنا صیغہ ہی تو بدلنا پڑے گا۔ پرانی کہانیوں میں تو آدمی اپنا قالب بدل لیتا تھا۔ تم اپنا صیغہ نہیں بدل سکتے۔ صیغۂ واحد متکلم سے صیغۂ واحد غائب میں منتقل ہونا آخر ایسا کونسا لمبا سفر ہے

ان دنوں عجب اس کا عالم تھا۔ اُٹھتے بیٹھتے اسی کا دھیان۔ اس نے اپنی لکھی ہوئی ایک رومانی کہانی اسے پڑھنے کے لئے بھجوائی۔ کہانی پڑھ کر وہ بہت سٹپٹائی۔ فوراً اُسے

فون کیا۔

"اخلاق، تم نے یہ کہانی مجھ پہ لکھی ہے؟" اس کے لہجہ میں تھوڑی برہمی تھی۔

وہ بہت سٹپٹایا۔ "تم پہ؟ نہیں تو۔"

"نہیں کیسے۔ مجھ پہ تو لکھی ہی ہے۔ تم نے میرے بارے میں کیسی کیسی باتیں لکھی ہیں؟"

"تمہارے بارے میں؟ کونسی باتیں ہیں تمہارے بارے میں؟"

"بہت بھولے بن رہے ہو۔ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ تم نے میرے بارے میں کیا کیا لکھا ہے؟"

"مگر یہ کہانی تو میں نے اس وقت لکھی تھی جب میں تمہیں جانتا ہی نہیں تھا اور اب بھی...."

بات کاٹتے ہوئے "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس پر وہ لاجواب ہو گیا۔

پھر اس نے واقعی اس کے بارے میں ایک کہانی لکھی۔ اسے پڑھنے کو بھجوائی۔ اس نے کہانی پڑھی اور فون کیا۔

"اخلاق، یہ کہانی تم نے کس لڑکی کے بارے میں لکھی ہے؟"

"تمہارے بارے میں۔"

"میرے بارے میں۔ کیوں مذاق کر رہے ہو۔ سچ بتاؤ۔ یہ کون لڑکی ہے؟"

"یہ تم ہو۔"

"میں؟ کسی کو بنانا تو تمہیں خوب آتا ہے۔ سچ سچ بتاؤ یہ ہے کون اور تمہارا اس سے ــــ اچھا خیر یہ میں نہیں پوچھتی۔ بس اتنا بتا دو کہ لڑکی کون ہے؟"

"میں کیسے تمہیں یقین دلاؤں کہ یہ تم ہو؟"

"میں کیسے تمہیں یقین دلاؤں کہ یہ تم ہو؟"

"یہ میں ہوں۔ چہ خوب۔ میں کہاں سے ہو گئی۔ تم نے تو ابھی مجھے دیکھا ہی نہیں ہے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس پر وہ لاجواب ہو گئی۔ ٹیلی فون بند کر دیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پھر فون کیا۔ بہت بے چین لگ رہی تھی۔ آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ کتنی بے چین ہے۔ "اچھا یہ بتاؤ اخلاق میرے بارے میں یہ باتیں تمہیں بتائیں کس نے؟"

"طوطے نے"

"طوطے نے؟" وہ چکرا گئی۔

"ہاں طوطے نے۔"

پوچھنا راجہ رتن سین کا ہیرامن طوطے سے اور بیان کرنا ہیرامن طوطے کا رتن سین سے کہ یہاں سے سات سمندر پار ایک نگر ہے سراندیپ۔ راجہ ہے اس کا گندھرپ سین۔ بیٹی ہے اس راجہ کی پدماوت، نازک پدمنی، گج گامنی، چندر مکھی، بال ساون کی گھٹا جیسے، گردن صراحی ایسی، سینہ ہری بھری کھیتی، پیٹ صندل کی تختی، کمر پتلی، کولہے بھاری اور سن کے عاشق ہو جانا رتن سین کا اور تڑپنا مچھلی کی طرح اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے۔

"یعنی کہ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"تم مجھے چلا تو نہیں رہے ہو؟" ممتاز نے شک بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"صحیح کہہ رہا ہوں۔ ابھی تک نہ ملاقات ہوئی ہے۔ نہ میں نے اسے دیکھا ہے۔"

"یعنی تمہیں پتہ نہیں کہ وہ ہے کیسی؟"

"جب دیکھا ہی نہیں ہے تو کیسے پتہ ہو سکتا ہے کہ وہ کیسی ہے؟"

"اچھا"، ممتاز تعجب میں پڑ گیا۔ "اخلاق، جب تم نے اُسے دیکھا ہی نہیں ہے تو
تو تمہیں اس سے عشق کیسے ہوگیا۔"

"یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"بکواس۔ یہ کوئی عشق وشق نہیں ہے۔"

وہ خود شک میں مبتلا تھا۔ ہاں واقعی، جب میں نے اسے دیکھا ہی نہیں ہے
اور کسی دیکھنے والے نے بھی کبھی نہیں بتایا کہ وہ کیسی ہے تو پھر مجھے عشق کہاں سے ہو
جائے گا۔ شاید یہ بس ایک خلش ہے، ایک یہ جاننے کی آرزو کہ وہ کیسی ہے۔

"خیر عشق تو یہ نہیں ہے۔ مگر میں یہ پوچھتا ہوں کہ جب تم نے اسے دیکھنا نہیں،
اس سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی تو وہ تمہارے چکر میں یا تم اس کے چکر میں آئے کیسے۔"

"یار، کوئی ایسی بات ہی نہیں تھی۔ میں دفتر اس روز ذرا دیر سے پہنچا۔ دیکھا
کہ میری میز پہ ایک نازک سا فاؤنٹین پین رکھا ہے۔ میں نے اپنے چپراسی سے پوچھا، رحمت
یہ فاؤنٹین پین کیسا ہے۔ صاب جی ایک بی بی آئی تھی۔ کہنے لگی کہ مجھے ایک ضروری
فون کرنا ہے۔ میں اسے یہاں پہ لے آیا کہ بی بی یہاں سے فون کر لو۔ وہ بی بی ٹیلی فون پہ باتیں
کرتے کرتے کچھ لکھ رہی تھی۔ پھر چلی گئی۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ وہ اپنا فاؤنٹین پین
چھوڑ گئی ہے۔ میں نے رحمت کی بات سن کر پین اپنی دراز میں رکھ لیا کہ آئے گی تو
اس کے حوالے کر دوں گا۔ دوسرے دن اس کا فون آگیا کہ جی میں آپ کی میز پہ اپنا
پین بھول آئی تھی۔ میں نے کہا کہ محفوظ ہے۔ بولی کل میں بارہ ساڑھے بارہ بجے آ کر
لے جاؤں گی۔ دوسرے دن ان اوقات میں میں نے اس کا انتظار کیا۔ آئی ہی نہیں
نہ خود آئی نہ فون کیا۔ اس کے دوسرے دن فون پہ معذرت کی کہ آ نہیں سکی۔ اس پہ
میں نے ایک فقرہ کہہ دیا۔ بس لائٹ موڈ میں کہا تھا۔"

"کیا فقرہ کہہ دیا۔ وہ بھی بتا دو۔"

"میں نے بس یوں ہی ایک فقرہ لگا دیا کہ دیکھئے آپ کا پین میرے لئے شہزادی
کی جوتی تو نہیں بن جائے گا۔ اس پہ وہ چکرائی، جی میں سمجھی نہیں۔ میں نے کہا مطلب
یہ ہے کہ جس طرح پرانی کہانیوں میں شہزادیاں شادی بیاہ سے واپس ہوتے ہوئے
ہڑبڑ میں اپنی ایک جوتی چھوڑ جایا کرتی تھیں اور پھر وہ جوتی بدنصیب شہزادے
کے گلے کا ہار بن جاتی تھی۔ اس طرح تو نہیں ہوگا۔ اس پہ وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسی
یار اس کا اس طرح کھلکھلا کر ہنسنا، بس میں تو فنا ہوگیا۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔ یار۔ کیا ہنسی تھی اس کی۔"

"پھر ہوا کیا؟"

"اس کے بعد پین کے لئے اس کا آنا تو ملتوی ہوتا چلا گیا۔ معذرت کا فون
آجاتا تھا۔ بس اس وقت سے یہ سلسلہ چلا ہوا ہے۔"

اس پر ممتاز جی کھول کر ہنسا "یار اخلاق، تم نے فقرہ غلط کہہ دیا۔"

"کیسے۔"

"تم نے اُسے شہزادی کا STATUS دے دیا۔ اب وہ تمہیں شہزادی بن کر
دکھا رہی ہے۔ پیارے بہت ستائے گی۔

"پھر کیا کیا جائے۔"

"اب تم اس کی اُلٹ بات کہو۔ اب کے فون آئے تو کہو کہ یہ پین شہزادی کی جوتی
نہیں ہے کہ میں اسے اپنے گلے کا ہار بنا لوں۔ آپ اسے لینے آ رہی ہیں۔ یا میں اپنی ٹائپسٹ
کو پریزنٹ کر دوں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

اُس نے کتنا مصمم ارادہ کیا تھا کہ اب کے وہ دو ٹوک لہجہ میں بات کرے گا۔ مگر

جب اس کا فون آیا تو بات کہیں سے چلی اور کہیں پہنچ گئی۔ کتنی باتیں ہوئی تھیں۔ اس روز اور فون پر اس روز آواز کتنی صاف آ رہی تھی۔ جیسے بالکل قریب بیٹھی باتیں کر رہی ہو۔ باتیں کرتے کرتے جب درمیان میں ایک ذرا وقفہ آتا تو اُسے اس کے سانس کی آواز تک سنائی دیتی۔ آواز دھیمی ہوتی گئی۔ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے کہ وہ اس کے گرم سانس کو اور اس کے بدن کی آنچ کو محسوس کر سکتا تھا۔ فون درمیان سے غائب ہی ہو گیا۔ کتنی دیر تک وہ سر جوڑے باتیں کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ کبھی اتنی آہستہ کہ بات سرگوشی بن جاتی۔

جب فون سے فارغ ہو کر وہ باہر نکلا تو دونوں وقت مل رہے تھے۔ ارے یہ تو شام ہو گئی۔ وہ حیران ہوا، اچھا آج اتنی لمبی بات ہوئی تھی۔ کمال ہو گیا۔ چلتے چلتے اس نے حیرت سے آسمان کی طرف دیکھا جہاں اب ستارے نکل آئے تھے۔ آسمان کتنا نیچے آگیا تھا اور ستاروں سے کتنا بھرا ہوا نظر آ رہا تھا اور آج ستارے بھی کتنے بڑے بڑے نظر آ رہے تھے اور کتنے قریب کہ بس وہ ذرا ہاتھ بڑھائے گا تو مٹھی میں بہت سے ستارے آ جائیں گے۔

”آج کیا دفتر سے چھٹی لے لی ہے۔ مگر قسط تو جمع کرائی ہے یا وہ بھی نہیں کرائی“

زبیدہ کی سرزنش بھری آواز اور اس کے ساتھ ہی ستارے غائب، واپس اپنے صیغہ میں۔ وہی صیغہ واحد متکلم کا قید خانہ جہاں سے نہ آسمان نظر آتا ہے۔ نہ ستارے دکھائی پڑتے ہیں۔ ان دنوں میں اندر سے کتنا بھرا بھرا محسوس کرتا تھا، جیسے میرے اندر بہت کچھ ہے، جیسے میں بہت کچھ ہوں۔ خالی میں نہیں، میں سے بڑھ کر بہت کچھ، ستاروں سے بھرے آسمان کی طرح میرے اندر سچ مچ ستارے بھرے ہوئے تھے۔ میں تھا کہ جھلملاتے ستاروں سے لدا پھندا آسمان تھا۔ اور اب، میں نے سوچا، میں اندر سے کتنا خالی ہوں، کتنا تتر بتر ہوں۔ اگر چڑیوں کی یہ سبھا نہ ہوتی اور ہار سنگھار کا یہ پیڑ نہ ہوتا تو میں تو بالکل ہی گیا تھا۔

زبیدہ سر پر آن کھڑی ہوتی تھی۔ کس بیزاری کے ساتھ ہار سنگھار اور چڑیوں کی بھری سبھا کو چھوڑ کر وہاں سے اُٹھا۔ بے دلی کے ساتھ کپڑے بدلے اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ باہر نکل کر کتنی رکشا والے کو رام کیا۔ رکشا کی سواری تو ویسے ہی آدمی کو توڑ کر رکھ دیتی ہے اور میں تو پہلے ہی سے ٹوٹا ہوا تھا۔

رکشا والا مال کی طرف دوڑتے دوڑتے پھر پلٹ پڑا۔ واپس ہوتے ہوئے ایک رکشا والے نے اس سے اشارے میں کچھ کہا تھا۔

”کیوں اب کیا ہوا؟“

”آگے رستہ بند ہے۔“

”ادھر سے بھی رستہ بند ہے؟“

”ہاں ادھر سے بھی بند ہے۔“ یہ کہتے کہتے اس نے رکشا کا رُخ موڑا اور پھر دوڑنا شروع کر دیا۔

”اب مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟“

”اے جی آفس کی طرف سے رستہ کھلا ہو گا۔ ادھر سے نکلتا ہوں۔“

اے جی آفس کے قریب پہنچ کر رکشا والا پھر ٹھٹھک گیا۔ ”ادھر سے بھی رستہ بند ہے جی۔ میرے یاروں نے پوری مال ہی کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔“

”یہ تو بڑی مشکل ہے۔“ میں بڑبڑایا۔ ”مجھے تو بنک میں ضروری کام ہے۔ میں ادھر اسی طرح بھٹکتا رہ جاؤں گا۔ ادھر بنک بند ہو جائے گا۔“

رکشا والے نے اچانک رکشا کو موڑا اور ایک گلی میں داخل ہو گیا۔

"بھئی یہ کہاں لئے جا رہے ہو مجھے"

"جی آپ کو بنک تو پہنچانا ہی ہے۔ یہ راستہ بنک کے قریب جا کے نکلے گا"

اس کے ساتھ ہی رکشا نے اچھلنا شروع کر دیا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ ہی اُچھل پڑتا۔

"بھائی رکشا والے مجھے تم بنک تو پہنچا دو گے۔ مگر پسلیوں سمیت پہنچاؤ تو اچھا ہو"

"بابو جی اللہ اچھا ہی کرے گا"

یہ رستہ میرے لئے بالکل نیا تھا اور میں حیران ہو رہا تھا کہ میں روز صبح شام مال آتا جاتا ہوں۔ مگر مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ مال کی طرف اتنے رستے جاتے ہیں۔ کتنے رستے آس پاس کی سڑکوں سے نکلتے ہیں اور مال کی طرف جاتے ہیں۔ مگر کیا فائدہ۔ کوئی ایک واقعہ کوئی ایک اندیشہ دفعتاً ان سارے رستوں کو مسدود کر سکتا ہے۔

گلی سے رکشا کے نکلتے نکلتے میں نے دیکھا کہ سامنے چند قدم کے فاصلے پر مال نظر آ رہی ہے اور اس کے پرلی طرف بنک دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر رکشا والے نے ایک دم سے بریک لگائے "باؤ جی یہ رستہ بھی بند ہے"

"کہاں بند ہے" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"باؤ غور سے تو دیکھو۔ سامنے سڑک پہ کانٹے دار تاروں سے رستہ رُکا ہوا ہے"

۷

عزیزو باتمیزو اسلاف کا ذکر کہاں تک کروں۔ خاندان کی عظمت کتنا بیان کروں کہ

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

سو ہاتھ کھینچتا ہوں اور رہوار قلم کو موڑ کر عرصۂ حال میں لاتا ہوں۔ خاندان کی عظمت و شوکت اب فسانہ ہے اسلاف کا دبدبہ طنطنہ قصۂ پارینہ ہے میں خاندان کی گمشدہ عظمتوں کا ماتم دار ہوں، اپنے وجود پر شرمسار ہوں بزرگ اچھے رہے کہ بھلے وقتوں میں گذر گئے۔ خاندان کے زوال کا منظر دیکھنے کے لیے ننگ اسلاف مشتاق علی رہ گیا۔

واضح ہو کہ فقیر نے آنریری مجسٹریٹی کو سلام کر لیا ہے کچہری میں حاضری دینے والوں کے تیور بدلے ہوئے تھے میرے فیصلوں پر نکتہ چینی کرتے تھے ہر پھر کر وہی ایک اعتراض کہ فیصلہ بر بنائے تعصب کیا گیا ہے مسلمان فریق کی پاسداری کی گئی ہے یہ رنگ دیکھ میں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ کلکٹر صاحب بہادر سے ضعیفی کا عذر کرکے اس عہدہ جلیلہ سے سبکدوشی حاصل کر لوں بس اب خالی خان بہادری رہ گئی ہے مسلمانانِ شہر ہنوز اس سے مرعوب ہیں سمجھتے ہیں کہ آفت آنے پر میری خان بہادری انہیں بچا لے گی بھلا جب فرنگی کے قدموں تلے کی زمین سرکی ہوئی ہے تو اس کے دیئے ہوئے خطابات کی کیا وقعت رہ گئی۔ مگر میں ان سے صاف صاف کچھ کہتا بھی نہیں۔ اگر ایک بے وقعت خطاب سے ان کی ڈھارس بندھی ہوئی ہے تو بندھی رہنے دو۔ سو دیکھتا ہوں، سنتا ہوں مگر لب پر کوئی بات نہیں لاتا ہوں میرا حال سوائے میرے خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ ایک

ایک پنڈت گنگادت مہجور تھے ان سے دل کا حال کہہ لیا کرتا تھا اور جی کی بھڑاس نکال لیا کرتا تھا وہ بھی سورگ میں جا براجے۔ ہائے پنڈت کیا ہیرا تھا کہ مٹی میں مل گیا اس کی کہی ایک بات مجھے ان دنوں رہ رہ کے یاد آتی ہے کہنے لگا کہ شری مشتاق علی، تمہیں پتہ ہے کہ انت میں شیرادیرورت غازی ارجن کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ پنڈت کیا ہوا تھا۔ مشتاق علی جی، جب حضرت سری کرشن کے وصال کے بعد ارجن مہاراج ان کی ازواج مطہرات کو لیکر دوارکا سے نکلے تو رستے میں بٹ ماروں نے ان پر ہلہ بول دیا مگر وہ کس بل والا اچانک اتنا نربل ہوگیا کہ دھنش کو کھینچتا ہے۔ تو دھنش نہیں کھنچتی۔ جس مرد جری نے بھارت ورش کے نامی گرامی سادنتوں' سورماؤں سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا تھا اسے بٹ ماروں نے پسپا کر دیا۔ اس مرد غیور نے اس کا بہت شوک کیا حضرت ویاس جی کے حضور میں پہنچ کر گریہ کیا اور استفسار کیا کہ رشی مہاراج میرا کس بل کہاں چلا گیا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا "میرے پتر' اے فرزند ارجمند یہ سب کال کا چکر ہے۔

یہ سن کر اس گنہگار نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ پنڈت تمہارے ویاس جی نے درست فرمایا۔ وقت بیشک زور آور ہے اس کے سامنے آدمی ناطاقت ہے۔ پنڈت سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر افسردہ ہو کر بولا "صحیح کہا، بالکل صحیح کہا۔ کال بلوان ہے ہم نربل ہیں۔" چپ ہوا۔ پھر بولا "مشتاق علی، ہمارا تمہارا سمے بیت گیا اب کشن لال کا زمانہ ہے۔"

میں نے کہا کہ پنڈت کوئی مجھے بتا رہا تھا کہ تمہارا کشن لال جن سنگھیوں کا لیڈر بن گیا ہے۔"

پنڈت نے جواب میں سر نیوڑھا لیا۔ شرمندگی سے بولا "مشتاق علی تم نے صحیح سنا۔ جب ہی تو اس عاصی پر معاصی نے یہ عرض کیا تھا کہ ہمارا سمے بیت گیا اب کشن لال کا زمانہ ہے باپ ڈھے رہا ہے۔ بیٹا زور پکڑ رہا ہے۔" پھر بڑبڑانے لگا۔ ڈھ۔

ڈوبا بنس کبیر کا جس ادبجیو پوت کمال

پنڈت مہجور واقعی ڈھے رہے تھے پھر ڈھیتے ہی چلے گئے۔ ایک دن بالکل ہی ڈھے گئے۔ ہائے پنڈت، تو کتنا طوطا چشم نکلا۔ دوست کو کیسے آشوب کے ایام میں چھوڑ کر گیا ہے دیکھ یہ ناتواں بھی اب ڈھینے لگا ہے بس اب گرا کہ اب گرا۔ مگر اس میں تسکین کا پہلو نہیں ہے

مہجور سے ملاقات تو مرنے کے بعد بھی نہیں ہوگی۔ ظالم تو نے میرا کہا مان لیا ہوتا اور ایک دفعہ کلمہ پڑھ لیا ہوتا تو حشر میں ملاقات کی توقع ہو سکتی تھی کہ تیرا میرا ایک ہی حشر ہوتا۔ اب کس بہانے یہ توقع کروں۔ آخر الامر مجھ گنہگار کو انہیں کے ساتھ اٹھایا جانا ہے جن میں سے میں ہوں۔ میرا حشر الگ، تیرا حشر الگ، خیر حشر کی حشر پر دیکھی جائے گی۔ مگر میرا حشر تو اس وقت بھی انہیں کے ساتھ ہوتا نظر آ رہا ہے جن میں سے میں ہوں۔

مہجور تو اگر زندہ بھی رہتا تو کیا اپنے رفیق دیرینہ کو اس حشر سے بچا لیتا۔

وائے ہوائے زمانے تجھ پر کہ تو نے رفاقت کے باغ میں نفاق کا بیج بو دیا۔ اور ہمسائے کو ہمسائے کا دشمن بنا دیا۔ مہجور کا نور نظر کشن لال کل تک مجھے تاؤ کہتا تھا اب مجھے دو پورے سلام کرنے کا روادار نہیں۔ مہجور کے سورگباشی ہونے کے بعد ایک مرتبہ البتہ میرے پاس آیا تھا مگر سر سے ایک بوجھ اتارنے، نہ کہ از راہ سعادت مندی۔ میں تو اسے دیکھ کر تصویر حیرت بن گیا۔ نہ آنکھ میں لحاظ نہ ادا میں پاس ادب۔ ایک پلندا میرے ہاتھ میں پکڑا دیا اور روکھے پھیکے انداز میں کہنے لگا کہ "پتا جی فارسی اکشروں میں جانے کیا لکھتے رہتے تھے میں تو ان کی لکھت پڑھ نہیں سکتا۔ یہ اکشر تاؤ جی آپ ہی لوگوں کے ہیں آپ ہی انہیں سنگھوائیں۔"

میں اس جوان عزیز کا منہ تکنے لگا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ مخطوطہ اس سے لے کر رکھ لیا۔ جب چلا گیا تو سوئے آسمان دیکھا مگر قسم پاک پروردگار کی کوئی شکوہ نہیں

کیا شکوہ کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا، آسمان بھڑے چال اس کی ٹیڑھی ہے شعرائے کرام
نے بلا وجہ بلا سبب تو اس کی مذمت نہیں کی تھی کچھ دیکھا تھا تب اسے فلک کج رفتار
اور چرخ فتنہ پرور کہہ کر دل کا غبار نکالا تھا اور گنبد واژگوں کہہ کر پکارا تھا۔

میں نے وہ مخطوطہ الٹ پلٹ کر دیکھا مہجور نے کیسی کڈھب زبان لکھی ہے
ہاں یہ ضرور ہے کہ بیچ بیچ میں کوئی جواہر ریزہ آگیا ہے جس سے بیان کی قیمت بڑھ
گئی ہے کوئی حکایتِ لذیذ کوئی داستانِ پارینہ، کوئی بصیرت افروز دوہا، کوئی حکیمانہ
قول۔ مہجور آنجہانی کو عارفانِ ہند قدیم کے اقوال ازبر ہیں ان کی دانش سے اس نے
بساط بھر استفادہ کیا ہے کاش اسے زبان پر بھی عبور حاصل ہوتا۔ شتر گربہ اس کی
تحریر میں جابجا ہے، بہر حال فقیر نے بر بنائے رفاقتِ دیرینہ سوچا کہ اس تذکرے کو بھی
اپنے مرتب تذکرے میں شامل کر لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے صحیح ہے کہ بیچ بیچ میں کلمات
کفر آگئے ہیں مگر نقلِ کفر کفر نباشد۔ سو بعد غور و تامل کے تذکرہ مہجور سے تھوڑا حصہ اپنے
یہاں نقل کر لیا۔

منقول از تذکرہ گنگا دت مہجور

آغاز کرتا ہوں نام سے رام کے اور رحیم کے کہ وہی ستیہ ہے اور وہی حق ہے
اور وہی سندر ہے اور اسی کی دیا اور کرم سے اس برہمانڈ میں اور اس عالم رنگ و بو
میں ساری چہل پہل ہے جو ستیہ ہے وہ حق ہے، جو حق ہے وہ سندر ہے "اللہ جمیل
و یحب الجمال"۔ حقیر فقیر گنگا دت مہجور حمد کرتا ہے اس پیدا کرنے والے کی جس نے گانے
کو پیدا کیا اور جس نے کوئل کو کوک اور مور کو جھنکار عطا کی۔ اور گانے کو ماتا کا درجہ
دیا، دنیز تھنوں میں اس کے دودھ اتارا، اسی پالن ہار کی دیا اور کرم ہے کہ اس عالم

رنگ و بو میں بھن بھن پرکار کے مختلف انواع و اقسام کے پشو پنچھی وحوش و طیور چہکتے ہوئے
چنگھاڑتے ہیں اور الوان و انواع کے گل بوٹے کھلے ہوئے ہیں اسی رنگا رنگی سے کائنات
کو رونق ہے اور جگ میں اجیارا ہے۔ پوترم، منگلم، پرم۔ وہ پاک ذات ہے، مبارک ہے
برتر و اعلیٰ ہے۔

سنو بھئی مترو اور عزیزو با تمیزو، ایک جگیش نے شہنشاہ والا صفات حضرت یدھشٹر
مہاراج سے کچھ ٹیڑھے میڑھے پرشن پوچھے تھے اور سوالات عجیب کئے تھے ایک سوال
یہ تھا کہ وہ کیا چیز ہے جو گھاس سے بھی زیادہ ہے اس رمز شناس راجہ نے جواب دیا کہ
وہ ہمارے وچار ہیں سو بھئی مترو، عزیزو، خیالوں وچاروں کی تنک سی گھاس میں نے
بھی اکٹھی کی ہے میں نے بھگوت گیتا کا پاٹھ کیا، قرآن مجید کی تلاوت کی و نیز بیدوں،
پرانوں شاستروں ملفوظاتوں حدیثوں میں تانک جھانک کی، مزید برآں مہاکوی شری
سعدی اور حضرت کبیر علیہ الرحمۃ کی حکایات و دوہاجات کا مطالعہ کیا۔ تب خیالوں
وچاروں کی یہ تھوڑی گھاس جمع ہوئی ہے سو پہلے ان گیان بھری پستکوں اور مقدس
کتابوں کو بندنا کرتا ہوں و نیز بوسہ دیتا ہوں۔ پھر عرض پرداز ہوتا ہوں اس جگ کو
نستارنے کے لیے اور بنی نوع انسان کی اصلاح کے لیے ایشور اللہ کی اور سے کتنے
سنت سادھو رشی منی اوتار پیر پیغمبر مصلح اپدیشک آئے اور منش جاتی کے بیچ راچے
اپدیش دیئے، سینہ پتھر بنایا، تبلیغ دین حق کی۔ مگر مرغے کی وہی ایک ٹانگ، بھول
چوک کا پتلا، آدم کا بیٹا جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ مثل مشہور ہے کہ کتے کی دم بارہ برس تک
دبا کے رکھی، مگر وہی ٹیڑھی کی ٹیڑھی نکلی۔

صاحبو، سجنو، ویسے تو یہ سنسار اپنے پالن ہار کی کرپا سے بہت سندر ہے پر ادھک
بھیانک بھی ہے ایک اور سے سندر دوسری اور سے بھیانک۔ ایک پرکار سے دیکھو تو
یہ جیون ایک نغمۂ شادی ہے، سکھ کی سیج ہے دوسرے زاویئے سے دیکھو تو یہ زندگی۔

دکھوں کی مالا ہے ذرا شادی و غم کے مقامات سے بلند ہو کر دیکھیں تو یہ عالم جگوں کا سلسلہ ہے برہمانڈ میں کال کا چکر چلا ہوا ہے ایک جگ جاتا ہے دوسرا جگ آتا ہے واضح ہو کہ جگ چار ہیں ست جگ، ترتیا جگ، دواپر جگ، کلجگ۔ جب ایک جگ کا انت ہوتا ہے تو محشر بپا ہوتا ہے صاحب العصر والزماں حضرت مارکنڈے رشی اس کے عینی شاہد ہیں کہ انہوں نے سنسار کو اسار دیکھا اور چار سو میں ہو کا عالم مشاہدہ کیا۔ آپ نے مشاہدہ کیا کہ بھومنڈل میں چاروں اور پانی ہی پانی ہے۔ جیو جنتو جاندار بے جان سب نابود ہو چکے ہیں۔ نہ نر ناری نہ پشو پنچھی نہ شجر حجر نہ برکش نہ ڈال پات۔ ہر شے نشٹ ہو چکی ہے حضرت مارکنڈے جی ورطۂ حیرت میں غرق کہ بھومنڈل کہاں گیا، کائنات کو زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا، اور خود زمین و آسمان دھرتی آکاش کہاں ہیں، میں کہاں ہوں اسی گھڑی دیکھا کہ بیچ پانی میں ایک برکش برگد کا کھڑا ہے برگد تلے سنگھاسن بچھا ہے سنگھاسن پہ ایک ہنستا مسکاتا بالک کھیلتا کلکاریاں مارتا ہے مارکنڈے جی اسے دیکھ کے موہت ہو گئے۔ سدھ بدھ بھول گئے، اسے تکتے جاویں بالک بولا کہ مہامنی تم ادھک تھک گئے ہو تنک میرے سنگ آرام کرو۔ یہ کہہ کے بالک نے منہ کھولا۔ مارکنڈے جی اس کے سانس کے ساتھ کھنچے چلے گئے اور پیٹ کے اندر اتر گئے۔ اس پیٹ میں تو ایک دنیا آباد تھی ہماوت پربت، گنگا ندی، دوارکا، اجودھیا، کاشی۔ مارکنڈے جی نے لمبی یاترا کی بھن بھن پرکار کے عالم دیکھے، دیس دیس کی خاک چھانی، پربتوں کی چڑھائی کی، سمندروں میں ہاتھ پیر مارے۔ پر عالم فانی کا اور چھور نہ ملا۔ مارکنڈے جی تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ پھر گڑگڑائے کہ ہے نارائن دیا کرو۔ دفعتاً باد نسیم چلی اور حضرت مارکنڈے نارائن کے منہ سے نکل پڑے۔ نارائن کے وشال پیٹ سے باہر آئے تو دیکھا کہ وہی برگد کا برکش ہے وہی سنگھاسن، وہی ہنستا مسکاتا بالک۔ اس نے مسکا کے مارکنڈے جی کو دیکھا بس اسی آن مارکنڈے جی کو نئی درشٹی مل گئی۔ کیا دیکھا کہ کائنات پھر سے ظہور کر رہی ہے انڈے

کے بیچ سے پرکاشت ہو رہی ہے پورتم، منگلم، پرم۔

ہے مترو اور ملے یارو، سوچو اور وچار کرو کہ اب دنیا پہ کونسا وقت آیا ہوا ہے سنسار میں ہاہاکار مچی ہے خلقت ترا ہ ترا ہ کر اٹھی۔ نگر خالی ہو رہے ہیں۔ کوچے اجڑ رہے ہیں انسانی رشتے بے وقعت ہو گئے نہ مترتا کا پاس نہ ہمسائیگی کا احساس۔ خون سفید ہو گئے ہیں۔ بھائی بھائی کا بیری۔ اولاد ماں باپ سے باغی مجھے دیکھو جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو، جیون بھر میں نے شانتی کا کلمہ پڑھا۔ ایک ہی اپدیش دیا کہ ہندو مسلم سکھ عیسائی سب آپس میں بھائی اور متر ہیں میرا بیٹا کشن لال الٹا وظیفہ پڑھتا ہے مثل تو یہ تھی کہ باپ پہ پوت پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے یہ سب کال کا چکر ہے اور وقت کی کرشمہ سازی ہے کتنے جگوں کا اسی پرکار خاتمہ بالخیر ہوا ہمارے جگ کا بھی دیکھ لینا اسی طور انت ہوگا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ بس ہونے کو ہے قرائن تو یہی کہتے ہیں مترو، یہ دنیا زمانوں کا مدفن ہے اور جگوں کا مرگھٹ ہے اور جہاں جگ جل رہے ہوں وہاں آدمی کے تن کی کیا بساط ہے میں اپنی ہڈیوں کی مالا لئے بیٹھا ہوں مگر کب تک اسے سنگھواؤں گا۔ آگ کی لپٹ آئے گی اور اسے بھسم کر دے گی جنم جنم سے یہی ہو رہا ہے کتنی بار جل چکا ہوں، کتنی بار اور جلنا ہے زمانہ آگ ہے اور ہم اس کا ایندھن ہیں۔

ہاڑ جلیں جیوں لاکڑی کیس جلیں جیوں گھاس
ایہہ تن جلتا دیکھ کے بھیو کبیرؔ اداس!

سنو، غور کا مقام ہے اور وچار کی جائے ہے لکھوکھا برس سے اس دھرتی پہ یہی ہو رہا ہے تو ایک جاتک اس مضمون کی اپنے انجہانی پتا سوم دت کی پوتھی سے نقل کرتا ہوں۔

دنیا شمشان بھومی ہے

بدھ دیوجی نے ایک دن بھکشوؤں سے یوں سمبودھ کیا کہ ہے بھکشوؤ! دھیان دھر کے سنو۔ اب سے لاکھ برس پہلے کی بات ہے کہ ایک سادھو نے ہمالہ پربت کی ایک اونچی چوٹی پہ دھونی رمائی تھی۔ ایک دن اس نے کیا دیکھا کہ اس سنسان چوٹی پہ دو جنے بھٹکتے پھرتے ہیں ایک بوڑھا کھوسٹ اور ایک جوان۔ سادھو نے اچرج کیا کہ اس اجاڑ جگہ پہ جنے کہاں سے آ گئے۔ انہیں بلا کر پوچھا کہ بچہ تم یاں پہ کیا لینے آئے ہو۔ جوان نے کہا کہ یہ بوڑھا میرا پتا ہے اس کی اچھا ہے کہ مرنے کے بعد اس کا کریا کرم ایسے استھان پہ ہو جہاں پہلے کسی کا کریا کرم نہ ہوا ہو۔ تو ہم ایسے استھان کے کھوج میں یاں پہ آئے ہیں۔

سادھو نے پوچھا کہ بچہ پھر تمہیں ایسا استھان ملا جوان نے اُتر دیا کہ ہاں مل گیا۔ سادھو ہنسا۔ کہا کہ بچہ وہ استھان ہمیں بھی تو دکھیو۔ جوان نے کہا کہ اوشیہ دیکھو اور وہ سادھو کو ایسی جگہ پہ لے گیا جو تین پہاڑیوں کے بیچ میں گھری ہوئی تھی لگتا تھا کہ یاں پہ کبھی کوئی مانو نہیں پدھارا ہے۔

سادھو اس استھان کو دیکھ کے ہنسا۔ بولا کہ مورکھ! تجھ سے پہلے بھی ایک شخص تشالی لیی یاترا کر کے پڑے جوکھم کے بعد یاں پہ آیا تھا باپ کی ارتھی اٹھا کے لایا تھا اسی استھان پہ اس نے یہ سوچ کے باپ کا کریا کرم کیا کہ اس الگ تھلگ جگہ پہ اس سے پہلے کون مانو آیا ہوگا اس مورکھ کو کب پتہ تھا کہ اس کے پتا نے چودہ ہزار جنم لیے تھے۔ اور چودہ ہزار بار اس کا کریا کرم اسی استھان پہ ہوا تھا۔

جوان یہ سن کے سٹپٹایا۔ بولا ’اچھا پھر میں دوسرا ایسا استھان کھوجوں گا جہاں پہلے کسی کا کریا کرم نہ ہوا ہو۔

سادھو پھر ہنسا اور بولا کہ ہے پتر اس وشال دھرتی پہ ایسا کوئی استھان نہیں ہے جہاں کوئی لاش نہ دبی ہو اور کسی مردے کی ہڈیاں نہ جلی ہوں ہے پتر یہ سنسار سارا شمشان بھومی ہے سو تو اپنے آپ کو مت تھکا۔ جہاں تیرا باپ پران چھوڑ دے وہیں پہ اس کا کریا کرم کر دے۔

بدھ دیوجی اتنا سن کر چپ ہو گئے پھر مسکائے اور بولے کہ ہے بھکشوؤ بوجھو کہ وہ سادھو کون تھا۔ ہے امی تابھ کون تھا وہ سادھو۔ ہے بھکشوؤ وہ سادھو میں تھا۔ بھکشوؤں نے یہ سن کے اچنبھا کیا۔ پوچھا کہ ہے تتھاگت اتنے سمے تم کہاں رہے بدھ دیوجی پھر مسکائے اور بولے کہ پھر میں نے بلی کا جنم لیا پر یہ جاتک میں تمہیں پھر کسی اور دن سناؤں گا۔

تو ہے سنتو اور ارے بھلے مانسو، یہ سنسار تو ہے ہی شمشان بھومی۔ پر ہم اگیانیوں کو اس کا شعور نہیں ہے یاں پہ موت کا دور دورہ ہے، جم دوت کا ڈیرہ ہے فرشتۂ اجل ہر دم ہر سمے ہمارے سروں پہ منڈلاتا رہتا ہے باقی رہی زندگی تو حضرت کبیر علیہ الرحمۃ نے کیسے گیان کی بات کہی ہے۔ کہ

کبیر بیڑا جھوجرا پھوٹے چھیک ہزار
ہوئے ہوئے تر گئے، ڈوبے جن پر بھار

تو سنتو ہم تو ٹوٹے جہاز پہ سوار ہیں جس میں ہزار چھید ہیں نشش کے جیون کا کیا اعتبار۔ جھوجرا بیڑا ہے کاچا سوت ہے تارِ نفس جانے کب ٹوٹ جائے۔ فرد کی کیا بساط ہے بھرے نگر حرفِ غلط کی مثال ہٹ جاتے ہیں ایک دن یہ بندۂ عاجز مشتاق علی کو بتانے لگا کہ دوارکا کیسے نشٹ ہوا۔ مشتاق علی نے ہمیشہ کی طرح اپنے جلے کٹے لہجہ میں کہا کہ پنڈت تمہارے سری کرشن مہاراج نے اپنے نگر کو نہیں بچایا۔

میں نے کہا کہ مشتاق علی انہیں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب نگر باسی پاپی نردوئی دراچاری فاسق وفاجر ہو جاتے ہیں تو پیر پیغمبر رشی اوتار کوئی اس نگر کو نہیں بچا سکتا۔ پر وہاں تو ایک نگر ڈوبا تھا یہاں نگر نگر آگ لگی ہے جانو کہ جوالا مکھی پھٹ پڑی ہے بس اسی پرکار سب کچھ جل جاوے گا۔ اور سنسار بھسم ہو جاوے گا۔ جو حضرت مارکنڈے رشی نے دیکھا تھا وہ ہمیں دیکھنا ہے پر مارکنڈے جی نے تو نیا سنسار آرمبھ ہوتے بھی دیکھا تھا۔ ہمارے یہ بھاگ کہاں۔ ہمارے نصیبے میں تو خالی تباہی دیکھنی لکھی ہے۔

حضرت مارکنڈے رشی بھی کیا پیر فقیر آدمی تھے نے غم دنیا نے غم کالا مست قلندر تھے۔ ہزاروں برس جئے مگر مجال ہے کہ ایک بال بھی سفید ہوا ہو۔ سدا پچیس برس کے شکستی شالی نظر آئے۔ پر بھیا عمر کا زیادہ ہونا بھی آدمی کو بہت دکھ دیتا ہے میرے بزرگوار پتا پنڈت سوم دت آنجہانی سورگباشی نے اس مضمون کی ایک حکایت اپنی پوتھی میں درج کی ہے اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

بھوساگر میں اکیلا مانو

پانڈوؤں نے ایک بار مارکنڈے رشی سے پرشن کیا کہ رشی مہاراج آپ سے زیادہ بھی کسی مانو نے عمر پائی ہے اُتر دیا کہ ہاں پائی ہے بھلا کس نے۔ اندر دمن رشی نے۔ مہاراج اندر دمن رشی نے کتنی عمر پائی۔ پتر وا انہوں نے اتنی عمر پائی جس کی ورشوں شتابدیوں میں گنتی نہیں ہو سکتی۔ مہاراج انہیں اتنی لمبی عمر کیسے مل گئی۔ پتر وا انہوں نے ایک بار لمبا جاپ کیا اس کا پھل انہوں نے یہ پایا کہ مانو لوک سے نکل کر دیو لوک میں جا براجے۔ ورشوں شتابدیوں کے چکر سے نکل کر سوتنتر ہو گئے پر ایک بار ان سے کچھ چوک ہو گئی۔ پھر اس دھرتی پہ ڈھکیل دیئے گئے۔ اندر دمن نے پہلے تو بہت شوک کیا پھر یہ وچار کر کے من کو بہلایا کہ ہوں تو میں اس دھرتی ہی کا باسی۔ اپنے دیس چلتا ہوں اور سنگھیوں ساتھیوں

سے ملتا ہوں۔ سو وہ گھومتے پھرتے اپنے نگر پہنچے اور اپنے سنگھیوں کو ڈھونڈنے لگے پر کسی سنگھی کا کھوج نہ پایا۔ سمے بہت بیت چکا تھا۔ سب سنگھی ساتھی مرکھپ چکے تھے۔ اندر دمن بہت دکھی ہوئے۔

بے پانڈوؤ اندر دمن یہ سوچ کے بہت دکھی ہوئے کہ اب کوئی انہیں پہچانتا بھی نہیں۔ اس کھوج میں کہ کوئی پہچاننے والا ملے وہ نگر نگر گھومتے پھرے پر کوئی ایسا نہ ملا جو انہیں پہچانتا۔ کہیں ان کی مڈھ بھیڑ مجھ سے ہو گئی بولے کہ ہے مارکنڈے میں نے سنا ہے کہ تیری عمر بہت لمبی ہے تو تو مجھے پہچانتا ہوگا۔ میں نے کہا کہ رشی مہاراج میں اپنی دھن میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ نہ کسی استھان پہ ٹکتا ہوں نہ کسی مانو سے ہنستا بولتا ہوں۔ میں بھلا کیسے پہچانوں گا۔ اندر دمن رشی میری یہ بات سن کے اور بھی دکھی ہوئے۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہے مارکنڈے تجھ سے زیادہ عمر والا بھی کوئی ہے میں نے کہا کہ ہاں ہے۔ ہماوت کی چوٹی پہ ایک الو بیٹھا ہے اس کی عمر مجھ سے زیادہ ہے بولے کہ چل میرے سنگ چل کر اس الو سے پوچھتے ہیں کہ تو مجھے پہچانتا ہے وہ مجھے اوشیہ پہچان لے گا۔

پتر وا میں اندر دمن کے سنگ ہو لیا ہم دونوں چلے الو کے پاس۔ چلتے چلتے ہماوت کی چوٹی پہ پہنچے دیکھا کہ الو ایک ٹھنٹھ پہ آنکھیں موندے بیٹھا ہے میں بہت شتابدیوں پہلے یہاں پہ آیا تھا۔ اس سمے بھی وہ اسی پرکار آنکھیں موندے بیٹھا تھا تب سے اب تک اس نے آنکھ نہیں کھولی تھی ہم نے جب اسے پکارا تو مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ اندر دمن جی نے پوچھا کہ ہے الو میں اندر دمن ہوں۔ تو مجھے جانتا ہوگا۔

الو نے اندر دمن جی کو دیکھا کہا میں تو تجھے نہیں پہچانتا۔ اور پھر آنکھیں موند لیں اندر دمن جی الو سے یہ بات سن کے بہت دکھی ہوئے پہلے تو چپ ہی ہو گئے پھر انہوں نے الو سے ایک پرشن کر ڈالا ہے الو تجھ سے بھی زیادہ عمر کسی جنے کی ہے الو نے مشکل سے آنکھیں کھولیں کہا کہ ہاں ہے یہاں سے پچھم کی اور ہزار کوس پر ایک تلیا ہے اس تلیا

کے بیچ ایک سارس کھڑا ہے اس کی عمر مجھ سے زیادہ ہے۔

اندردمن یہ سن کے بولے کہ ہے الو تو میرے سنگ چل۔ ہم چل کے اس سارس سے بات کرتے ہیں وہ مجھے اوشیہ پہچان لے گا۔

الو سنگ چلنے پہ تیار ہوگیا تب اندردمن، الو اور میں، تینوں مل کر چلے سارس سے ملنے کے لیے۔ مہینوں بعد سارس چونچ پروں میں دیئے آنکھیں موندے ایک ٹانگ پہ مہینوں بعد اس تلیا پہ پہنچے۔ دیکھا کہ بیچ تلیا میں ایک سارس کھڑا ہے۔ الو نے بتایا کہ سارس اَن گنت شتابدیوں سے اسی پرکار آنکھیں موندے چونچ پروں میں دیئے ایک ٹانگ پہ کھڑا ہے۔

اندردمن نے پکار کے کہا کہ ہے سارس میں اندردمن ہوں۔ سارس نے چونچ پروں سے نکالی، آنکھیں کھولیں اور بولا کون اندردمن۔ اس پہ اندردمن نے کہا کہ ہے سارس کیا تو اندردمن کو نہیں پہچانتا۔ میں اندردمن ہوں۔ سارس نے کہا کہ نہیں۔ میں اپنی تپسیا میں کھویا ہوا ہوں۔ مجھے کیا معلوم کہ تو کون ہے اور اندردمن کون ہے۔

بیچارے اندردمن پہ گھڑوں پانی پڑ گیا چپ کا چپ رہ گیا پھر ہمت کرکے پوچھا کہ ہے سارس تجھ سے زیادہ عمر بھی کسی کی ہے۔

ہاں ہے بھلا کس کی ہے؟ ہے مانو۔ اسی جھیل میں ایک کچھوا باس کرتا ہے اسکی عمر اتنی ہے کہ میں اس کے سامنے بالک کے سمان ہوں۔ ہے سارس، کچھوا بھلا وہ اس سمے کدھر ہے۔ ہے مانو وہ کچھوا تو کچھوا برسوں سے آنکھیں موندے تلیا کے اندر بیٹھا ہے اور اوم کا جاپ کر رہا ہے پر میں تیرے لیے اسے بلاتا ہوں۔

یہ کہہ کے سارس نے کچھوے کو پکارا۔ کچھوا سارس کے پکارنے پر تلیا سے باہر آیا اور بولا کہ ہے سارس تو نے کس کارن میری تپ میں بھنگ ڈالی۔

سارس نے کہا کہ ہے کچھوے ایک لمبی عمر والا مانو کالے کوسوں چل کر آیا ہے میں تو اسے پہچانتا نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جس کی عمر تجھ سے زیادہ ہو اس کا پتہ دے، وہ مجھے

پہچان لے گا تو مجھ سے زیادہ تو تیری ہی عمر ہے تو بتا کہ تو اس مانو کو پہچانتا ہے۔

کچھوے نے پوچھا کہ "بھلا اس مانو کا کیا نام ہے؟"

اندردمن نے آگے بڑھ کر کہا کہ "ہے کچھوے میرا نام اندردمن ہے میں اتنی شتابدیوں کے بعد پلٹ کے یاں پہ آیا ہوں کہ میرے سنگی ساتھی سب مر کھپ چکے ہیں کوئی مجھے اب پہچانتا ہی نہیں۔ شاید تو مجھے پہچانتا ہو؟"

کچھوا اندردمن کا نام سن کر چونکا۔ غور سے اندردمن کو دیکھا اور ترنت پہچان لیا۔ پہچان لیا وہ رویا اور بولا کہ "ہے اندردمن میں بھلا تجھے کیسے نہ پہچانوں کہ تو نے جو گئوئیں دان دی تھیں انہوں نے ہی تو کھر مار مار کے یہ تلیا بنائی ہے جس میں اب میں باس کرتا ہوں۔"

کچھوے کے یہ کہتے ہی دیولوک سے ایک رتھ اترا۔ ساتھ میں ایک پکار آئی کہ ہے اندردمن چل، چل کے دیولوک میں اپنا استھان سنبھال۔

اندردمن رتھ میں بیٹھے ہمیں بھی اپنے سنگ بٹھا لیا۔ ہم میں سے ہر ایک کو اس کے ٹھکانے پہ اتارا۔ پھر خود دیولوک کو سدھار گئے۔

سو بھئی مترو، آدمی بھوساگر میں اکیلا ہے یہ کائنات غیر جگہ ہے اور ہم اس میں اجنبی ہیں سو یہاں سے جلدی گذر جانے ہی میں عافیت ہے لمبی عمر کی آرزو میں خرابی ہی خرابی ہے سچی بات ہے مجھے تو یہ حکایت پڑھ کے بہت عبرت ہوئی۔ میں ڈرتا ہوں اس دن سے جب یارِ عزیز مشتاق علی اس نگر سے ہجرت کر جائے اور عہد حاضر کی شبِ دیجور میں رنجور مہجور اکیلا رہ جائے پھر میں اندردمن کی طرح الوؤں سے پوچھتا پھروں گا کہ مترو تم مجھے پہچانتے ہو۔ اندردمن کو تو انت میں ایک کچھوے نے پہچان لیا تھا۔ مجھے کون پہچانے گا۔ دیکھتے دیکھتے دنیا بدل گئی آگے لگتا تھا کہ سارا نگر

مجھے جانتا ہے اب لگتا ہے کہ یہ غیر جگہ ہے اور میں پردیسی ہوں۔ خود میرا بیٹا مجھے غیر جانتا ہے جان پہچان والے ایک ایک کر کے سب ہی چلے گئے بس ایک مشتاق علی نے زمین پکڑی ہے پرنتو وہ اس گھڑی بتیس دانتوں کے بیچ زبان کی سمان ہیں کل تک جو انہیں جھک کے ڈنڈوت کرتے تھے وہ اب انہیں پہچاننے سے انکاری ہیں جو دوستی کا دم بھرتے تھے اب وہ شترو بنے ہوئے ہیں۔ میری جاتی کے لوگوں کے ارادے ان کے بارے میں اچھے نہیں ہیں اور تو میں کچھ کر نہیں سکتا۔ بیٹا تک میرے کہنے میں نہیں ہے دوسرے کیا سنیں گے خیر میں نے کچھ منتر جو میں نے آنجہانی پتا جی کی پوتھی میں لکھے دیکھے تھے مشتاق علی کو بتا دیئے ہیں۔ ذیل میں چند ایک نقل کرتا ہوں۔

شترو کو نشٹ کرنے کا منتر

اونگ، ہرینگ، سرینگ —— یہ شبد آکھ کے پتے پہ لکھے اور گرم تندور میں جھونک دے۔ سات دن ایسا کرے۔ شترو جل کر راکھ ہو جاوے گا۔

ایضاً

اونگ، بلونگ، بجرنگ بجرنگ، جے ہنومان کی —— یہ شبد ببول کے کانٹے سے بھوج پتر پر لکھے۔ بکھ کے بازو پہ باندھے شترو دیکھ کے ڈرے گا۔ کنی کاٹ کے نکل جاوے گا۔

ایضاً

مم، مکٹ، سکٹ، مم منوم تھے پورتی، مم چنتا چورتی۔ دہائی باسدیو کی۔ دہائی لونا چماری کی —— یہ شبد پیپل کی لکڑی کی لیکھنی سے پتر پہ لکھ کے دوپہر کے سمے

چوکھٹ تلے دبا دیں۔ پھر اس گھر کے لیے کوئی جوکھوں نہیں ہے گھر والے بیریوں سے سرکھچت رہیں گے۔

آنجہانی پتا جی کا بیان ہے کہ یہ منتر آزمودہ ہیں۔ پر مترو دوستو سب سے بڑا منتر تو اوم کے جاپ کا ہے۔ اوم کا جاپ رد بلا ہے آدمی کیسے ہی سنکٹ میں ہو کیسی ہی مشکل میں ہو اوم کا ورد کرے، سنکٹ سے نکل آوے گا، مشکل دور ہو جاوے گی۔ سمجھو، ہمارا من ماچس کی ڈبیا ہے اوم کا کلمہ ماچس کی تیلی ہے تیلی کو ڈبیا پہ گھسو روشنی پیدا ہوگی، سارا اندھیرا دور ہو جاوے گا۔ مترو اور دوستو، میرا تو یہی ایمان ہے میرا روزانہ کا وظیفہ یہ ہے کہ سونے سے پہلے سو دفعہ اوم کا ورد کرتا ہوں اور تین دفعہ نادِ علی پڑھتا ہوں۔ اوم شانتی شانتی شانتی۔ یا علی۔ یا علی۔ یا علی۔

٨

اس بسنت پہ وہ مجھے بہت یاد آئی تھی بھی تو اس اپنے نئے گھر میں یہ میری پہلی بسنت ۔ کتنے برسوں بعد میں نے بسنت کے اُجلے نیلے آسمان کو دیکھا کہ دُھوپ سے بھرا تھا اور پتنگوں پرندوں سے جھلملا رہا تھا ۔ کرائے والے مکان ایک پہلے مکان کو چھوڑ کر ہمیشہ اتنے تنگ میسّر آئے کہ آسمان سے ڈھنگ کی ملاقات ہی نہیں ہو پاتی تھی ۔ اصل میں آسمان بھی تو ہمارے رہنے سہنے کے حساب کو دیکھ کر اپنے درشن دیتا ہے ۔ جتنا آنگن اتنا آسمان ۔ ابھی اپنے گھر کا آنگن اُجلا اُجلا تھا ۔ چھت بھی بہت پھیلی ہوئی دکھائی دیتی تھی ۔ گھر کے اس اُجلے اور کشادہ گردوپیش میں بسنت کا آسمان کتنا روشن کتنا کشادہ نظر آرہا تھا ۔

بسنت کی اس جھلمل میں حافظہ کے دریچے کتنی تیزی کے ساتھ کھلتے چلے گئے بیتے دنوں کی مہک اپنے بہاؤ میں میرے تتر بتر ریزوں کو بھی لے آئی ۔ میں پھر سے اکٹھا ہو رہا تھا ۔ لگا کہ وہی میں ہوں جو ہوا کرتا تھا اور وہی یہ دن ہیں ۔ وہ بالکل اسی رنگ کا بسنتی دن تھا ۔ ہوا میں حرارت اور خنکی کا ایسا ہی گھال میل تھا ۔ فون کی گھنٹی بجی ۔ میں نے اُٹھایا ۔ وہ بول رہی تھی ۔ بسنت کی ترنگ میں میری بھی زبان کھل گئی ۔ پہلی بار تکلف کو بالائے طاق رکھا ۔ "شہزادی کی جوتی اپنا کام دکھا چکی ہے اسے

اب واپس لے ہی لیا جائے تو اچھا ہے ۔"

"شہزادی کی جوتی ؟ کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ میں نے اس حسین قلم کو بہت سنبھال کر رکھا ۔ یہ امانت اب مجھے مجھے بھاری پڑ رہی ہے ۔ اب تم آکر اپنی امانت لے جاؤ ۔ یہ وقت بھی مناسب ہے ۔"

"مناسب وقت سے آپ کی کیا مراد ہے ؟"

"یہی کہ اگر یہ موسم گذر گیا تو پھر ساون رُت تک انتظار کرنا پڑے گا ۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی ۔ وہی تباہ کن ہنسی ۔ بس ساری فقرہ بازی بھول گیا ۔ پگھلتا چلا گیا ۔ ایک مرتبہ پھر فون درمیان سے سرک گیا ۔ بس وہ تھی اور میں ۔ وہ بالکل بسنت کی طرح کھلی ہوئی ۔ "اچھا کل ۔"

"کل ؟ . . . . واقعی ؟" مجھے یقین نہیں آرہا تھا ۔

جیسے کھلکھلاتی ہنسی ایک دم سے سرگوشی بن گئی ہو ۔

"ہاں کل ۔"

"آج چھٹی کا دن اونگھ کر ہی گذارنا ہے ۔" زبیدہ کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی وہ خود آن موجود ہوئی ۔

"کیوں ، کیا مسئلہ درپیش ہے ۔" میں یادوں کی اقلیم سے کتنی تیزی سے ٹوٹتا بکھرتا واپس آیا ۔

"میں نے کہا کہ آج چھٹی کا دن ہے ۔ ہاؤسنگ والوں کا حساب آیا رکھا ہے ۔ ذرا اسے چیک کر لیتے ۔ یہ بھی پتہ چل جاتا کہ ہم اب تک کتنا ادا کر چکے ہیں ۔"

"کل پرسوں کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر حساب کریں گے ۔"

"آج کیا بے اطمینانی ہے ۔"

"بے اطمینانی تو کوئی نہیں ہے ۔ بس اتنی بات ہے کہ آج بسنت ہے ۔ دیکھ

نہیں رہی ہو آج آسمان پہ کتنی چہل پہل ہے۔"

"یہ بسنت سے زیادہ ضروری کام ہے۔ پتہ تو چلے کہ انہوں نے حساب ٹھیک بھیجا ہے۔ کم زیادہ تو نہیں کیا۔ محکمہ والوں کا کوئی اعتبار تھوڑا ہی ہے۔ کیا پتہ ہے۔ ہمارے حساب میں کس وقت کتنی رقم نکال دیں۔ جو دینا ہے وہ تو دینا ہے ہی مفت کی چٹی تو نہ پڑے۔"

بس جیسے آنگن میں اُتری ہوئی چڑیوں کو کوئی ہش کہہ کے اُڑا دے۔ ان چار فقروں نے یادوں کے جمگھٹے کو تتر بتر کر دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں ایسے ہو گیا جیسے اندر سے بالکل خالی ہوں۔ خیر تھوڑی ہی دیر میں یادیں پھر اُترنے لگیں۔ آنگن پھر بھرتا چلا گیا۔ اب میری نظریں آسمان سے اُتر کر اس گیندے پر ڈول رہی تھیں۔ جو لان کے ایک دُھوپ سے بھرے گوشے میں کھڑا ہنس رہا تھا۔ یادوں نے اس گیندے سے اشارہ لیا اور ہجوم کرتی چلی گئیں۔ ہر پھر کر وہی یاد جو اس ہجوم میں سب سے نمایاں سب سے روشن تھی۔

"ٹھیک ہے کل سہی۔ بسنت رُت تو کل بھی ہو گی۔ مگر یہ نہ ہو کہ کل کسی اگلی کل پر جا پڑے۔ اس اگلی کل آنے پر پھر کوئی اگلی کل۔"

پھر ہنس پڑی۔ "نہیں۔ کل کا مطلب ہے کل۔"

"کل کس وقت؟"

"بس لنچ ٹائم میں آجاؤں گی۔"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ "اچھا تو کسی دفتر میں کام کرتی ہو؟"

یہ بات جیسے سنی ہی نہیں۔ صاف گول کر گئی۔ "بس کل ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ آجاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے، مگر وہ لنچ کا وقت ہوتا ہے۔ ویسے میرا تو ڈرائی لنچ ہوتا ہے۔

کافی ہاؤس میں جا کر کرتا ہوں۔ اچھا ہے کافی کی پیالی پر ملاقات زیادہ بھلی لگتی ہے۔"

تھوڑے تامل کے بعد "اچھا ٹھیک ہے۔ وہیں آجاؤں گی۔"

"مگر میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟"

"رتن نے پدم کو کیسے پہچانا تھا۔"

"اس نے تو پدم کو خواب میں دیکھا تھا۔"

"آپ نے ابھی تک مجھے خواب میں نہیں دیکھا۔" ساتھ ہی کھنکھناتی ہنسی۔ فوراً ہی ایک فقرہ اور لگا دیا۔ "اور ہاں طوطا بھی تو ہو گا۔"

میں بالکل لاجواب ہو گیا۔

"مگر میرا گائیڈ تو کوئی طوطا نہیں ہو گا۔ میں آپ کو کیسے پہچانوں گی۔"

"بہت آسان طریقہ ہے۔ کاؤنٹر پر میرا نام لے کر پوچھ لیجئے۔ میں بھی کہہ رکھوں گا کہ ایک بی بی ذکیہ احمد نام کی آئیں گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"میں نے کہا کہ کان بند کر کے بیٹھے ہوتے ہو۔" زبیدہ کی آواز آئی اور ایک مرتبہ پھر چڑیاں پھر اکٹھا کے اُڑ گئیں۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"دروازے پہ کوئی ہے۔ بیل بجی ہے۔"

"اچھا۔" میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

جا کر درواز کھولا۔ کامریڈ کھڑا تھا۔ "کامریڈ، تم اس وقت کہاں سے آن ٹپکے۔"

کامریڈ اندر آیا۔ اپنے پرانے دستور کے مطابق کتابچوں رسالوں اخباروں سے بھرا تھیلا ایک طرف رکھ کرسی صوفہ سے کنارہ کر کے قالین پہ پسر گیا۔

"یہ وقت کی کیا شرط ہے۔ کیا غلط وقت پہ آیا ہوں۔ ویسے تو ہر وقت ہی

غلط وقت ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں سالا ٹھیک وقت کب آئے گا۔"

"بہرحال آ گئے۔ اچھا کیا۔"

"کیا کر رہے تھے؟"

"بسنت منا رہا تھا۔"

کامریڈ نے اوپر سرسراتی پتنگوں پر نظر ڈالی۔

"پھر تو تمہیں چھت پہ ہونا چاہیئے تھا۔"

"نہیں بس اپنے لان میں بیٹھا تھا۔ پھولتے گیندے کو دیکھ رہا تھا اور گذرے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔ یار، وہ اچھے دن تھے۔"

کامریڈ نے غضبناک نظروں سے مجھے دیکھا "اچھے دن؟ وہ کونسے دن تھے۔"

"جن دنوں ہم اکٹھے تھے۔"

"چار رجعت پسند اگر اکٹھے ہو جائیں اور بورژوا ادب پہ دھواں دھار باتیں کر کے وقت ضائع کریں تو وہ دن اچھے ہو جاتے ہیں؟

"کامریڈ مت بھولو کہ اس منڈلی میں تم بھی تھے اور تمہارا کامریڈ ظہور بھی تھا۔"

"کامریڈ ظہور" کامریڈ نے دانت کچکچائے۔ "ان سالوں ہی نے تو پارٹی کا بیڑا غرق کیا۔ "ڈک کر" اور وہ سالا کامریڈ شوکت۔ ایکسپورٹ امپورٹ کے لائسنسوں کے چکر میں پارٹی کا تیا پانچا کر دیا۔ انقلابیوں کا سرخیل بنا پھرتا تھا۔ اب سمگلر گنگ ہے۔"

میں نے کامریڈ کا ہاتھ پکڑا۔ "ذرا باہر چل۔" اسے لے جا کر لان میں کھڑا کر دیا۔ اپنے گیندے کی طرف اشارہ کیا۔ "کامریڈ، آج بسنت کا دن ہے۔ میں تمہاری انقلابی بکواس سننے کے بالکل موڈ میں نہیں ہوں۔ آج اپنے گیندے سے میرے مکالمے کا دن ہے۔"

"کامریڈ، تم مریض ہو۔ اپنا علاج کراؤ۔ جو عوام کے ساتھ مکالمہ کی ہمت نہیں رکھتے پھر وہ گیندے اور گلاب ہی سے مکالمہ کرتے ہیں۔ اس مکالمہ میں کوئی جوکھوں جو نہیں ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم آج زیادہ ہی کہیں سے پٹ کر آئے ہو۔ آرام کرو۔ ذرا شام ہو تو ممتاز کے پاس چلیں گے۔"

"ممتاز سے تمہاری ملاقات ہو گئی؟"

"ہاں ہوئی تو تھی۔ یار وہ تو اب بہت مصروف آدمی ہو گیا ہے۔"

"جو سالا پیسہ کما لیتا ہے اس سالے کا وقت پھر بہت قیمتی ہو جاتا ہے۔"

"بہرحال آج اس سے ملاقات کی ٹھہری ہے۔ کہنے لگا کہ پروگرام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یار کبھی ہم پہلے پروگرام طے کر کے ملے تھے۔ بس مل کر بیٹھیں گے باتیں کریں گے۔ پرانے دنوں کو یاد کریں گے۔ بقدر توفیق رتجگا کریں گے۔"

کامریڈ نے ایک مرتبہ پھر میری مریضانہ ذہنیت پر بھرپور تبصرہ کیا اور اندر ڈرائنگ روم میں جا کر قالین پہ لوٹ لگانے لگا۔ وہ اندر خراٹے لے رہا تھا اور یہاں میں گیندے کے روبرو اپنے خیالوں میں گم تھا۔ سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وہاں سے پھر مل گیا تھا۔

"یار ممتاز، آج کل مجھے ایک لڑکی ٹکری ہوئی ہے۔"

ممتاز ہی سے میں دل کے معاملات کہتا تھا کہ اسی پر مجھے ان معاملات میں اعتبار تھا۔

"جب تم اسے ٹکرو گے تب ہم جانیں گے۔"

"وہ نہیں یار۔ یہ ایک اور لڑکی ہے۔"

"اچھا؟ کوئی نیا چکر۔ یہ چکر کیسے شروع ہوا۔"

"کوئی چکر وکر نہیں ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ آج کل میرا اسکوٹر خراب ہے۔ ویگن سے دفتر آتا جاتا ہوں۔ تو جب میں صبح کو نکلتا ہوں اور سٹینڈ پر جا کر ویگن کا انتظار کرتا ہوں تو وہاں ایک بے چین روح نظر آتی ہے۔ بار بار اپنی گھڑی دیکھتی ہے۔ جیسے اپنی گھڑی پر اسے اعتبار نہ ہو، میرے پاس آتی ہے۔ پہلے پوچھے گی کہ آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہے۔ پھر پوچھے گی کہ ویگن کا تو یہی ٹائم ہے نا ——" "جی" —— "پھر کیوں نہیں آئی ابھی تک" ——

"پتہ نہیں" —— "کہیں آ کر چلی تو نہیں گئی" —— "میرے خیال میں تو ابھی نہیں آئی ہے" —— "آپ یہاں کب سے کھڑے ہیں؟"

"یہی کوئی آدھ گھنٹے سے" —— "اچھا، پھر ٹھیک ہے"

"بہت سوال کرتی ہے۔"

"ابتدا تو اچھی ہے۔ ویسے شکل وصورت کیسی ہے۔"

"یار شکل وصورت کی تو بری نہیں۔ مگر بور ہے یا اس کے سوالوں سے میں بور ہو گیا ہوں۔"

"اور تم کوئی سوال نہیں کرتے۔"

"نہیں۔"

"کچھ نہیں پوچھتے۔"

"نہیں، میں کیا پوچھوں۔"

"کوئی بھی بے معنی فضول لایعنی سی بات پوچھی جا سکتی ہے۔ بات جو کرتی ہوئی۔"

"نہیں، میری سمجھ میں تو کوئی بات آتی نہیں۔ سو میں تو اس سے کچھ پوچھتا وچھتا نہیں۔"

"پھر بور تو تم ہوئے۔"

"یار، میرے دماغ میں تو وہ بسی رہتی ہے۔ اب اس کے ہوتے ہوئے تو مجھے سب لڑکیاں بے معنی نظر آتی ہیں۔"

"پھر اسی کے متعلق کچھ کرو۔"

"کیا ہے۔ کل ملاقات ہو رہی ہے۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔"

"گڈ۔"

اور دوسرے دن لنچ کا وقت ہونے سے پہلے ہی میں دفتر سے نکل لیا کہ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ میرے پہنچتے پہنچتے آ کر چلی جائے۔ انتظار کرنے والے بھی کتنے عجلت پسند ہوتے ہیں۔ یوں پوری عمر انتظار میں گزار دیں۔ خیر لنچ ٹائم سے پہلے ہی میں موقعہ واردات پر پہنچ لیا۔ ایسی میز سنبھالی اور ایسے زاویے سے بیٹھا کہ دروازہ کھول کر جو بھی اندر آتا وہ صاف نظر آتا۔ دروازے کے برابر کاؤنٹر تھا۔ روز کی طرح آج بھی اشرف صاحب کہ کافی ہاؤس کے مینجر ہیں، کاؤنٹر پہ بیٹھے تھے۔

لنچ ٹائم ہو چکا تھا۔ دروازہ بار بار کھلتا، آنے والے آتے چلے جا رہے تھے۔ مگر مجھے باقیوں سے کیا لینا تھا۔ میں تو اس وقت چونکتا تھا جب کوئی لڑکی داخل ہوتی تھی اور ہر خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر میں شک میں پڑ جاتا کہ شاید یہی وہ ہے۔ وہ قریب آتی جاتی اور میرے دل میں دھکڑ پکڑ ہونے لگتی۔ مگر میرے قریب سے گزر کر وہ سیڑھیوں پر ہو لیتی اور اوپر کی منزل پر چلی جاتی۔ ایک خوبصورت لڑکی جب داخل ہو کر ٹھٹھکی اور کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر اشرف صاحب سے کچھ پوچھنے لگی تو میں نے سوچا کہ یہ لڑکی ضرور وہی ہوگی۔ مگر اشرف صاحب نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ سونتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

پھر ایک لڑکی نے داخل ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑائی اشرف صاحب سے

کچھ پوچھا اور فوراً ہی واپس چلی گئی۔ میں لپک کر کاؤنٹر پر گیا۔ "اشرف صاحب، یہ لڑکی کسے پوچھ رہی تھی؟"

"عظیم صاحب کو پوچھ رہی تھی۔ آج وہ آئے ہی نہیں۔"

میں اپنی جگہ پہ آ بیٹھا۔ مگر جب ایک اور لڑکی اسی طرح داخل ہو کر کاؤنٹر پہ اشرف صاحب سے بات کر کے چلی گئی تو میں پھر بےچین ہوا جا کر پھر اشرف صاحب سے پوچھا۔

"یہ لڑکی کسے پوچھ رہی تھی؟"

اشرف صاحب مجھے دیکھ کر ہنسے۔ "اخلاق صاحب، جب آپ والی لڑکی آئے گی تو میں اسے آپ کی طرف ڈائرکٹ کر دوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

میں بہت سٹپٹایا۔ "اشرف صاحب، میری کوئی لڑکی نہیں ہے۔ میں نے تو اُسے دیکھا بھی نہیں ہے۔" پھر میں نے وضاحت کی۔ "ہوا یہ کہ وہ ہمارے دفتر میں فون کرنے آئی تھی۔ میں تو اس وقت تھا بھی نہیں۔ وہ جاتے ہوئے اپنا پین بھول گئی۔ اصل میں اسے اپنا پین لینے کے لئے آنا ہے۔"

"ارے اخلاق صاحب، آپ تو صفائیاں پیش کرنے لگے۔"

"صفائی پیش نہیں کر رہا، بتا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ بیٹھے ہیں نا۔ وہ آئے گی تو مجھ ہی سے پوچھے گی۔ میں آپ کی طرف اسے ڈائرکٹ کر دوں گا۔"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے بےچینی سے اپنی گھڑی دیکھی۔ "لنچ ٹائم جا رہا ہے۔ مجھے آخر دفتر واپس جانا ہے۔ ابھی تک آئی ہی نہیں۔"

"کیا اُسے دور سے آنا ہے؟"

"اب یہ تو مجھے پتہ نہیں ——— ویسے دور ہی سے آ رہی ہو گی اور پھر اس وقت سواری بھی مشکل سے ملتی ہے۔" میں نے اس طرح اپنے آپ کو بھی سمجھایا اور واپس اپنی جگہ

آ بیٹھا اور اب میں ایک شک میں پڑ گیا تھا۔ پتہ نہیں آئے گی بھی یا نہیں اور اس شک کے ساتھ میری بےچینی اور بڑھ گئی۔ اسی آن دروازہ کھلا۔ ایک لڑکی داخل ہوئی۔ مگر اس مرتبہ میں تھوڑا بور ہوا۔ اصل میں یہ وہی لڑکی تھی جو مجھے بس سٹینڈ پر نظر آیا کرتی تھی۔ میں نے بیزار ہو کر سوچا کہ لو یہ یہاں بھی آن ٹپکی۔ اس نے کاؤنٹر پہ کھڑے ہو کر اشرف صاحب سے کچھ پوچھا۔ انہوں نے اسی طرف اشارہ کیا جس طرف میں بیٹھا تھا۔ وہ لڑکی میری سمت آئی۔ میں ایسے بن گیا۔ جیسے میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ پھر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ شکر ہے کہ واپس چلی گئی۔ پھر مجھے یونہی خیال آیا کہ آخر یہاں وہ کس سے ملنے آتی ہے۔ ہو گا اس کا بھی کوئی دلدادہ۔ جوان لڑکی کیسی بھی ہو، چاہنے والا کوئی نہ کوئی اُسے مل ہی جاتا ہے۔ یہ سوچ کر میں اسے ذہن سے رفع دفع کر دینا چاہتا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ اشرف صاحب اُسے ساتھ لے کر میری طرف آ رہے ہیں۔ "دیکھئے یہ ہیں اخلاق صاحب۔"

"آپ" اس نے مجھے حیران ہو کر دیکھا۔

"جی میں اخلاق ہوں۔" میں نے اپنی بیزاری کو چھپاتے ہوئے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

وہ سٹپٹائی۔ "آپ اخلاق صاحب ہیں ——— اچھا آپ ہیں ——— میں سمجھ رہی تھی کہ"

"آپ کیا سمجھ رہی تھیں۔" میں نے اب کسی قدر ترشی سے جواب دیا۔

"دیکھئے بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو فون کیا تھا۔ مجھے آپ سے پین لینا تھا۔"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ "پین۔ آپ کو پین لینا تھا۔ تو آپ ہیں۔"

"جی"

"تشریف رکھیں۔"

وہ کسی قدر تامل کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ادھر وہ سٹپٹائی ہوئی تھی۔ اِدھر میں۔

"اچھا آپ کا وہ پین ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ

"جی آپ کیا سمجھ رہے تھے"

"کچھ نہیں" میں نے فوراً جیب سے پین نکالا اور پیش کر دیا۔ "یہ لیجئے۔ آپ کا پین حاضر ہے"

اس نے قلم لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تشریف رکھیں نا۔ کافی پیجیے"

"شکریہ۔ میں اس وقت جلدی میں ہوں"

شام کو ممتاز ملا۔ "سناؤ استاد کیا ہوا"

"یار بہت بری ہوئی۔"

"کیوں۔ نہیں آئی؟"

"آئی تو تھی"

"پھر؟"

"یار وہ تو وہی بور لڑکی تھی"

"کونسی بور لڑکی"

"وہی جس سے بس سٹینڈ پہ میری مڈھ بھیڑ ہوتی رہی ہے"

ممتاز نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ "اچھا وہ تھی۔ اچھا بتاؤ پھر کیا ہوا"

"میں نے اسے پین دیا اور چلتا کیا"

ممتاز ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ "چلتا کر دیا؟ کیا مطلب؟"

"ہاں ادھر میں اسے دیکھ کر سٹپٹایا۔ ادھر وہ بھی مجھے دیکھ کے سٹپٹا گئی۔ یہ سچوایشن دونوں ہی کے لئے خلافِ توقع تھی۔ میں نے پین اس کے حوالے کیا وہ چلی گئی"

"تو کوئی بات وات نہیں کی"

"اس سے کیا بات وات ہو سکتی تھی"

"کافی وافی سے تواضع کی ہو گی۔ آخر اس دوران کیا کرتے رہے"

"میں نے کافی کے لئے پوچھا تھا۔ اُس نے کہا کہ میں جلدی میں ہوں۔ میں نے بھی سوچا کہ اب اسے جانے ہی دو"

ممتاز میری اس بات پہ بہت بے مزہ ہوا "یار عجب گھامڑ آدمی ہو۔ اچھی بھلی آئی ہوئی لڑکی کو گنوا دیا"

"یار تمہارا کیا خیال ہے وہ لڑکی بور نہیں تھی؟"

"کونسی جس سے فون پہ تم لمبی لمبی باتیں کیا کرتے تھے"

"نہیں یار، وہ تو بہت سویٹ تھی۔ مگر جو بس سٹینڈ پہ میرے گلے پڑ گئی تھی"

"نادان آدمی، اب تو تجھے سمجھ آجانی چاہیئے کہ لڑکی بیک وقت بور بھی ہوتی ہے سویٹ بھی ہوتی ہے۔ ویسے ایک بات میں تجھے بتائے دیتا ہوں"

"کیا؟"

"تم پچھتاؤ گے"

"کیسے؟"

"بس میں نے کہہ دیا۔ لڑکی اس طرح سے آکر چلی جائے۔ آدمی کو یہ تو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ ہوا کیا"

خیر اس وقت تو میں نے ممتاز کی بات سنی ان سنی کر دی۔ پھر ایک دو دن میں نے بس سٹینڈ کا رُخ ہی نہیں کیا۔ سوچا کہ نہ بس سے سفر کرو گے نہ اس سے مڈھ بھیڑ ہو گی۔ رکشا لیا اور سیدھے دفتر۔

بات جب ذرا آئی گئی ہو گئی تو میں نے سوچا کہ رکشا کا کرایہ کب تک بھرو گے۔

اپنی منی بس ہی ٹھیک ہے ایک دن، دو دن، تین دن، وہ لڑکی نظر نہیں آئی۔ اب میرا تجسس بڑھنے لگا۔ روز وقت سے ذرا پہلے سٹینڈ پر پہنچ جاتا، وہاں کھڑی ہوئی مخلوق کا جائزہ لیتا اور حیران ہوتا کہ وہ لڑکی کہاں چلی گئی۔

"یار ممتاز، وہ لڑکی تو غائب ہوگئی"

"کون لڑکی؟"

"یار وہی۔ اب وہ بس سٹینڈ پر نظر ہی نہیں آتی"

"فون بھی کوئی نہیں آتا ہے"

"نہیں۔ اس نے تو بالکل چپ سادھ لی"

"پھر پیارے وہ گئی"

"کامریڈ گیندے سے تمہارا مکالمہ ختم ہوا یا نہیں ہوا"

کامریڈ نے دھم سے آکر یادوں کے سارے سلسلہ کو درہم برہم کر دیا۔

"بھیا، میں نے تو پوری نیند لے لی۔

"کامریڈ، گیندے سے نہیں، اس وقت میں اپنے آپ سے مکالمہ کر رہا تھا"

"اپنے آپ سے مکالمہ" کامریڈ نے مجھے اس وقت کتنی تحقیر سے دیکھا "میں تم انٹلکچول لوگوں کی جعلی زبان سے بہت تنگ ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ممتاز کی طرف چلنا نہیں ہے۔ وہ سالا تمہیں گالیاں دے رہا ہوگا"

"چلتے ہیں یار، چائے تو پی لیں" میں اٹھ کر اندر گیا۔ زبیدہ سے چائے کی فرمائش کی۔ پھر کامریڈ کے پاس آبیٹھا۔ چائے بھی جلدی ہی آگئی اور چائے بھی جلدی ہی آگئی اور چائے پیتے پیتے پھر میں پٹری سے اتر گیا۔ پھر وہی یادیں اور باتیں اور میں سوچنے لگا کہ میں اس وقت آج سے کتنا مختلف تھا۔ جیسے وہ آدمی ہی کوئی اور تھا، اب میں نے دھیان ہی دھیان میں اپنے اس روپ کو ایسے یاد کیا۔ جیسے وہ کوئی اور

شخص تھا، مجھ سے بہتر مجھ سے برتر۔

"رحمت، میرا کوئی فون تو نہیں آیا تھا"

"نہیں صاب جی"

اب یہ سوال اس کا معمول بن گیا تھا۔ دفتر میں داخل ہو کر اپنی نشست پہ بیٹھا گھنٹی بجا کر رحمت کو بلایا۔ پہلا سوال "میرا کوئی فون تو نہیں آیا تھا" اور رحمت کا بندھا ٹکا جواب "نہیں صاب جی"۔ بے اعتنائی کے دن کتنی جلدی گذر گئے۔ بے چینی کے دن کتنی تیزی سے واپس آئے اور پہلے کی نسبت کتنی زیادہ شدت کے ساتھ واپس آئے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اسی کا دھیان وہی ایک آواز نرم شیریں اس کے سامعہ میں گونجتی رہتی اور اب یہ پہلے کی طرح محض آواز نہیں تھی اس کے ساتھ ایک چہرہ بھی جڑ گیا تھا۔ وہ صورت جس سے وہ اتنا بیزار رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کے دل و دماغ میں کھبتی چلی گئی۔ اسی حساب سے دلکش ہوتی چلی گئی۔ اب وہ پیکر اس ساعت کے ساتھ جب وہ کافی ہاؤس میں اس کی تلاش میں داخل ہوئی تھی اس کے تصور میں کتنا رچ بس گیا تھا۔ وہ چھریرا بدن، وہ سانولی صورت۔ وہ گھبرائے گھبرائے لہجہ میں پوچھنا "آپ ہیں اخلاق صاحب" اور پھر شپٹا جانا۔ اس نے اپنے آپ پر کتنی ملامت کی کہ اسے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ تھوڑا اصرار کیا جاتا تو وہ ضرور رک جاتی۔ نہیں رکی، مگر اس کے بعد فون تو کرتی۔ فون اس نے پھر کیوں نہیں کیا۔ کتنی بار دل ہی دل میں یہ سوال اس نے دہرایا۔ میز پہ رکھا ہوا ٹیلی فون اب اسے کتنا بے معنی نظر آنے لگا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں تک جب اس کے فون آیا کرتے تھے تو یہ ٹیلی فون اس کے لئے ایک زندہ شے تھا۔ فون کی گھنٹی بجتی تو واقعی بولتا ہوا لگتا، جیسے اُسے پکار رہا ہے۔ اب وہ محض ایک مشین تھا۔ ایک ٹھیکرا جس نے میز پہ خواہ مخواہ جگہ گھیر رکھی تھی۔ پھر بار بار جھک مار کر رحمت سے سوال "میرے پیچھے کسی کا فون تو نہیں آیا"

"نہیں صاب جی۔" اور عین لنچ کے وقت بیقرار ہو کر اٹھ کھڑے ہونا۔ کافی ہاؤس
ایسے پہنچنا جیسے ملاقات کا وقت ٹھہرا ہوا ہو۔

"شرافت صاحب وہ لڑکی پھر تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔"

"عجب لڑکی ہے۔" بڑبڑانا اور چپ ہو جانا۔

روز وہی ایک سوال۔ نفی میں جواب سننا، بڑبڑانا اور چپ ہو جانا۔ آخر شرافت
صاحب کی زبان کھل گئی۔ "اخلاق صاحب، آپ اس لڑکی کے لئے بہت پریشان
نظر آتے ہیں۔"

"نہیں پریشان تو میں نہیں ہوں مگر ——" کچھ کہنا چاہتا تھا، پتہ نہیں کیا۔

"اسے بینک ہی میں جا کر کیوں نہیں مل لیتے۔"

"بینک میں؟" وہ چونکا جیسے ہاتھ سے نکل ہوئی ڈور کا سرا مل گیا ہو "مجھے
تو پتہ نہیں کونسے بینک میں کام کرتی ہے۔"

"واہ اخلاق صاحب، یہ بھی ہم ہی بتائیں آپ کو۔"

"شرافت صاحب، آپ کمال کرتے ہیں۔ میں کونسا اس لڑکی سے عشق کر رہا
ہوں کہ اس کا پتہ نوٹ کرتا۔ وہ خود ہی اپنا پین میرے دفتر میں آکر چھوڑ گئی۔
بس اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔"

"تو اس روز پین لے کر نہیں گئی ہے۔"

"وہ تو خیر لے گئی تھی۔ لیکن ——" سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کہے اور بات کیسے
بنائے۔

"ٹھیک ہے اخلاق صاحب ٹھیک ہے۔ مگر وہ آپ سے تو بہت قریب ہے۔
آپ کے دفتر کے پاس کمرشیل بینک ہے نہیں۔"

"ہاں ہاں۔"

"وہیں کام کرتی ہے۔"

وہ حیران رہ گیا۔ کہاں کہاں اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ بغل میں لڑکا شہر میں
ڈھنڈورا۔ وہ تو بالکل اس کے بغل میں بیٹھی ہوئی ہے۔

"وہاں اس کا پتہ کیسے چلے گا۔"

شرافت صاحب بہت ہنسے۔ "کمال ہے اخلاق صاحب آپ تو بہت ہی
سیدھے آدمی ہیں۔ کسی سے پوچھ لیجئے کہ ذکیہ احمد کدھر بیٹھتی ہے۔ پہلے تو وہ
ادائیگیوں کے کاؤنٹر پہ ہوا کرتی تھی۔ مگر اب جو میں پچھلے ہفتے چیک کیش کرانے
گیا تھا تو وہاں وہ نظر نہیں آئی۔" رک کر "لنچ ٹائم ختم ہو رہا ہے۔ اس وقت وہ مل
جائے گی۔"

"نہیں مجھے اتنی عجلت نہیں ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے کافی کا ہی آرڈر
دے دیا۔ وہ ایسے جتا رہا تھا جیسے وہ اس وقت ادھر جانے کی کوئی نیت نہیں
رکھتا۔ اطمینان سے کافی پیتا رہا۔ دیر بعد اٹھا۔ اطمینان سے وہاں سے نکلا۔ لیکن
باہر نکلتے ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ چلا کمرشیل بینک کی طرف۔ چل کیا رہا تھا۔ دوڑ
رہا تھا۔ کتنی جلدی جلدی اس کے قدم اٹھ رہے تھے۔ اس کا بس چلتا تو اڑ کر وہاں
پہنچ جاتا۔

"دیکھئے یہاں ذکیہ احمد کس طرف بیٹھتی ہیں۔" پہلے ہی کاؤنٹر۔ جو اسے نظر آیا
اس پر سوال داغ دیا۔

"ذکیہ احمد، وہ تو اب یہاں نہیں ہوتیں۔"

"جی، وہ یہیں ہوتی ہیں۔"

کاؤنٹر پہ بیٹھے کلرک نے اڑتی سی ایک نظر اس پر ڈالی۔ "ہوتی تھیں۔ یہاں

سے ان کا ٹرانسفر ہو گیا۔"

"ٹرانسفر؟" اس پہ اوس پڑ گئی "اچھا؟" سوچ میں پڑ گیا۔ مگر پھر فوراً ہی اُس نے حوصلہ پکڑا "آپ بتا سکتے ہیں کہ کہاں ٹرانسفر ہوا ہے۔"

کاؤنٹر کلرک نے کہ اپنے کام میں مصروف ہو چکا تھا بڑی بے دلی سے رجسٹر سے نظریں اُٹھائیں۔ قریب بیٹھے ہوئے کلرک سے پوچھا "یار مس احمد کونسی برانچ میں گئی ہے۔"

"چھوٹی مارکیٹ والی برانچ میں۔"

"شکریہ۔" بس وہ فوراً ہی پلٹ لیا۔

لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا چھوٹی مارکیٹ کی طرف بازار کی وہ بھیڑ وہ ٹریفک اس کیلئے کس قدر بے معنی بن گیا تھا۔ چوراہے پر پہنچ کر اس نے سبز سرخ بتی کا لحاظ کئے بغیر کتنی تیزی سے سڑک کو عبور کیا۔ کتنی تیزی سے بینک کی عمارت میں داخل ہوا۔

"دیکھئے، یہاں ذکیہ احمد ہوتی ہیں؟"

"ذکیہ احمد؟" کاؤنٹر پہ بیٹھا کلرک اس نام سے آشنا نظر نہیں آتا تھا۔ قریب والے سے پوچھا "یار ذکیہ احمد کون ہے؟"

"مس احمد۔ ہاں وہ نئی نئی آئی تھی۔ مگر آتے ہی اُس نے چھٹی کی درخواست دے دی۔" پھر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "مسٹر وہ تو لانگ لیو پر ہیں۔"

"لانگ لیو پر؟" جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔

"یار چائے ختم کرو نا۔" کامریڈ کی آواز۔

"ہوں۔" اور ایک دم سے پھر میں اپنے صیغہ میں تھا۔ "ہاں یار میں واقعی دور چلا گیا تھا۔" اور میں نے سوچا کہ وہ دن اب واقعی کتنی دور چلے گئے ہیں۔

میں اب اسے اس طرح یاد کیوں نہیں کرتا۔ اب تو وہ بس ایک خوشگوار لیکن

جامدسی یاد بن کر رہ گئی ہے۔ میں اب اسے یاد کرکے نہ بیتاب ہوتا ہوں نہ اذیت محسوس کرتا ہوں۔ اس یاد میں بے تعلقی کا رنگ کتنا آگیا ہے۔ ان دنوں وہ تصور میں کتنی زندہ تھی۔ ہر دم ایک خیال کہ اب فون کی گھنٹی بجی اور اب اس کی آواز آئی اور میں کتنا بے قرار پھرتا تھا۔ ہر دم ایک دیوانگی طاری رہتی۔ کسی کے ساتھ وابستگی بھی آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ بس جیسے جون بدل گئی ہو۔ مگر شاید آدمی کی اصلی جون وہی ہوتی ہے۔ یا شاید میری اصلی جون وہی تھی۔ وہ دیوانگی کیا گئی کہ میں بھی چلا گیا۔ اب میں کہاں ہوں۔ اپنے گھر اور گھروالی کے ساتھ کھاتی پیتی زندگی بسر کرنے والا ایک دنیادار آدمی۔ یہ بھلا میں ہوں۔ یہ تو کوئی اور ہے۔ میں تو وہ تھا جو اُس وقت تھا۔ اب میں کوئی اور ہوں۔ "جبلی میں وہ چل اُٹھ کامریڈ"، میں اپنے جبلی میں سے خائف فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ممتاز یار، تم تو بہت بے مروت نکلے۔ کتنے دن تمہیں آئے ہوئے ہو گئے۔ آنے کے بعد اپنی رسید تو دی ہوتی۔"

"مت پوچھو یار، آنے کے بعد مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ اب کہیں جا کر تھوڑا اطمینان کا سانس لیا ہے۔ کامریڈ سے کتنی مرتبہ کہا کہ اخلاق کی طرف چلنا ہے۔ مگر اس کی تو اپنی موج ہوتی ہے۔"

"جانے بھی دے یار، کیوں گپ ہانک رہا ہے۔"

"اچھا خیر اور سناؤ۔ میرے ہوتے ہوتے تم مکان بنانے کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ اب کیا حال احوال ہے۔"

"یار ہم تو مکان بنا کے مشکل میں پھنس گئے۔"

"کیوں کیا ہو گیا؟"

"یار ہاؤس بلڈنگ والوں کا قرضہ تو بڑی جان لیوا چیز ہے۔ میں مہینے کے مہینے باقاعدہ قسط ادا کرتا ہوں۔ اس کے باوجود نوٹس آ گیا کہ اتنی رقم پندرہ دن کے اندر اندر ادا کرو ورنہ مکان نیلام کر دیا جائے گا۔ میری بیوی کے تو ہوش اُڑ گئے۔"

فاروق نے مجھے تعجب سے دیکھا "ہر مہینے قسط دیتے ہو؟"

"ہر مہینے طے شدہ تاریخ پر ایک دن اِدھر نہ ایک دن اُدھر۔"

"سن رہے ہو ممتاز۔" اُس نے ممتاز کو مخاطب کیا۔ "یہ میرا یار مہینے کے مہینے باقاعدگی سے قسط ادا کرتا ہے۔"

"کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔" ممتاز بولا "اخلاق کو تم جانتے نہیں ہو۔ اس سے تم اور کیا توقع کر سکتے ہو۔"

"پھر اُستاد شکایت کس بات کی کرتے ہو۔ مشکل کو تو تم نے خود دعوت دی ہے۔ ہم نے بھی مکان بنایا ہے اور تم سے زیادہ لمبا قرضہ لیا ہے۔ آج تک تو کوئی قسط ادا کی نہیں ہے۔"

"کوئی نوٹس نہیں آیا؟" میں نے تعجب سے فاروق کو دیکھا۔

"نہیں۔"

"اکٹھا آئے گا۔"

"بیشک آ جائے۔"

"بہت سود دینا پڑ جائے گا۔"

"پہلے وہ اصل تو مجھ سے وصول کر لیں۔"

"کیا فراڈ کیا ہے تم نے؟"

"بس طریقے ہوتے ہیں۔ آدمی اگر مکان بنائے تو اسے یہ طریقے بھی معلوم ہونے چاہئیں۔ ورنہ مکان تو پھر آدمی کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔"

"یار پھر ہمیں بھی یہ طریقے بتائے ہوتے۔ یہاں تو روز یہی رہتا ہے۔ آج ہاؤس بلڈنگ والوں کی طرف سے نوٹس۔ پرسوں کسی نجی قرضہ دینے والے کا تقاضا۔"

فاروق اس پر بہت ہنسا۔ کہنے لگا۔ "اُستاد ہماری شاگردی کرو۔ پھر ہم تمہیں قرضوں سے بچنے کے گر بتائیں گے۔"

میں پریشان ہو کر کبھی فاروق کو دیکھتا تھا۔ کبھی ممتاز کو۔ دونوں اس وقت مجھے کتنے دانا بینا نظر آ رہے تھے اور کامریڈ۔ وہ اس گفتگو سے لاتعلق سگریٹ پینے میں مگن تھا۔ آخر بولا "یار باتیں ہی کئے جاؤ گے۔ وہ سالی چائے شائے کہاں ہے۔"

"کامریڈ۔ تھوڑا صبر۔ آرڈر دیا ہوا ہے۔" ممتاز نے اسے دلاسہ دیا۔

"خالی چائے کا آرڈر؟"

"اور کیا چاہتا ہے یار۔"

"کامریڈ، اتنے بڑے ہوٹل میں لا کے بٹھا دیا اور خالی چائے پہ ٹرخاؤ گے۔ وہ سالے تم شیوخ کے بوٹ چاٹ کے جو دولت کما کے لائے ہو اس میں سے کبھی فقیروں پر بھی خرچ کیا کرو۔"

میں نے کامریڈ کو رشک سے دیکھا "یار کامریڈ، تم مزے میں ہو۔ نے غم دنیا نے غم کالا۔ نہ شادی کی نہ مکان بنایا۔"

"مکان؟" کتنی تحقیر تھی کامریڈ کے لہجہ میں۔ "آدمی نے مکان بنایا اور کام سے گیا۔" اور اس کے ساتھ ہی اُسے اپنی پارٹی کے کامریڈ یاد آ گئے "سالوں نے پلاٹ الاٹ کرائے اور مکان بنا لئے۔ کوٹھیاں بنگلے، موٹر کار، بیوی۔ دلے کے بچے چلے تھے انقلاب لانے کے لئے۔" تھوڑا رک کر "وہ سالا اپنا کامریڈ خورشید چکر چھوڑے

اور ایک تندوری روٹی، یہ اس کا نان قورمہ ہوا کرتا تھا اور کبھی کبھی بس ایک بند ایک چائے کا کوپ۔ مگر اب پورچ میں دو دو کاریں کھڑی رہتی ہیں۔ ایک کار صرف بچوں کو سکول سے لانے لے جانے کے لئے ہے۔ سالا انقلابی بنتا تھا۔"

"کامریڈ ظہور؟" میں نے لقمہ دیا۔

"کامریڈ ظہور!" کتنا منہ بگاڑ کر کامریڈ نے اس کا نام لیا۔ "اس کا سوشلزم تو کتابوں کے نیچے دب کر رہ گیا۔ پتہ ہے۔ میرے یار کا کیا پروگرام ہوا کرتا تھا۔ صبح ہی صبح ڈنڈ پیلے اٹھک بیٹھک کی۔ پھر لسی کا یہ لمبا گلاس غٹا غٹ چڑھایا۔ پھر مارکس کو لے کے بیٹھ گیا اور اس کے بعد وہ سالا فرانس کا بورژوا شاعر بادلیئر۔ ڈنٹر، لسی کا گلاس مارکس، بادلیئر۔ بھلا پوچھو ان کا آپس میں کیا جوڑ ہے۔ میں نے کہا کہ کامریڈ، اس وقت ہمیں کتابوں کی ضرورت نہیں ہے۔

انقلابی ایکشن کی ضرورت ہے۔ کہنے لگا کہ میں نے ایک انقلابی نظم لکھی ہے۔

میں نے کہا کہ دفعان ہو، اس سالی تمہاری شاعری نے تمہیں بے عمل بنا دیا ہے۔"

میں نے کہا کہ "کامریڈ، کیسی باتیں کرتے ہو۔ اس غریب نے کونسی غزل کہی تھی۔ انقلابی نظمیں ہی تو لکھی تھیں۔"

"ہوں انقلابی نظمیں۔ پانی میں چار قطرے دودھ کے ڈال دیئے جائیں تو وہ دودھ بن جائے گا۔ رہے گا تو پانی ہی۔ یہ سالی شاعری، ادب، یہ سب بورژوائی چکر ہے۔ لفظ، لفظ، لفظ، کامریڈ انقلاب میں تو گولی کام دکھاتی ہے۔ لفظوں سے تو پھلی بھی نہیں پھوٹتی اور ہمارے گریٹ کامریڈ سید صاحب کی سنو۔" کامریڈ کو اسی رو میں کامریڈ سید کلب حیدر کا خیال آگیا۔ "مشرقِ وسطیٰ میں بادشاہوں کے تختے اُلٹ رہے تھے، امریکی سامراج کا جنازہ نکل رہا تھا۔ میں گیا سید صاحب کے پاس کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ بتانے لگے کہ آج کل میں داغ پر کام کر رہا ہوں۔

میں نے حیران ہو کے کہا کہ وہ رنڈیوں کے کوٹھوں کا شاعر۔ انقلاب سے اس کا کیا تعلق ہے۔ سید صاحب مسکرائے۔ بولے، اس پر بات کریں گے۔ اس وقت تو ہم مجلس میں جا رہے ہیں۔ مجلس، میں ہکا بکا رہ گیا۔ بولے کہ ہاں قبلہ و کعبہ نقن صاحب آئے ہوئے ہیں۔ میں نے دبے لفظوں میں کہا کہ سید صاب، یہ مذہب کا جو جھمیل ہوتا ہے۔ بات کاٹ کے بولے، نہیں بھائی، یہ مذہب نہیں کلچر ہے۔ میں نے جل کے کہا کہ سید صاب، یہ تو لکھنؤ کا DECADENT کلچر ہے۔ اس کا دھرتی کے VIRILE کلچر سے کیا تعلق ہے۔ سید صاب جھینپ گئے۔ مسکرا کے بولے کہ کامریڈ آج تم انگریزی میں بہت رواں ہو۔"

"یار کامریڈ، بس کر، تقریر بہت لمبی ہو گئی۔" آخر ممتاز نے بیزار ہو کر کہا۔

"انقلاب کی رام کہانی بہت ہو گئی۔ اب کوئی اور بات ہونی چاہیئے۔" فاروق نے تائیدی لہجہ میں کہا۔

مگر کامریڈ تو خود ہی چپ ہو گیا تھا۔ ایک دم سے چپ اور پھر جیسے گہرے خیال میں ڈوب گیا ہو۔ پھر لمبا ٹھنڈا سانس بھرا۔ "پارٹی میں بس ایک نگ تھا۔ دادا منصور۔ کیا نر آدمی تھا۔ لینن بھی اس کا لوہا مانتا تھا۔"

"لینن؟" ہم سب چونکے اور محظوظ ہوئے۔

"ہاں لینن۔ دادا کی لینن سے ملاقات ہوئی تھی۔ پھر بعد میں لینن نے دادا کو خط بھی لکھا تھا۔ ان سالوں میں سے کسے لینن نے گھاس ڈالی تھی۔ یہ اس کے سامنے جاتے تو ان کی تو گھگھی بندھ جاتی اور لینن بھی انہیں ٹھڈے مار کے نکال دیتا کہ دفع ہو جاؤ، دلو کے بچو۔ تم لاؤ گے انقلاب۔ یار تم نے دادا کو دیکھا تھا؟"

"میں نے دیکھا تھا۔" ممتاز نے کہا "ڈھل ڈھل اچکن، بٹن اوپر سے نیچے تک کھلے ہوئے، ملا دلا پائجامہ۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی۔"

"بالکل ٹھیک"، کامریڈ نے تصدیق کی" بالکل یہی حلیہ تھا۔ وہ تو فقیر آدمی تھا ان میں سے کس نے ایسی درویشانہ زندگی گذاری ہے"

"یار وہ زمانہ ہی ایسا تھا" ممتاز کہنے لگا۔ "لوگوں میں ابھی درویشی باقی تھی۔ ایک دفعہ کی سنو، رات کے کوئی تین بجے ہوں گے۔ میں میٹرو سے کیبرے دیکھ کر اپنی سائیکل پہ گھر جا رہا تھا۔ لوہاری دروازے کی طرف سے گذرا۔ یہاں سے وہاں تک اندھیرا۔ فٹ پاتھ پہ ایک چائے والا بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد تانگے والے بیٹھے پیالوں میں چائے پی رہے تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بیچ میں ناصر کاظمی بیٹھا ہے اور رواں ہے۔ میں حیران کہ یار ابھی تو یہ بندہ میٹرو میں اینجلا کا کیبرے دیکھ رہا تھا۔ ابھی مجھ سے پہلے یہاں پہنچ گیا۔ کیا اڑ کر آیا ہے"

"اینجلا۔ واہ سبحان اللہ"، فاروق بیساختہ بولا۔

"بس اس کے جانے کے ساتھ یہ شہر ویران ہو گیا"

کامریڈ نے جھرجھری لی" کامریڈ، عورت اس شہر میں بس ایک تھی۔ تم سالوں نے دادا کو نہیں دیکھا۔ اسے کہاں دیکھا ہو گا"

"کون تھی بے" فاروق نے پوچھا۔

کامریڈ نے کانوں کے قریب منہ کر کے اس کا نام لیا۔ فاروق نے فوراً تردید کی "نہیں یار۔ آج کل تو میں روز اُسے دیکھتا ہوں"

"اب اسے کیا دیکھنا ہے۔ ان دنوں دیکھا ہوتا۔ میں یوں تو انجمن کے جلسوں میں جاتا نہیں تھا۔ سالوں کو انقلاب کے لئے جو ورک کرنا چاہئیے تھا وہ تو کرتے نہیں تھے۔ ادب پہ بے فضول بحثیں کرتے رہتے تھے۔ بس اسے دیکھنے کے لئے میں اِدھر جا نکلتا تھا۔

"یار ہم میں سے کسی نے قائد اعظم کو بھی دیکھا تھا" ممتاز نے اچانک سوال

اُٹھایا" اخلاق، تم نے تو دیکھا ہو گا"

"نہیں یار۔ میں نے تو ہوش سنبھالنے کے ساتھ فیلڈ مارشل ایوب خاں ہی کو دیکھا۔ پھر یحییٰ خاں کو دیکھا۔ پھر ——"

"مگر دادا منصور کو نہیں دیکھا؟" کامریڈ نے بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں"

"کامریڈ، تم نے دادا کو دیکھ لیا ہوتا تو آج تم اتنے بے فضول قسم کے رجعت پسند نہ ہوتے"

"یار وہ زمانہ اچھا تھا" ایک مرتبہ پھر اس زمانے کو ممتاز نے ایک ناسٹلجیائی کیفیت کے ساتھ یاد کیا۔

"بس جب تک دادا زندہ رہے۔ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی ہمارا تو بھٹا بیٹھ گیا۔ سالا زمانہ ہی بدل گیا"

"کامریڈ" اب کونسا زمانہ جا رہا ہے"

"یار یہ پوچھو کہ کونسا زمانہ آنے والا ہے"

"ہاں بتاؤ"

"بھنبھل بھوسا"

"اور کامریڈ، تمہارا انقلاب؟"

"انقلاب کون لائے گا" فاروق نے طنزیہ کہا" سالے تمہارے کامریڈوں نے تو سوشلزم کو بیچ کھایا"

"کامریڈ تم مت بولو"

"کیوں نہ بولوں" فاروق نے تھوڑی برہمی سے کہا۔

"اس لئے کہ تم اسلام کو بیچ رہے ہو"

فاروق فوراً ہی گرم ہوگیا۔

"کامریڈ اس میں گرم ہونے کی کیا بات ہے۔" کامریڈ نے فوراً ہی ٹکڑا لگایا۔ "یہ تو اپنا اپنا کاروبار ہے۔"

دونوں میں گرمی سردی ہونے لگی تھی۔ میں نے اور ممتاز نے تو تو میں میں کی تب کہیں جا کر دونوں چپ ہوئے ورنہ اس شام کا مزہ بالکل ہی کرکرا ہو جاتا۔ مزہ کرکرا یوں بھی ہوا۔ اس کے بعد فاروق جتنی دیر بیٹھا اکھڑا اکھڑا رہا۔ جو بات کی تلخی کے لہجہ میں کی۔ آخر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیوں جا رہے ہو؟"

"ہاں یار، اس وقت میں موڈ میں نہیں ہوں۔"

میں نے بہت احتجاج کیا۔ "یار اتنے دنوں بعد تو ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔ اتنی جلدی اکھڑنے کی نہیں ٹھہری تھی۔ میں تو ایک بھرپور رتجگے کی نیت سے آیا تھا۔"

"تم رتجگا کرو۔ کون روک رہا ہے۔ مگر میری طبیعت رتجگے کے لئے حاضر نہیں ہے۔"

اس کے بعد ہم تینوں نے اس بات کو یکسر نظر انداز کر کے اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کیں۔

کامریڈ چائے کی فرمائش سے شروع ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے کر کے وہ ممتاز کو ڈنر تک لے آیا "کامریڈ، اب تو کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ کچھ کھایا پیا جائے۔"

"کھا لے یار جو کھانا ہو۔"

"یوں نہیں پورا ڈنر ہوگا۔"

ممتاز نے کامریڈ کی یہ تجویز بھی مان لی مگر پھر بھی سبھا جس طرح جمنی چاہیئے تھی۔ جم نہیں سکی۔ گئے دن واپس نہیں آیا کرتے اور جو سبھا ایک مرتبہ اکھڑ جائے وہ دوبارہ

نہیں جا کرتی۔ ہم کھانا کھانے کے بعد ہوٹل سے نکل لئے کہ باہر کی تازہ ہوا اور رات کی ٹھنڈک کے اثر سے طبیعت رواں ہوگی۔ یہ ہمارا آزمودہ نسخہ تھا۔ ان دنوں یہی ہوتا تھا۔ کافی اور چائے پی پی کر جب ہم حال سے بے حال ہو جاتے اور ادھر کافی ہاؤس بھی بند ہونے لگتا تو ہم نکل کھڑے ہوتے۔ بے طے کئے کہ کدھر جانا ہے اور کہاں جا کر ڈیرا کرنا ہے۔ اپنی لہر میں کبھی اس راہ کبھی اس راہ۔ کبھی لمبے فٹ پاتھ پر اہلے گہلے، کبھی بیچ سڑک پر خراماں رات بھیگنے کے ساتھ ٹریفک یوں ہی چھدرا ہوتا چلا جاتا، رفتہ رفتہ نہ ہونے کے برابر رہ جاتا۔ دکانیں یہاں سے وہاں تک بند۔ منور کھمبوں تلے جگمگ جگمگ کرتی خالی خاموش سڑک۔ فٹ پاتھ پر کچھ اندھیرا کچھ اُجالا۔ ذرا موڑ مڑے تو منور کھمبے غائب۔ جیسے شہر بے چراغ میں چل رہے ہیں۔ کسی مقفل دکان کے آگے سڑک کے کنارے کوئی پان سگریٹ والا اپنی ٹمٹماتی دھوئیں سے رچی لالٹین کی روشنی میں اونگھتا جاگتا کسی شب بیدار گاہک کا منتظر۔ آگے تھوڑا اندھیرا۔ پھر موڑ آتے ہی روشنی کا ایک جزیرہ کہ بازار یہاں جاگتا ہے۔ گویا دن نکلا ہوا ہے۔ کوئی پان سگریٹ کوکا کولا کی رنگ برنگی دکان کوئی تکے کباب کا ہوٹل، کوئی چائے خانہ دھوئیں سے اور چائے کے دھتیوں سے بھرا ہوا، فلمی ریکارڈوں کے شور سے گونجتا ہوا۔ آگے چار قدم چل کر پھر اندھیرے کا دور دورہ۔ خاموشی کا ڈیرا۔ خالص رات کا ظہور۔

"یار میں چلا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" میں نے ممتاز کو تعجب سے دیکھا۔

ممتاز نے کلائی پر لگی گھڑی کو دیکھا۔ بولا۔ "یار بات یہ ہے کہ اس وقت ایک اوورسیز کال آنی ہے۔ مجھے جلدی گھر پہنچنا چاہیئے۔"

"سالے تم تو پکے بزنس مین ہو گئے۔"

"بھائی زندگی میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

اور مزید بحث میں اُلجھے بغیر ممتاز تیزی سے ہوٹل کی طرف چلا۔ کار میں بیٹھا اور تیزی سے ہمارے قریب سے موٹر نکال کرلے گیا۔ ہمارا آزمودہ نسخہ اپنی تاثیر کھو بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ رات کا جادو ان راتوں تک تھا۔ دنوں کی طرح راتوں کی رنگت بھی تو اب بدل چکی تھی۔ ابھی تک ٹریفک کی اتنی ہی ریل پیل تھی۔ اتنا ہی بے ہنگم شور رکشاؤں کا سکوٹروں کا، بھاری بھر کم ٹرکوں کا۔ اس شور نے کوک بھی اطمینان سے نہیں پینے دیا۔ اس پر دکان میں ڈسکو کے کیسٹ کا شور مستزاد۔

"ہاں یار، اب چلنا ہی چاہیے" پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا "فراڈیا۔ سمجھتا ہے کہ کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے"

"کسے کہہ رہے ہو"

"فاروق کو اور کسے" اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔

"شکر ہے تمہیں گھر واپس آنا یاد تو آیا"

"زبیدہ ایسی زیادہ رات تو نہیں ہوئی۔ مگر اتنے دنوں بعد چار دوست اکٹھے ہوئے تھے۔ بہت جلدی بھی واپس نہیں آیا جا سکتا تھا"

"ہاں تم تو وہاں دوستوں کے ساتھ بے فکر بیٹھے ہو گے۔ یہاں میرے دل میں ہولیں اُٹھ رہی تھیں"

"ہولیں اُٹھ رہی تھیں؟ —— وہ کیوں؟ —— شہر کے حالات ابھی اتنے تو خراب نہیں ہوئے ہیں"

بوجان کہ نماز کی چوکی پر بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھیں تسبیح اور دعا سے اک عجلت کے ساتھ

فارغ ہو کر آئیں اور جلدی سے زبیدہ کو ٹوکا "بس بھی کرو دلہن۔ پھر وہی ذکر لے بیٹھیں۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "اللہ بری گھڑی سے بچائے لکھے اور دلہن سے تو میں نے کتنی مرتبہ کہا کہ دلہن جب دونوں وقت مل رہے ہوں تو انگنائی میں کھلے سر مت پھرا کرو اور آج تو ویسے بھی جمعرات تھی۔ بھلا پچھواڑے والی دیوار کی طرف جانے اور اس طرف جھانکنے کی کیا ضرورت تھی"

"کیوں، کیا بات ہوئی" میں نے چکرا کر بوجان کو اور پھر زبیدہ کو دیکھا۔

"کچھ نہیں ہوا۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ سب دلہن کا وہم ہے"

"بوجان، آپ اسے وہم کہہ رہی ہیں۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے"

میں حیران "کیا دیکھا ہے آنکھوں سے"

بیگم کچھ کہنے لگی تھی کہ بوجان نے بیچ میں بات کاٹی "اے دفع کرو دلہن۔ رات زیادہ ہو رہی ہے۔ جاؤ آرام کرو۔ جو بات کرنی ہے صبح کو کرنا"

بوجان نے ہمیں ہمارے کمرے میں دھکیلا۔ خود جانماز کی چوکی پر جا کر جانماز لپیٹنے لگیں۔

بستر میں آرام سے لیٹنے کے بعد میرے پوچھنے پر زبیدہ نے رکتے رکتے ڈری سی آواز میں اپنی واردات سنائی "میں نے پچھواڑے والی دیوار کے اِدھر جو جھانکا تو نظر وہاں جا پڑی جہاں پھانسیاں پڑی تھیں۔ کیا دیکھتی ہوں کہ برابر برابر تین آدمی کھڑے ہیں۔ یہ لمبے، بانس کے بانس۔ سفید کفنیاں پہنے ہوئے اور جیسے انہوں نے تاڑ لیا ہو کہ میں ان کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ میرا دم ہی تو نکل گیا۔ بھاگی چیخ مار کے بوجان گھبرا کے باہر نکل آئیں۔ کیا ہوا دلہن۔ میری تو گھگھی بندھ گئی۔ بوجان نے قرآن کی ہوا دی۔ آیۃ الکرسی پڑھ کے دم کیا، تب کہیں مجھے ہوش آیا۔ نہیں تو میں تو گئی تھی"

اس کے بعد زبیدہ چپ۔ جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

ایک وقفہ کے بعد میں نے پوچھا "بس؟"

"ہاں بس"

"مگر ایک بات تو بوجان نے صحیح کہی۔ آخر اب ادھر جا جا کر جھانکنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب وہاں کونسا تماشا ہو رہا ہے"

"میں کہاں اُدھر جا جا کے جھانکتی ہوں۔ مجھے تو اُدھر جانے کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ مگر پتہ نہیں آج شام کو مجھے ہوا کیا۔ بس ایسا لگا جیسے کوئی مجھے کھینچ کے اِدھر لئے جا رہا ہے"

اسی گھڑی باہر سے تالی کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ بوجان بیچ صحن میں کھڑی کچھ پڑھنے پھونکنے کے ساتھ تالی بجا رہی تھیں۔ باری باری چاروں سمتوں میں منہ کر کے پہلے کچھ پڑھا، پھر پھونک ماری، پھر تالی بجائی۔ پچھواڑے والی دیوار کی طرف رُخ کر کے زیادہ زور سے پھونکا، زیادہ زور سے زیادہ دیر تک تالی بجائی۔

"جاگتے رہو"۔۔۔ دور سے آتی جیل کے پہریدار کی آواز سے مجھے احساس ہوا کہ رات بہت گزر گئی ہے۔ زبیدہ بے خبر سو رہی تھی، ہلکے ہلکے خراٹوں کے ساتھ۔ یوں ہی مجھے خیال آیا کہ وہم زبیدہ کو ہوا تھا اور جاگ میں رہا ہوں۔ اسی آن برابر کمرے سے بوجان کی پریشان آواز سنائی دی "ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو؟"

میں لپک کر ان کے کمرے میں گیا۔ دیکھا کہ سوتے سے اٹھ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ ارے ارے کیا کر رہے ہو"

"بوجان کیا بات ہے" میں نے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

بوجان نے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ایک دم سے چپ ہو گئیں۔ مجھے دیکھتی رہیں۔ پھر لیٹ گئیں "کچھ نہیں"

"بوجان"

"نہیں، کچھ نہیں" اور فوراً ہی سو گئیں۔ فوراً ہی خراٹے بھی لینے لگیں۔

واپس اپنے کمرے میں آیا۔ روشنی بجھاتے بجھاتے زبیدہ پر ایک نظر ڈالی۔ اسی طرح بے خبر سو رہی تھی۔ لیٹ گیا۔ کروٹیں بدلنے لگا۔ یوں ہی خیال آیا کہ اس وقت کیا بجا ہو گا، کتنی رات گذر گئی، کتنی رات باقی ہے۔ مگر پتہ کیسے چلتا۔ اس وقت قریب میں گھڑی بھی نہیں تھی۔ دور کی آوازوں پر کان لگائے کہ ان سے رات کے اوقات کا شاید کچھ اندازہ ہو جائے۔ مگر اس وقت کوئی آواز ہی نہیں تھی، پہریدار کی آواز بھی نہیں۔ بس ایک سناٹا۔ مگر پھر یوں لگا کہ جیسے دور بہت دور بہت سے لوگ غل مچا رہے ہوں۔ جیسے شہر کی ساری خلقت گھروں سے نکل کر باہر گلیوں بازاروں میں اُمنڈ رہی ہو۔ کیا واقعی شہر میں کوئی بلوہ ہو گیا ہے۔ کیا واقعی؟ مگر جب دوبارہ کان دور کی آوازوں پر لگائے تو کوئی آواز نہیں تھی۔ پھر ایک سناٹا اور بس۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ پڑا رہا اسی طور دم سادھے۔ کتنی دیر بعد اچانک کہیں دور سے مرغے کی بانگ سنائی دی۔ یہ بانگ سُن کر کس طرح جان میں جان آئی۔ ایک اطمینان سا ہوا کہ اب تو صبح ہو رہی ہے۔ پھر حیران ہوا کہ اچھا صبح ہونے لگی ہے جیسے یہ خلافِ توقع واقعہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی کہیں قریب کی سڑک پر تانگے کے چلنے کی آواز سنائی دی اور اس آواز میں ملی جلی کسی موٹر کے ہارن کی آواز۔ کہیں بہت دور سے رکشا کے تیز دوڑنے کی آواز۔ پھر تو آوازوں کا ایک ریلا سا آ گیا۔ موٹروں کے ہارن، تیز دوڑتی رکشاؤں کا شور، تانگوں، ریڑھوں کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ۔ واقعی یہ تو صبح ہو رہی ہے اور اچانک

چڑیوں کا ایک میٹھا میٹھا شور اُٹھا۔ شاید ہمارے گھر کے آس پاس کے درختوں میں بسیرا کرنے والی سب چڑیاں ایک دم سے جاگ اُٹھی تھیں۔

اُٹھ کر بستر میں بیٹھ گیا۔ کمرے میں باہر سے بہت ہلکا ہلکا اجالا چھن کر آرہا تھا زبیدہ پر ایک نظر ڈالی کہ اسی شان سے بے خبر سو رہی تھی۔ اسی طرح ہلکے ہلکے خراٹے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عجب بات ہے۔ وہم زبیدہ کو ہوا تھا، رات آنکھوں میں میری کٹ گئی۔ جماہی لی اور لیٹ گیا۔ میری آنکھوں میں نیند پھولنے لگی تھی۔

۹

جب میں نے ڈیوڑھی سے قدم نکالا تو شہر بدل چکا تھا۔ میں نے دیکھا اور میں حیران ہوا کہ دہشت نے ڈیرا تو میرے گھر میں کیا تھا، یہ شہر کو کیا ہو گیا۔ شہر کبھی کبھی آناً فاناً بھی بدلتے ہیں، اس رنگ سے کہ کہنے کو کچھ بھی نہیں بدلتا مگر سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اور میں ایک ہی وقت میں دو دفعہ حیران ہوا۔ میں نے ڈیوڑھی سے دھڑکتے دل کے ساتھ قدم باہر رکھا۔ دل کو ایک دھڑکا لگا ہوا تھا کہ جانے باہر کیا نقشہ ہو۔ شاید سب کچھ تلپٹ ہو چکا ہو۔ میں نے اردگرد نظر ڈالی اور حیران ہوا کہ سب کچھ اسی طرح تھا۔ زندگی کا کاروبار معمول کے مطابق جاری تھا۔ مایوسی ہوئی کہ یک قلم سارے ہی اندیشے باطل ہو گئے۔ اطمینان ہوا کہ سو بھی اچھا ہوا کہ کچھ نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ میں نے دیکھا اور حیران ہوا کہ یہ تو سب کچھ بدل گیا ہے۔ اور میں حیران ہوا کہ اچھا شہر یوں بھی بدلا کرتے ہیں کہ آن کی آن میں سب کچھ بدل جائے اور یوں کچھ بھی نہ بدلے۔ میں نے ایک بار پھر اردگرد نظر ڈالی حیرت سے اور دہشت سے۔ یہ تو وہ شہر ہی نہیں ہے جو ہوا کرتا تھا۔

زندگی کا کاروبار معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ بسیں، منی بسیں، موٹر، سکوٹر، رکشا، تانگے، ریڑھے، سب سواریاں اپنی اپنی چال چل رہی تھیں۔ سوار اپنی راہ، پیادے اپنی راہ۔ پھر بھی مجھے ایک شک ہوا کہ کہیں چال میں کچھ فرق آگیا ہے۔ یا شاید فضا میں کچھ ہے۔ شاید ایک تناؤ۔ کتنے چہرے صاف صاف تنے ہوئے نظر آرہے تھے۔

میں ڈر گیا۔ دل میں کہا کہ شہر غصے میں ہے۔ پتہ نہیں کب اُبل پڑے۔ ڈرے ہوئے دل کے ساتھ میں نے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا اور آس پاس چلنے والوں کی چال کو۔ میں رنجیدہ ہوا۔ دل میں کہا کہ شہر کرب میں ہے۔ مگر گھڑی نہ گزری تھی کہ میں نے چہروں پر طرف کی ایک لکیر دیکھی۔ میں افسردہ ہو گیا۔ دل میں کہا کہ شہر اصل میں دہل گیا ہے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر رہا ہے، اندر سے ہل گیا ہے۔

ایک ضمیمہ والا سائیکل تیزی سے دوڑاتا ہوا آیا صدا لگاتا ہوا۔ مجھ سے چار قدم آگے جا کر رک گیا۔ کتنے لوگ تیزی سے اس کی طرف لپکے۔ اس ضمیمہ نے تو شہر کی کایا پلٹ دی تھی اور صبح سویرے نکلنے والے سب اخباروں کو دم کے دم میں بے معنی بنا دیا تھا۔ میں نے بھی بڑھ کر ایک ضمیمہ خرید لیا۔ یہ ضمیمہ میں صبح پڑھ چکا تھا مگر اس وقت رواروی میں پڑھا تھا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ صبح کو ذرا آنکھ لگی تھی۔ زبیدہ نے آ کر جھنجھوڑا:

"اخلاق اٹھو۔ دیکھو تو سہی یہ ضمیمہ والا کیا چلا رہا ہے؟"

اور میرے اٹھنے کا انتظار کیے بغیر ڈیوڑھی کی طرف لپکی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں ابھی تک نیند بھری تھی۔ زبیدہ ایک ورق لے کر آئی۔ سخت بوکھلائی ہوئی تھی۔

"دیکھو تو سہی۔ یہ کیا لکھا ہے؟"

میں نے زبیدہ سے ضمیمہ لے کر پڑھا۔ آنکھوں سے ساری نیند ایک دم سے غائب ہو گئی۔ زبیدہ اس توقع میں میرے بالکل پاس آن بیٹھی تھی کہ میں کچھ کہوں گا، تبصرہ کروں گا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ کلی کی، دانت مانجھے، غرارے کیے، نہایا دھویا۔ باتھ روم میں آج کچھ زیادہ ہی وقت صرف ہوا۔ نہا دھو کر نکلا تو ناشتہ کی میز پہ جا بیٹھا۔ ناشتہ کرتا رہا۔ زبیدہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس وقت کتنا بول رہی تھی۔ مجھے چپ دیکھ کر اسے بھی چپ لگ گئی۔ ہاں جب میں چلنے لگا تو آہستہ سے ایک ہدایت کی:

"دفتر میں کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور دفتر سے سیدھے

گھر آنا۔"

بوجان جو دیر سے تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں اٹھ کر قریب آئیں۔ سر پہ ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھا، پھونکا:

"جاؤ۔ اللہ کی امان میں دیا۔ گھر جلدی آ جانا۔ اور دلھن ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں خود ہی کسی سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ گھر میں کسی سے کوئی بات نہیں کی تو باہر آ کر کیا کرتا۔ اور دفتر میں تو فضا ایسی تھی کہ مجھے اور چپ لگ گئی۔ دفتر میں اس دن دفتر والی فضا ہی نہیں تھی۔ کسی میز پہ فائل کھلا ہوا نہیں تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ چائے چل رہی ہو اور گپ شپ ہو رہی ہو۔ جو بھی تھا اکھڑا اکھڑا سا بیٹھا تھا۔ کسی نے منہ سے سگریٹ لگائی ہوئی ہے اور بس منہ سے دھواں اڑائے جا رہا ہے۔ کوئی بڑے انہماک سے ضمیمہ پہ نظریں گاڑے ہوئے۔ کوئی کوئی قریب کی سیٹ والے کے ساتھ سرگوشی میں باتیں کرتا ہوا۔ ایک میز کے قریب انبساط کی ایک لہر پھوٹی۔ کسی نے بلند آواز میں کہا:

"خس کم جہاں پاک"۔

کتنی غصیلی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ وقفہ۔ کوئی غصیلی آواز میں دانت کچکچاتے ہوئے بڑبڑایا: "حرامزادے"۔ خاموشی۔ فضا میں اچانک ایک تناؤ آ گیا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ تھوڑا دفتری کام نبٹا دیا جائے مگر اس کشیدہ فضا سے میں اکھڑ گیا۔ بس فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"رحمت۔ اگر باس کی طرف سے بلاوا آ جائے تو کہہ دینا کہ ان کی طبیعت خراب ہو گئی، گھر چلے گئے ہیں"۔

"اچھا صاب"۔ پھر قریب آ کر آہستہ سے "بہت برا ہوا صاب"۔

"ہاں۔" میں نے بے تعلقی سے کہا اور دفتر سے نکل لیا۔

دفتر سے نکل تو آیا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جانا چاہیے۔ قدم گھر کی طرف اٹھنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ بس یوں ہی چلنے لگا۔ اس وقت سڑکوں کا عجب نقشہ تھا۔ لوگ غائب، پرچھائیاں چل رہی تھیں۔ برابر سے کئی رکشائیں گذریں، خالی، اپنی برق رفتاری سے محروم۔ دیر بعد ایک بس گذری مگر اپنی برائے نام سواریوں کے ساتھ کتنی ہلکی ہلکی نظر آ رہی تھی۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟ میں نے چلتے چلتے سوچا اور پھر ممتاز کے دفتر کی طرف ہو لیا۔

"آؤ۔" ممتاز نے کتنے بجھے لہجے میں میرا خیر مقدم کیا۔ سگریٹ کی ڈبیا میری طرف خاموشی سے بڑھا دی۔ اسی خاموشی سے میں نے سگریٹ سلگائی اور لمبے لمبے کش لیے۔

"باہر کیا حال ہے؟" دیر بعد اس نے بظاہر ایک سادگی سے پوچھا۔

"حال؟" میں گڑبڑا گیا۔ "یار کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پچھلے دنوں کتنا شور رہا ہے کہ پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔ اور آج اتنی خاموشی۔"

"وہ شور جھوٹا تھا۔ یہ خاموشی سچی ہے۔"

"لوگوں کا اس طرح چپ ہو جانا.....۔"

اور میں نے دیکھا کہ ممتاز میری طرف پوری طرح متوجہ ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ سننا چاہتا ہے لیکن میرے لیے تو یہ ایک فقرہ پورا کرنا ہی دوبھر ہو گیا تھا۔

"یار، رات اپنی صحبت اچھی رہی۔ کتنے دنوں بعد ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ دوسرا ذکر نکلا:

"مگر یار تم لوگ جلدی اکھڑ گئے۔ میں تو رتجگے کی سوچ کر آیا تھا۔"

"رتجگا۔" ممتاز تھوڑا افسردہ ہو گیا۔ "ہاں یار۔ اپنے وہ رتجگے تو خواب و خیال ہو گئے۔ مگر خیر اکٹھے ہونے کی ایک تقریب تو پیدا ہوئی۔ بہت لطف آیا۔"

"ہاں۔ لطف تو آیا۔ بلکہ کل بہت دنوں کے بعد مجھے رات خوبصورت نظر آئی۔ اور شہر بھی۔ تمہارے چلے جانے کے بعد بھی میں اور کامریڈ کچھ دیر تک آوارہ پھرتے رہے۔ بھیگتی رات کے اندھیرے اجالے میں شہر اچھا لگ رہا تھا۔ اگرچہ اب اس شہر میں اندھیرا کتنا رہ گیا ہے۔ ان سالی روشنیوں نے رات سے اس کا جادو چھین لیا ہے۔ پھر بھی خیر..... مگر یار جب صبح میں گھر سے نکلا تو شہر بدل چکا تھا۔"

"ہوں۔" ممتاز سوچ میں پڑ گیا۔ "شہر کا اس طرح اچانک بدل جانا.....۔"

میں انتظار کرتا رہا کہ ممتاز آگے کچھ کہے گا۔ مگر وہ چپ ہو گیا تھا۔

"ہاں۔ اس طرح شہر کا اچانک بدل جانا.....۔"

پھر میں بھی چپ ہو گیا۔ گفتگو کے موڑ پہ آ کر ہم دونوں پھر الجھ گئے تھے۔

ایک دم سے کامریڈ داخل ہوا۔ گلے سے تھیلا اتار کر میز پہ پٹختے ہوئے بولا:

"یار چائے پلواؤ۔"

ظہور بھی کہ تھوڑا پیچھے رہ گیا تھا منہ سے لگے اپنے پائپ کے ساتھ داخل ہوا:

"ظہور تم..... تم کہاں؟"

"یہیں۔ جہاں تم دیکھ رہے ہو۔" ظہور نے اپنی اسی پرانی انٹلکچوئل سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

ممتاز نے بیل دے کر چپراسی کو بلایا:

"صادق۔ چائے لاؤ۔ اور سناؤ باہر کیا حال ہے؟" یہ کہتے کہتے اس نے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس کامریڈ کی طرف کھسکا دی۔

"مت پوچھو۔" کامریڈ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا: "لوگ غصے میں ہیں۔"

"غصے میں؟" میں نے حیرت سے کامریڈ کو دیکھا۔ "مجھے تو لگتا ہے لوگ سہم گئے ہیں۔"

کامریڈ نے غصے سے مجھے دیکھا: "تم سالے سدا کے بورژوا ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر انٹیلکچوئل گفتگو کرنے والے۔ تم لوگوں کو کتنا سمجھتے ہو۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ۔" ظہور نے زبان کھولنے کے ساتھ ہی پائپ کو کرید کر سلگانے کا عمل شروع کر دیا۔ اور میں اور ممتاز دونوں کامریڈ کو نظر انداز کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پائپ کا ایک گھونٹ لینے کے بعد گھمبیر لہجہ میں بولا: "آج کی کیفیت دیکھ کر اخلاق کو جو مغالطہ ہوا ہے وہ کل تک دُور ہو جائے گا۔"

"کل تک؟" ممتاز نے تعجب سے ظہور کو دیکھا۔

"ہاں، کل تک"۔ اور ایک پیغمبرانہ شان کے ساتھ اعلان کیا: "یہ تاریخی وقت ہے۔ ہم انقلاب کی دہلیز پہ کھڑے ہیں۔"

اتنے میں فاروق آن پہنچا۔ روایتی علیک سلیک۔ اور فوراً ہی شروع ہو گیا:

"یار عمران خان نے تو کمال کر دیا۔"

کتنی دیر تک بولے چلا گیا اور میچ پہ جو ان دنوں جاری تھا بھرپور تبصرہ کر ڈالا۔ پاکستانی ٹیم کی کارکردگی پہ وہ کتنا مسرور تھا۔

"کامریڈ، تم کچھ نہیں بول رہے"۔ ممتاز نے کامریڈ کو تھوڑا چھیڑا۔

"آج فاروق کا دن ہے" کامریڈ کے لہجہ میں کتنا غصہ تھا۔

فاروق نے ایک قہقہہ لگایا: "کامریڈ کیا بولے گا۔ یہ اس کا میدان نہیں ہے"۔ اور وہ پھر کرکٹ پہ رواں ہو گیا۔

"چلو کامریڈ چلیں"۔ کامریڈ نے ظہور کو ٹھوکا دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں کو جاتے دیکھ کر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم بھی جا رہے ہو؟"

"ہاں یار"۔ فاروق کی بے تکان تقریر سے بور تو میں بھی ہو گیا تھا۔

باہر نکل کر کامریڈ اُبل پڑا: "حرام کا پیسہ آ گیا ہے۔ دونوں سالوں کی آنکھوں پہ چربی چڑھ گئی ہے۔ ضمیر بیچ کھایا ہے"۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا: "کامریڈ، تم یہاں کیا لینے آئے تھے؟"

"تم بھی تو آئے تھے۔ تم کیا لینے آئے تھے؟"

"میں تو اُلّو کا پٹھا ہوں"۔ کامریڈ نے غصے سے کہا۔

"یہ تو کوئی انکشاف نہیں ہے"۔

کامریڈ میرے اس فقرے کو پی گیا۔ پھر اس نے دوسری ہی بات کی: "کوئی بات نہیں ان سب سالوں سے حساب لیا جائے گا۔ کسی سالے کی گردن پہ سر سلامت نہیں رہے گا۔ مستقبل ہمارا ہے"۔

"یعنی مستقبل کے ظالم تم ہو"۔

کامریڈ نے مجھے لال پیلی نظروں سے دیکھا: "کامریڈ، کبھی کبھی مجھے تم پہ بھی شبہ ہوتا ہے کہ سالے تم بھی کہیں بِک تو نہیں گئے ہو؟"

"یار کامریڈ، تمہیں تو اپنے سوا ہر آدمی بِکا ہوا نظر آتا ہے"۔

"ہاں۔ میں صرف اپنے بارے میں جانتا ہوں۔ باقی کسی کے بارے میں اطمینان سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ وہ وقت ہے کہ آدمی اپنے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا"۔

"اپنے سوا"۔ اور اب میں بھی کسی قدر سنجیدگی سے کامریڈ سے مخاطب ہوا: "اپنی ذات کے بارے میں اتنے وثوق سے صرف تم کامریڈ لوگ ہی بات کر سکتے ہو"۔

"اس لیے کہ"۔ ظہور بولا۔ "ہم تم لوگوں کی طرح مریضانہ داخلیت کی الجھنوں میں گرفتار نہیں ہیں"۔

"بالکل ٹھیک"۔ کامریڈ نے پُرزور لہجہ میں تائید کی۔ آج ان دونوں میں کتنا اتحاد نظر آ رہا تھا۔ کامریڈ نے ظہور کے خلاف اپنے سارے شکوک کو دفعتاً معطل کر دیا تھا۔

ظہور نے میری بات کا جواب دیتے دیتے کامریڈ کی طرف رخ کیا: "مگر کامریڈ۔ یہ مت بھولو کہ ایسے حالات میں آدمی کو کبھی کبھی خود پتہ نہیں چلتا کہ وہ بک چکا ہے"۔

کامریڈ ظہور کا منہ تکنے لگا۔ "بھنبل بھوسا"۔ آہستہ سے کہا اور چپ ہو گیا۔

پھر ہم کتنی دیر تک چپ رہے۔ نہ بیٹھ پا رہے تھے نہ بات کر پا رہے تھے۔ پہلے کتنی کتنی دیر تک بیٹھتے تھے اور باتیں کرتے تھے۔ بس جہاں جس ریستوران میں جا کر بیٹھ گئے سو بیٹھ گئے۔ گھنٹوں کے حساب سے بیٹھتے تھے۔ اور چل کھڑے ہوئے تو بس چلے جا رہے ہیں۔ نہ پاؤں رُکتے تھے نہ زبان رُکتی تھی۔ اور اب جب میں اس زمانے کو یاد کرتا تو اس طرح توجیہہ کرتا ہوں کہ اس زمانے میں آج کا سا شور اور ہنگامہ نہیں تھا۔ نہ ایسی گڑبڑ تھی کہ آدمی پہ آدمی گرا پڑتا ہے نہ اتنا ٹریفک ہوتا تھا کہ سواری سے سواری بھڑی نظر آتی ہے۔ مال کتنی خاموش سڑک ہوا کرتی تھی۔ صحیح معنوں میں ٹھنڈی سڑک۔ مگر آج بھی تو مال خاموش تھی۔ پھر ہم سے بات کیوں نہیں ہو پا رہی تھی۔ اور تب مجھے یہ احساس ہوا کہ خاموشی اور خاموشی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس خاموشی نے تو ہمارے دل و دماغ کے سکون سے جنم لیا تھا۔ اور یہ خاموشی، مگر خیر۔ ویسے شہر بھی کبھی کبھی کس طرح اچانک سے بدل جاتے ہیں کہ یوں کچھ بھی نہیں بدلتا مگر سب کچھ بدل جاتا ہے۔

"یار۔ آج تو شام ہی سے اُلو بولنے لگا" ظہور نے چلتے چلتے کہا۔

"ابھی تو اُلو بولے گا"۔ کامریڈ کا غصیلا لہجہ ابھی تک برقرار تھا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ واقعی یہ تو شام ہو گئی ہے۔ شام سے رات۔ جو تھوڑا بہت ٹریفک تھا وہ بھی رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا۔ بس کوئی کوئی کار بغیر ہارن دیے بغیر شور کیے تیزی سے گزری چلی جاتی۔ وقفہ وقفہ کے بعد کوئی سکوٹر، کوئی خالی رکشا۔ فٹ پاتھ پہ چلتا ہوا اِکا دُکا آدمی۔ آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہوتا نظر آنے لگا۔

"مال آج اتنی جلدی خاموش ہو گئی"۔ جیسے میں نے اپنے آپ سے کہا ہو، آہستہ سے

اپنے ہی کان میں۔ اور کامریڈ نے اتنے ہی زور سے اور غصے سے کہا، خبردار کرنے کے لہجہ میں،

"کامریڈ، اس خاموشی سے ڈرو"۔

ہم پہلے ہی اکھڑے ہوئے تھے۔ کامریڈ کی اکھڑی اکھڑی باتوں نے اور اکھاڑ دیا۔

"کامریڈ، میں چلتا ہوں"۔ ظہور نے ایک بیزاری سے اعلان کیا اور ایک دم سے بغیر علیک سلیک کیے اپنی راہ ہو لیا۔

"دلّے کے بچے"۔ کامریڈ منہ ہی منہ میں سخت غصے کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔ "یہ سالے انقلاب لائیں گے"۔

"کامریڈ، تمہارا ظہور تو گیا۔ اب کیا ارادے ہیں؟"

"تم بھی جانا چاہتے ہو"۔ کامریڈ نے غصیلی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"پھر کیا کریں یار۔ بوریت ہونے لگی"۔

میرے لہجہ کی بیزاری کو کامریڈ نے محسوس کیا اور فوراً ہی ہاتھ ملا لیا:

"اچھا سلام علیکم"۔

"اور تم؟"

"میرا راستہ تمہارے راستہ سے الگ ہے"۔ اور فوراً ہی وہ مجھ سے منہ موڑ کر دوسری سڑک پہ ہو لیا۔

ایک خالی رکشا کتنی دیر سے خالی خاموش سڑک پر بھٹک رہی تھی۔ اشارہ کرنے کی دیر تھی۔ فوراً آن پہنچا۔ میں اس میں بیٹھ گھر کی طرف ہو لیا۔

رکشا والا پورے رستے خاموش رہا۔ مگر جب میں گھر کے دروازے پہ پہنچ کر رکشا سے اترا اور اسے پیسے دینے لگا تو اچانک بولا:

"ایک بات کہوں جی؟"

"کہو۔ کیا بات ہے؟"

قریب آ کر رازدارانہ لہجہ میں بولا: "یہ سب ان لوگوں کا ڈرامہ ہے۔ وہ تو یاں پہ تھا ہی نہیں"۔

"کون یاں پہ نہیں تھا؟" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

"وہ جی؟"

"کون وہ؟"

"سمجھ جاؤ جی"۔ پھر ذرا قریب آ کر کہنے لگا: "میرے پھوپھا کا بھتیجا کل ہی سعودی عرب سے آیا ہے۔ واں پہ جی اس کی ٹیلر ماسٹر کی دکان ہے۔ شہزادوں کے کپڑے وہی سیتا ہے جی۔ بتا دے تھا کہ میں شہزادے صاحب کے کپڑے لے کر محل میں گیا تو کیا دیکھوں ہوں کہ وہ واں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ میں حیران ہوا کہ اچھا یہ یاں پہ ہے"۔ رکا پھر سرگوشی میں بولا: "کسی کو بتایو مت"۔

پھر تیزی سے رکشہ سٹارٹ کی۔ یہ جا وہ جا۔

سوتے سوتے آنکھ کھل گئی۔ بس آپ ہی آپ۔ اور ایسے جیسے پوری نیند لے چکا ہوں۔ گھڑی دیکھی۔ لو ابھی تو بہت رات پڑی ہے۔ مگر مجھے جتنا سونا تھا سو چکا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ بیچ رات میں آنکھ کھل جاتی ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ پوری نیند لے چکے۔ پھر میں پلنگ سے بندھا بستر سے چپکا نہیں رہ سکتا۔ اٹھ کھڑا ہوتا ہوں کہ کچھ کرنا چاہیے۔ تو میں تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا کمرے کی چٹخنی کھول آہستہ سے باہر نکل گیا۔ پچھواڑے کی دیوار پہ ٹمٹماتا چراغ اب بجھنے کو تھا۔ بس آخری دموں پہ تھا مگر میں یہ خیال کر کے حیران ہوا کہ ابھی تک نہیں بجھا ہے۔

زبیدہ کو اول رات ہی میں یہ ڈر پڑا تھا کہ بس اب بجھا اور اب بجھا۔ تین دن سے یہی ہو رہا تھا۔ جس شام زبیدہ ڈری تھی اس کے دوسرے ہی دن جب میں نے شام پڑے گھر میں قدم رکھا تو دیکھا کہ پچھواڑے والی دیوار پہ ایک دیا ٹمٹما رہا ہے۔

"بوجان، انہوں نے تو کہا تھا کہ چراغ بجھنا نہیں چاہیے۔ یہ تو بجھا جا رہا ہے"۔

بوجان نے چراغ کو تشویش بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر جیسے زبیدہ کی ڈھارس بندھا رہی ہوں، بولیں:

"نہیں دلہن۔ اللہ چاہے تو نہیں بجھے گا۔ لگے گا یہی کہ بجھنے لگا ہے۔ آخر شیاطین سے مقابلہ ہے کوئی کھیل تو نہیں ہے"۔

میں نے چکرا کر پوچھا: "یہ کیا سلسلہ ہے"۔

"بیٹے، آج مولوی غلام رسول آئے تھے"۔

"مولوی غلام رسول۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کس سلسلہ میں؟"

"دلہن کو وہم ہو گیا تھا تو میں نے سوچا کہ انہیں بلا کے کچھ پڑھوا پھونکوا لیا جائے۔ انہوں نے پڑھ پھونک دیا ہے اور سات دن چراغ جلانے کو کہا ہے۔ ہدایت کی ہے کہ بجھنا نہیں چاہیے"۔

"اور اگر بجھ گیا تو؟"

"میرے لال بدشگنی کا کلمہ منہ سے نہیں نکالنا چاہیے۔ اللہ چاہے تو نہیں بجھے گا"۔

چراغ تب سے اب تک ہوا سے لڑ رہا تھا۔ اور لڑتا۔ مگر شاید تیل ختم ہو گیا تھا کہ لو اتنی دھیمی ہو گئی تھی۔ چراغ سے گذر کر میری نظر جیل کی برجی پر گئی جہاں پہریدار ایک ہاتھ میں لالٹین، ایک ہاتھ میں لٹھ لیے ساکت کھڑا تھا۔ مجھے یہ شناخت کرنے میں کہ کوئی کھڑا ہے دیر لگی۔ وہ تو لاٹھی پٹخنتا رہتا تھا اور لالٹین ہلاتا رہتا تھا۔ ساتھ میں اونچی پکار "جاگتے رہو" مگر اس وقت وہ بت کی مثال کھڑا تھا۔ میں نے بہت غور سے دیکھا تب اندازہ ہوا کہ کوئی

کھڑا ہے۔ وہی لمبا تڑنگا آدمی اپنی داڑھی اور لالٹین کے ساتھ۔ آج اس کے اس طرح ساکت و صامت کھڑے رہنے نے مجھے ڈرا دیا۔ فوراً ہی اس طرف سے نظریں ہٹالیں۔ ایسا لگا کہ وہ بہت قریب کھڑا ہے بالکل ہماری دیوار کے برابر اور میری نقل و حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ ایسے بن گیا جیسے میں نے اسے دیکھا ہی نہیں ہے اور جیسے مجھے پتہ ہی نہیں ہے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ مگر اب میں وہاں زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ واپس اپنے کمرے کی طرف۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بوجان کے کمرے میں جھانکا۔ بے سدھ سو رہی تھیں۔ ایسی بے سدھ کہ خراٹے بھی نہیں لے رہی تھیں۔ یہ بھی عجیب ہی بات ہے کہ بوجان سو رہی ہوں اور خراٹے نہ لیں۔

کمرے میں آکر پھر بستر پر دراز ہو گیا۔ زبیدہ اسی طرح بے خبر سو رہی تھی۔ ادھر آنکھوں میں دور دور تک نیند نہیں تھی۔ کروٹیں بدلتا رہا۔ اوبڑ کھابڑ خیالات یلغار کرتے رہے۔ تصور میں انمل بے جوڑ شکلیں بنتی رہیں بگڑتی رہیں۔ دن کے دوران دیکھے ہوئے کتنے نقشے باری باری دھیان میں آئے اور محو ہو گئے۔ کافی ہاؤس میں بتوں کی مثال گم سم لوگ۔ رکشہ والے کی راز بھری سرگوشی۔ "وہ تو یہاں پہ تھا ہی نہیں" وہ کون۔ وہ۔ کامریڈ کا غصے سے تمتماتا چہرہ۔ جلا بھنا فقرہ جیسے خبردار کر رہا ہو، اس سناٹے سے ڈرو۔ اس وقت تو نہیں مگر اس وقت پلنگ پر لیٹے لیٹے رات کے اس سناٹے میں ڈر لگنے لگا۔ تعجب لگا کہ کیسی رات ہے کہ سرے سے کوئی آواز ہی نہیں ہے۔ سناٹی راتوں میں بھی بیچ بیچ میں کوئی آواز تو گونجتی ہے۔ بے شک بے تکی بے محل ہی ہو۔ سوتے سوتے اچانک کسی کا ہنکار اٹھنا۔ کسی پرندے کا دفعتاً چلا کر چپ ہو جانا۔ درست کہ ایسی بے تکی بے محل آوازوں سے سناٹے کا احساس اور گہرا ہو جاتا ہے۔ بہرحال وہ آواز تو ہوتی ہے۔ لیکن اس رات جب سے میری آنکھ کھلی تھی سرے سے کوئی آواز ہی سنائی نہیں دی تھی۔ جیل کے پہریدار کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ بھی گم سم تھا۔ اتنی سناٹی رات۔ میرے دل میں دہشت اترنے لگی۔ اسی ہنگام الٹے پلٹے

خیالات کے بیچ مجھے پچھلی شام کا دھیان آیا کہ جب میں گلی سے گذر کر گھر میں داخل ہو رہا تھا تو وہ کون تھا جو میرے پاس سے تیزی سے گزر گیا تھا۔ کون تھا وہ جو میرے برابر سے شام کے جھٹپٹے میں اس تیزی سے گزرا کہ میں اس کی صورت بھی نہ دیکھ سکا۔ اتنی عجلت میں وہ کیوں تھا۔ کیا عجلت اس کی وجہ تھی یا دانستہ اس نے کوشش کی تھی کہ میں اس کی صورت نہ دیکھ سکوں۔ اس قسم کے کتنے شک ایکدم سے میرے اندر پیدا ہو گئے۔ ایک شک کو دفع کیا تو کسی دوسرے شک نے سر اٹھایا۔ دوسرے شک کا قلع قمع کیا تو کوئی تیسرا شک پیدا ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ آخر ہماری گلی ایسی سنسان تو نہیں ہے۔ یہاں لوگ رہتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، آتے جاتے رہتے ہیں۔ آدمی کو سو طرح کے کام ہوتے ہیں۔ سو کسی کا عجلت میں گذرنا ایسے کونسے اچنبھے کی بات ہے اور شام کے اوقات میں تو آدمی یوں بھی عجلت میں ہوتا ہے۔ جب دو وقت مل رہے ہوں تو قدم خواہ مخواہ تیز تیز اٹھتے ہیں۔ مگر اپنے آپ سے میرا کوئی استدلال میرے کام نہ آیا۔ میں نے اپنے شکوں کی جتنی تردید کی اتنی ہی وہ طاقت پکڑتے گئے۔ اور اچانک مجھے ایک اور شک گزرا کہ کہیں وہ میرے دروازے پر دستک دے کر تو نہیں پلٹ رہا تھا۔ میرے دروازے پر؟ مگر کیوں؟ میں ایکدم سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے سٹول پر رکھی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس اٹھائی اور سگریٹ سلگائی۔ حالانکہ اس وقت مجھے سگریٹ کی کوئی طلب محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مگر شک کی رو اسی طرح امڈی ہوئی تھی۔ میرے دروازے پہ؟ مگر کیوں؟

"ابھی تک جاگ رہے ہو؟" زبیدہ تو بے خبر سو رہی تھی۔ جانے کیسے اس کی آنکھ کھل گئی۔

"ہاں۔ نیند نہیں آرہی۔"

زبیدہ اٹھ کر باتھ روم گئی۔ واپس آئی۔ لیٹی ہی تھی کہ میں نے پوچھ لیا: "آج شام

کوئی آیا تو نہیں تھا؟"

"نہیں۔ کیا کسی کو آنا تھا؟"

"نہیں تو۔ ویسے ہی پوچھ رہا تھا کہ شاید کوئی مجھے پوچھنے آیا ہو۔"

"نہیں۔ کوئی بھی نہیں آیا۔" اور یہ کہتے کہتے زبیدہ پھر سنانے لگی۔

میں اسی کشش و پنج میں کہ آخر وہ کون شخص تھا، اس وقت جب وہ میرے برابر سے گزرا تھا میں نے اس پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ کیا دھیان دیتا۔ دن بھر میں چلتے پھرتے کتنی چھوٹی موٹی باتیں ہوتی ہیں جن پر ہم ذرا دھیان نہیں دیتے۔ کتنے لوگوں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے، کتنوں سے معمولی علیک سلیک ہو کر رہ جاتی ہے، کتنے پاس سے گزر جاتے ہیں اور ان کا ہم ذرا سا بھی نوٹس نہیں لیتے۔ تو اس کے معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ ذرا جو اس کا نوٹس لیا ہو۔ مگر اب رات کے سناٹے میں وہ میرے دھیان میں آیا اور میرے دل و دماغ پہ چھاتا چلا گیا۔ اس کا پاس سے یوں گزر جانا کہ اس کی صورت نظر نہیں آئی، اس وقت کتنی غیر اہم بے وقعت بات لگی تھی اور اب اسی غیر اہم، بے وقعت بات میں کتنے معنی، کتنے سنگین امکانات پوشیدہ نظر آرہے تھے۔ آخر وہ کیوں اتنی تیزی سے میرے قریب سے گزرا کہ میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکا۔ اسے یوں منہ چھپانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ "جاگتے رہو"۔ جیل کے پہریدار کی آواز اچانک بلند ہوئی، اس طرح نہیں کہ دور سے آرہی ہو، اس طرح جیسے قریب سے آرہی ہو۔ بس ایسا لگا کہ وہ برجی سے اتر کر تھوڑا ہمارے گھر کے قریب آگیا ہے، پچھواڑے کی دیوار کے برابر۔ دل میرا دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ مگر پھر فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا۔ خود کو ٹوکا، ڈر رہے ہو۔ اس کے ساتھ ہی دھیان کہیں سے کہیں چلا گیا۔ میاں جان اپنے والد کے حضور۔ میرے بیٹے، آدمی تین حالتوں میں پہچانا جاتا ہے:

جب وہ سرخوشی کے عالم میں ہو؛

جب وہ خوف کے عالم میں ہو؛

جب وہ نشہ کے عالم میں ہو؛

اور اے میرے بیٹے، نشہ کی تین قسمیں ہیں؛

ام الخبائث کا نشہ؛

طاقت کا نشہ؛

عشق کا نشہ؛

اور جاننا چاہیے کہ اہلِ بصیرت نے نشوں میں سے صرف نشۂ عشق کو جائز جانا ہے۔ باقی نشوں کو باطل ٹھہرایا ہے۔ میاں جان کا تذکرہ جو میں نے پچھلے دنوں پڑھتے پڑھتے بیچ میں چھوڑ دیا تھا اس گھڑی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

سو اے صاحبو، یہ ہے ہمارے خاندان کا احوال۔ اور اب ضرور آپڑا ہے کہ جستہ جستہ ابا جانی کے اوراق پریشاں سے نقل کروں کہ یوں اجداد کا ذکر بھی بزبانِ ابا جانی فقیر کے تذکرے میں شامل ہو کر اس کے لیے باعثِ شرف بن جائے گا اور گزرے زمانوں کا ایک نقشہ بھی جس میں عبرت کے گوناگوں پہلو ہیں، نظروں کے سامنے آجائے گا۔

منقول از تذکرہ حکیم چراغ علی کہ پدرم بود

اس کج مج بیان چراغ علی نے سنا اپنے ابا حضور سے، ابا حضور نے سنا اپنے ابا حضور سے، اور ابا حضور کے ابا حضور نے سنا اپنے ابا حضور سے کہ اس بزرگ نے وہ حالِ تباہ اور وہ ماجرائے جانکاہ اپنی آنکھ سے دیکھا تھا، دیکھ کر منہ اشکوں سے دھویا تھا۔ یوں بیان کیا اس جناب نے کہ ایک دن یہ خبر عام ہوئی، زبان زدِ خاص و عام ہوئی کہ باغی ایک تخت کا پکڑا گیا ہے، زنجیروں میں جکڑا گیا ہے۔ کل شہر میں اسے پھرایا

جاوے گا، تماشا خلقت کو دکھایا جاوے گا۔ دیکھنے والے ملامت کریں گے، قصے سے اس کے عبرت پکڑیں گے، خیالِ فاسد بغاوت کا اگر کچھ اور سرپھروں سرکشوں کے دماغوں میں پک رہا ہے تو وے اس سے باز آویں گے۔

تو اگلے دن گجر فجر کا بجتے ہی خلقت گھروں سے نکلی۔ کوچہ و بازار میں امنڈی۔ میں بھی فجر کا دوگانہ ادا کر کے مسجد سے نکلا تو گھر جانے کی بجائے طرف چاندنی چوک کے ہو لیا۔ تماشائیوں کا اژدہام تھا۔ مجمعِ خاص و عام تھا۔ آدمی پہ آدمی گرتا تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ چشمِ تماشہ ایک نئے تماشے کی منتظر تھی۔ نرالے ایک نظارے کے لیے مضطرب تھی۔ خدا خدا کر کے سواری باغی کی آئی۔ تماشائیوں کی جان میں جان آئی۔ ہتھنی ایک بدرنگ نظر آئی۔ ہودا غائب۔ ننگی پیٹھ پہ اس کی ایک شخص بحالِ تباہ بیٹھا تھا۔ سر اس کا جھکا تھا۔ دوشالہ ایک میلا دوش پہ اس کے پڑا تھا۔ دیکھنے والوں نے تھوڑی تھوڑی کی۔ آوازے کسے کہ نظریں کیوں نہیں اٹھاتا ہے۔ صورت اپنی کیوں نہیں دکھاتا ہے۔

ناگاہ ایک فقیر صفوں کو چیرتا، تماشائیوں کو دھکیلتا پاس اس کے پہنچا اور یوں گویا ہوا کہ اے وہ کہ کل تک صاحبِ جاہ و حشم تھا، مالکِ طبل و علم تھا، تیری سواری بادِ بہاری اس راہ سے گزرتی تھی تو تو مجھے عطا کیا کرتا تھا، دامن اشرفیوں سے بھر دیا کرتا تھا۔ آج تیرے پاس کیا ہے کہ اس سائل کو عطا کرے۔ یہ سن کر اس شخص نے نظریں اٹھا کر مانگنے والے کو دیکھا اور دوشالہ دوش سے اتار کر اس کی سمت پھینک دیا۔ تب خلقت نے صورت اس کی دیکھی اور سناٹے میں آ گئی۔ کتنی زبانوں سے ایک دم نکلا:

"ولیعہد بہادر"۔

اور پھر ایک دم سناٹا۔ دیکھنے والے دنگ، زبانیں گنگ۔ سب حیران کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ عالمِ بیداری ہے یا خواب کی سحر کاری ہے۔ پھر دیکھتے دیکھتے حیرت کی جگہ غضبناکی نے لے لی۔ مجمع بپھر اٹھا۔ ملک جیون پہ کہ ولیعہد بہادر کو گرفتار کر کے طرم خان بنا ہوا تھا،

ٹوٹ پڑا۔ شاہی پہریدار حرکت میں آئے۔ تیتر بتر ہو کر ملک جیون کو بچا لے گئے۔

میں حیران و پریشان گھر لوٹا۔ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ گریبانِ سحر کا جب چاک ہوا اور قصہ رات کا پاک ہوا تب میں اٹھ مسجد کی سمت چلا۔ نماز سے فراغت پا کر مسجد سے نکلا تو دیکھا کہ چھوٹے بڑے جوان بوڑھے خاص و عام شریف و وضیع سب ایک جھپک چلے جاتے ہیں۔ چاندنی چوک کی طرف ڈھلتے ہیں۔ میں بھی اس رو میں بہ لیا اس تجسس میں کہ دیکھیں آج نیرنگیٔ زمانہ کیا رنگ دکھاتی ہے، کونسا گل کھلاتی ہے۔ جہاں خلقت تھا اندر قطار کھڑی تھی اور کسی آنے والے کی راہ دیکھتی تھی وہاں میں بھی جا کھڑا ہوا۔ ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ وہی نحوست ماری بدرنگ ہتھنی نمودار ہوئی۔ اب رنگ دگر تھا۔ نقشہ دوسرا تھا۔ ایک لاشہ بے سر پشت پر اس کی دھرا تھا۔ لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو سہم گئے۔ دل ان کے دہل گئے۔ آج پھر ملک جیون طرم خاں بنا چل رہا تھا۔ کمال اترا رہا تھا کہ پورا شاہی دستہ اس کی کمک پر تھا۔

دل کہ دہل گئے تھے رفتہ رفتہ گداز ہوئے۔ آنسو آنکھوں سے جاری ہو گئے۔ حق یہ ہے کہ خلقت جہاں آباد کی اس دن بہت روئی۔ میں نے ضبط کا دامن تا دیر تھامے رکھا مگر گھر آتے آتے بند ٹوٹ گیا۔ یہ دو آنکھیں میری گنگا جمنا بن گئیں۔ طبیعت کمبخت پھر بھی نہ سنبھلی۔ تب میں پدرِ گرامی قدر کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوا۔ دو زانو ہو مؤدب ایک طرف بیٹھا۔ اس صاحبِ نظر نے چہرے پر میرے نظر کی، تامل کیا۔ پھر یوں گویا ہوئے:

"جانِ پدر! ہم دیکھتے ہیں کہ چہرے پر فرزند کے ملال کی گرد ہے، رنگت زرد ہے۔ آخر وجہ ملال کیا ہے؟"

میں عرض پرداز ہوا کہ: "پدرِ بزرگوار کل اور آج میں جو دلخراش منظر ان گنہگار آنکھوں نے دیکھے ہیں اور ایسے دہشت اثر اخبار ان کانوں نے سنے ہیں کہ جگر کٹتا ہے، کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کیونکر عاجز گوش گذار کرے کہ

زبان کو بیان کا یارا نہیں ہے، ضبط کی تاب نہیں۔

میں یہ کہہ کر چپ ہوا۔ پھر دل کو سنبھالا، حواس درست کیے اور جو مشاہدہ کیا تھا وہ بے کم و کاست بیان کیا۔

پدرِ عالی قدر نے یہ ماجرا سن تا دیر سکوت اختیار کیے رکھا۔ پھر فرمایا کہ:

"جانِ پدر، ایک سانحہ کی دید نے تمہیں ہلا دیا۔ اوسان کو تمہارے گم کر دیا۔ غور کی جائے ہے اور فکر کا مقام ہے کہ تمہارے اجداد نے کتنا کچھ دیکھا کہ اس کے دیکھنے سے شیروں کا جگر پھٹ جائے مگر کسی ماجرے نے انکے حوصلہ کو پست نہیں کیا۔ کسی سانحہ سے ان کی کشتیٔ ہمت ڈانواڈول نہیں ہوئی۔"

یہ کلام سن کر میں حیران ہوا اور استفسار کیا کہ وہ کیسے ماجرے تھے کہ اجداد نے دیکھے اور جن کے سامنے یہ ماجرا جناب کو گرد نظر آتا ہے۔

پدرِ عالی مقام نے تامل کیا۔ پھر یوں گویا ہوئے کہ:

"اے فرزندِ دلبند، ہم اصلاً اصفہان نصف جہان کی مٹی ہیں۔ ہمارے جدِ اعلیٰ خلد آشیاں احمد باللہ عزم و ہمت کا پیکر تھے، جود و سخا کا سمندر تھے۔ ان کا مسکن کہ بیت الابیض کہلاتا تھا اصفہان میں مرجع خلائق تھا۔ قریب و دور سے حاجتمند آتے تھے اور دامن بھر بھر کر جاتے تھے۔ مگر تیموری غضب کی آندھی ایسی چلی کہ بھرا اصفہان اجڑ گیا۔ سیہ بختی نے بیت الابیض میں ڈیرا کیا۔ اب وہاں سناٹا تھا۔ جوانانِ جری کہ میدان کی طرف گئے تھے واپس نہیں آئے۔ سب کٹ گئے۔ ایک ایک کر کے بٹ گئے۔ سر ان کے کھوپڑیوں کے مینار کی زینت بن کر بلند ہوئے۔ تب ہمارے عالی قدر جد نے بصد وقار اپنے گھوڑوں اور ہتھیاروں پہ ایک نظر ڈالی۔ خالی ایک تلوار

کمر سے باندھی اور اس اسپِ باد پا پر سوار ہوئے جو رانوں کے بیچ آ کر بجلی کی مانند تڑپتا تھا اور ہوا سے باتیں کرتا تھا۔ زوجۂ محترمہ کو پیچھے اور کمسن فرزند کو آگے بٹھایا۔ بیت الابیض کے در و دیوار پہ حسرت سے نظر کی اور نکل کھڑے ہوئے۔

جدِ عالی مرتبت کتنے دنوں خاک بسر پھرتے پھرے۔ صحراؤں کی خاک چھانی۔ جنگلوں کو کھوندا۔ رات کبھی کسی کھو میں گذاری، کبھی کسی جھاڑی تلے خاک کے بستر پہ بسر کی۔ آخر کے تئیں مرزبومِ قزدین پہ قدم رکھا۔ اس زمین نے قدم اس جناب کے پکڑ لیے اور دل کو موہ لیا۔ بس پھر اسی دیار میں ڈیرا ڈالا اور اس لاثانی قریے کو اصفہانِ ثانی جانا۔ جو لعل اصفہان کی مٹی نے اگلا تھا وہ قزدین کی خاک میں آسودہ ہوا۔ پھر اگلی نسلیں اسی دیار میں پروان چڑھیں۔ بیٹے پوتے پڑپوتے خوب پھلے پھولے۔ ان میں سب سے بڑھ کر ہمارے جدِ امجد حکیم علی شیر ریحان تھے کہ مسکن اس گھرانے کا اس جناب ہی کے نام سے منسوب ہوا اور قصرِ ریحان کے نام سے قریب و دور مشہور رہا۔

قصرِ ریحان علما و فضلا کا مرجع تھا۔ دکھیاروں بیماروں کا ملجا تھا۔ واضح ہو کہ قزدین میں آ کر ہمارے اجداد نے شمشیر و سناں سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ شمشیرِ آبدار کہ جدِ عالی وقار، احمد باللہ زیبِ کمر کر کے بیت الابیض سے نکلے تھے اصفہان سے قزدین تک "رفیق و دمساز" رہا۔ راہ میں کتنی مرتبہ تاتاری رسالوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ہر مرتبہ اس شمشیر نے اپنے جوہر دکھائے۔ مگر جب اس جناب نے قزدین کی زمین پہ قدم رکھا تو تلوار کو کھول کر الگ رکھا اور بصد افسوس فرمایا کہ یہ تلوار اصفہان کی حفاظت نہ کر سکی اور بیت الابیض کو برباد ہونے سے نہ بچا سکی۔ سو اب توقیر اس کی کیا رہ گئی۔ اس کلام کے ساتھ شمشیر و سناں کو سلام کیا اور علم و فضل سے رشتہ استوار کیا۔

آگے اس گھرانے کا ہر فرد شجاعت میں فرد تھا۔ تلوار کا دھنی تھا۔ اب ہر فرزندِ خاندان علم و فضل میں یکتائے روزگار ٹھہرا۔ سب سے بڑھ کر جدِ امجد حکیم علی شیر ریحان تھے کہ

طب و حکمت کے بحر کے شناور تھے۔ بحیثیت طبیب جالینوس ثانی کہلانے گئے۔ بو علی سینا کے مثیل ٹھہرائے گئے۔ پر طبع عالی کو ظلم سے نفور تھا اور وہ زمانہ پُر فتور تھا۔ حاکمِ وقت کے ظلم سے خلقِ خدا پناہ مانگتی تھی۔ اس کے ظلم کی چکی اندھا دھند چلتی تھی کہ اپنے پرائے کو بھی نہیں دیکھتی تھی۔ اس مردِ شوم کے چار بیٹے تھے۔ خلقت میں مقبول تھے۔ یہ دیکھ وہ ان سے خائف ہوا۔ ایک کو زہر دلوا دیا۔ دوسرے کی آنکھوں میں گرم سلائی پھیر دی۔ تیسرے کی آنکھیں ثابت نکال لیں۔ چوتھے کو فرشتۂ قضا نے اچک لیا۔ اس کی دستبرد سے بچ گیا۔

واضح ہو کہ انہیں ایام میں جدِ بزرگوار نے اس طبیبِ بے مثال نے ایک سرمہ تیار کیا تھا کہ بینائی کسی صورت بھی زائل ہوئی ہو، اس کی ایک سلائی سے بحال ہو جاتی تھی۔ پر جن کی آنکھیں نکلوائی جاتی تھیں ان تک یہ سلائی کیسے پہنچتی کہ ان کے مقدر میں تو بھی بندی خانے کی تاریکی لکھی جاتی تھی۔

یہ حالات دیکھ کر جدِ عالی مقام کبیدہ خاطر ہوئے۔ آبدیدہ ہو کر بولے کہ افسوس ہے ہم پر کہ بے بصر حاکمِ وقت کے ہاتھوں خلقت چشمِ بینا سے محروم ہوتی چلی جا رہی ہے اور ہم بیٹھے دیکھتے ہیں اور اپنی ایجاد پر فخر کرتے ہیں۔ پھر آگے دھری ہوئی سرمہ دانی سے مخاطب ہوئے کہ اے سرمہ دانی اگر تو قرزدین کی بجھتی آنکھوں کو روشن نہیں کر سکتی تو پھر کس کام کی؟ یہ کہہ کر سرمہ دانی الٹ دی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ چار مخطوطہ دربارۂ طب بغل میں دابے، اہلِ خانہ کو ہمراہ لیا اور قصرِ ریحان کے در و دیوار کو ایک نظر دیکھ نکل کھڑے ہوئے۔

اس صاحبِ والا صفات نے اس نواح میں جس قریے میں قدم رکھا یہی دیکھا کہ خلقِ خدا معتوب و مقہور ہے۔ آنکھوں میں ان کے گرم سلائیاں پھیری جاتی ہیں۔ پتلیاں نکلوائی جاتی ہیں۔ ایک بدبخت حاکم نے بندی خانہ کے داروغہ کو بحالتِ غضب حکم دیا کہ جتنے باغی پا بہ زنجیر ہیں اتنی پتلیوں کے جوڑے مابدولت کے حضور گن کر پیش کیے جائیں۔ ایک جوڑا بھی کم ہوا تو تیری پتلیاں نکلوا کر گنتی پوری کر دوں گا۔

یہ نقشہ دیکھ جدِ امجد نے اس نواح سے منہ موڑا اور دیارِ ہند کی راہ لی۔ جانِ پدر، یوں ہمارے اجداد اصفہان سے نکلے، قریہ قریہ پھرے اور جہان آباد میں آ کر ڈیرے ڈالے۔

پدرِ عالی قدر یہ کہہ کر خاموش ہوئے۔ پھر افسوس سے بولے: "حیف ہے اس بستی پر کہ یہ بھی اسی راہ پر چل نکلی ہے۔"

میں نے استفسار کیا کہ باعث اس فساد کا کیا ہے؟

فرمایا: "انسان ظالم ہے اور جاہل ہے"۔

تب میں نے بصد ادب یہ سوال کیا کہ اے میرے پدر، ایسا کیوں ہے کہ ظالم اور جاہل سب سے بڑھ کر امتِ مرحوم کے بیچ نمودار ہوتے ہیں۔ اس پر پدرِ بزرگوار نے سکوت اختیار کیا، پھر تین بار کہا:

"افسوس، افسوس، افسوس۔"

پھر آنکھیں موند لیں اور بحرِ سکوت میں غرق ہو گئے۔

عاصی پُر معاصی چراغ علی اس باب میں یوں کہتا ہے کہ جدِ امجد نے بجا فرمایا بیشک آدمی ظالم و جاہل ہے۔ کتنا کچھ دیکھتا ہے مگر عبرت حاصل نہیں کرتا ہے۔ ایک واقعہ اس باب میں یہ ہیچمدان تواریخ سے اخذ کر کے نقل کرتا ہے۔

روایت کیا ابو جعفر نے ابنِ ندیم سے اور ابنِ ندیم نے سنا اسحٰق زیتون فروش سے کہ زیتون کی اس کے شہرت دور دور تھی۔ دیانت اس کی قریہ قریہ مشہور تھی۔ اور اسحٰق زیتون فروش نے نقل کیا حارث عطار سے کہ مردِ باصفا تھا۔ صاحبِ زہد و اتقا تھا۔ اور حارث عطار نے استفادہ کیا بیان سے ابو بکر جلابی کے کہ علم کا سمندر تھے۔ احادیث و روایات کے شناور تھے اور ابو بکر جلابی نے شنید کیا زید بن عثمان زرگر سے کہ مروان الحمار قتل ہوا اور سر اس کا قلم کر کے طشت میں سجا کے عبداللہ بن علی کے روبرو پیش کیا گیا اور بعد اس کے وہ طشت ایک طرف رکھ دیا گیا۔ اسی ہنگام ایک بلی حرام پلی سٹک کر

اس سر کے پاس پہنچی اور کسی ترکیب زبان اس کے بیچ سے نکال کر چبا گئی۔ دیکھنے والوں نے یہ دیکھا اور ششدر رہ گئے اور اس پر کہا عبداللہ بن علی نے کہ خدا کی قسم! میں نے زمانے کی عبرت ناکیوں اور دقت کی سفاکیوں میں اس واقعہ کو سب سے زیادہ عبرتناک اور سفاک پایا۔ اور فقیر چراغ علی اس بیچ یہ کہتا ہے کہ بے شک بلی جتنی مسکین ہوتی ہے اتنی ہی سفاک بھی ہوتی ہے۔ جائے غور ہے و نیز جائے عبرت کہ بنی امیہ کو جتنا گھمنڈ اپنی خلافت پر تھا اتنا ہی غرہ اپنی خطابت پہ تھا مگر ایک گربۂ مسکین مروان الحمار کی زبان چبا کر ان کی خلافت اور خطابت دونوں کو چاٹ گئی کہ بعد اس کے کسی اموی کو تختِ خلافت پر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔

القصہ دنیا میں زق زق بق بق بغایت ہے، شور و غوغا غل غپاڑہ بے نہایت ہے، بھائی کو بھائی سے عداوت ہے۔ زن زر اور زمین کے لیے خون خرابہ، شور شرابہ، نفسا نفسی، دھینگا مشتی، دخل فصل، جنگ و جدل، چیخم دھاڑ، واتا کلکل۔ مگر زندگی کا کیا اعتبار ہے دنیا ناپائدار ہے۔ یہاں کس چیز کو قرار ہے۔ ابھی تخت پر بیٹھے ہیں، ابھی تابوت میں لیٹے ہیں۔ زمانہ ابلقِ ایام پر سوار بگٹٹ دوڑتا ہے۔ نیک و بد کو نہیں دیکھتا ہے۔ بلا تمیز سب کو روندتا ہے۔ موت کی گرم بازاری ہے۔ آج ہم کل تمہاری باری ہے۔ قصہ مختصر دنیائے دوں میں حالت سب کی زبوں ہے۔ رنگِ گردوں ہر دم دگرگوں ہے۔ کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے۔ یہ ہیچ پوچ چراغ علی اپنی مثال لاتا ہے۔ ان دو آنکھوں نے اس عمر میں کیا کیا کچھ دیکھ لیا۔ جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی۔ جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھتی ہیں۔ تیموری بساط کو لپٹتے دیکھا۔ جہان آباد کو اجڑتے دیکھا۔ تایا حضور کو دار پہ بلند ہوتے دیکھا اور اہلِ جہان آباد نے زیرِ آسمان کیا کیا دیکھا جس بادشاہ کو تختِ شاہی پر لباسِ شاہانہ میں رونق افروز دیکھا تھا اسی کی ننگی لاش جمنا کی ریتی پہ پڑی دیکھی۔ تایا حضور نے ایک روز یہ احوال بیان کیا اور اتنا روئے کہ ریش مبارک ان کی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ ایسا ان پہ اثر ہوا

کہ جینے سے جی سرد ہوا، رنگ چہرے کا زرد ہوا۔ دنیا کے قصوں بکھیڑوں سے منہ موڑا، عیش و عشرت کی محفلوں کو، یار و احباب کی صحبتوں کو چھوڑا۔ خانہ نشین ہو گئے مصلے پہ بیٹھ گئے۔ ہر دم یادِ خدا میں مستغرق۔ طبیعت میں نہ شوخی رہی نہ خوشی کی رمق۔ مزاج میں غم بس گیا تھا، الم رچ گیا تھا۔

تایا حضور نے جب دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تو کسی اور عالم میں جا کر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ آنے والے واقعات کی خبر دیدیتے تھے۔ پیشگوئی میں درک رکھتے تھے اور خوابوں کی تعبیر میں تو انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اس کم فہم نے ان سے تعبیریں سُن کر ایک تعبیر نامہ مرتب کر لیا تھا۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر تھوڑا نقل کرتا ہوں:

انجیر کا پتہ دیکھنا:

باعثِ پریشانی ہے۔ اندیشہ کی نشانی ہے۔

اناج خشک کھانا:

مفلسی میں مبتلا ہووے، رنج کا سامنا ہووے۔

اونچی جگہ سے اترنا:

عہدہ جاتا رہے۔ غم و غصہ کھاتا رہے۔

آندھی دیکھنا:

ملال پیش ہووے۔ فتنہ و فساد پیش ہووے۔

بلبل دیکھنا:

حاکم سے نفع کی دلیل ہے مگر قلیل ہے۔

پیسہ پڑا پانا:

غم کی نشانی ہے۔ نہایت پریشانی ہے

پھول دیکھنا:

کسی گل رو پہ عاشق ہووے ۔ مبتلائے فعلِ فاسق ہووے ۔

پستان دیکھنا :

دل شاد ہووے ۔ اولاد ہووے ۔

پیاسا آپ کو دیکھنا :

حرص بڑھے ۔ نیک کاموں میں خلل پڑے ۔

حقہ پینا :

معشوق سے ہمکلام ہووے ۔ غم سے نجات پاوے ۔

شتر بے مہار دیکھنا :

بدکاری کرنے میں بے باک ہووے ۔ آخر غمناک ہووے ۔

طاؤس دیکھنا :

عشق میں مبتلا ہووے ۔ جنون کا سامنا ہووے ۔

ہنسنا :

غم کی دلیل ہے مگر قدرے قلیل ہے ۔

تایا حضور نے اپنی موت کی خبر بھی پہلے ہی دیدی تھی ۔ ایک روز پہلے گریہ کیا ، پھر تبسم فرمایا ۔ ابا حضور نے سبب گریہ اور تبسم کا پوچھا تو فرمایا کہ جانِ برادر ۔ دنیا میں خلقت کے لیے آنے والی آفت کا تصور کر کے اور متبسم ہوا یہ جان کر کہ وصال کا وقت اب قریب آن پہنچا ہے ۔ ابا حضور نے استفسار کیا کہ یہ آپ نے کیونکر جانا ۔ فرمایا کہ جانِ برادر ، پہلی بات میں نے اس طور جانی کہ رات خواب میں دیکھا کہ آندھی کے جھکڑ چلتے ہیں ۔ تناور درخت گرتے ہیں ۔ دوسری خبر اس طریق سے پائی کہ آج صبحدم میں سورج کی سمت منہ کر کے کھڑا ہوا اور آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو دھیان میں لایا ۔ دیکھا کہ تن سے ہمارے سر غائب ہے ۔ یہ کہہ کر چپ ہو گئے ۔ پھر چہرے پر ملال کی کیفیت طاری ہوئی ۔ تامل کیا ،

پھر گویا ہوئے کہ جانِ برادر ، یہ سر تو ویسے ہی وبال بنا ہوا تھا ۔ تن سے جدا ہو گیا تو خوب ہوا ۔ مگر کونسی گھڑی آنے والی ہے کہ جس روشن ضمیر کو دھیان میں لاتا ہوں تن سے اس کے سر جدا دیکھتا ہوں ۔ بعد اس کے آپ نے تین بار فرمایا : "افسوس ، افسوس ، افسوس ۔"

"اے بیٹے ، رات کو تم سوئے نہیں تھے ؟"

میں نے ہڑبڑا کر بوجان کو دیکھا کہ جانے کس وقت میرے قریب آن کھڑی ہوئی تھیں میں نے تذکرے کے اوراق الگ رکھے :

"بوجان ، آج ذرا جلدی آنکھ کھل گئی ۔ میں نے سوچا کہ میاں جان کے تذکرے کے جو اوراق پڑھنے سے رہ گئے تھے انہیں نبٹا دوں" ۔

"بیٹے ، رات کے کسی بیچ میری آنکھ کھلی تھی اس وقت بھی تم جاگ رہے تھے ۔ خدا خدا کر کے تمہارے جاگنے کی عادت چھٹی تھی ۔ اب پھر تم نے وہی طور پکڑ لیا ۔" یہ کہتے کہتے بوجان باہر برآمدے میں نکل گئیں ۔ وضو کیا ۔ پھر نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں ۔

بوجان دوبارہ میرے پاس اس وقت آئیں جب میں ناشتہ کرتے کرتے اخبار پڑھنے میں غرق ہو گیا تھا :

"اے ہے ، اخبار نہ ہوا بلائے جان ہو گیا ۔ کیوں چائے کو ٹھنڈا کر رہے ہو ؟"

میں نے اخبار سے ذرا نظر ہٹا کر سامنے رکھی چائے کی پیالی پر نظر ڈالی ۔ پیالی منہ سے لگائی ۔ واقعی ٹھنڈی ہو گئی تھی ۔

"اور آج تم اپنی چڑیوں کو بھی بھول گئے ۔ غریب بچے کے انتظار میں سوکھ رہی ہیں ۔"

ہاں واقعی ، چڑیاں تو میرے ذہن سے آج اتر ہی گئی تھیں ۔ فوراً اخبار الگ رکھ توس کے بچے ہوئے ٹکڑے جلدی جلدی ریزہ کیے اور آج توس کے ٹکڑے زیادہ ہی بچ گئے تھے ۔ ایک توس تو پورا بچ گیا تھا ۔ ناشتہ کو طبیعت لے ہی نہیں رہی تھی ۔ ریزے لے کر ہارسنگھار کے پاس پہنچا تو چڑیاں جا چکی تھیں ۔ ان چڑیوں کے بھی عجیب نخرے تھے ۔

ریزے ڈالنے میں جب صبح ذرا تاخیر ہو جاتی وہ اڑ کر جانے کس طرف نکل جاتیں۔ جیسے روٹھ گئی ہوں۔

بس ایک چڑیا پیچھے بھٹکتی رہ گئی تھی۔ وہ تھوڑے تامل کے ساتھ شاخ سے اتر کر آئی۔ چند ریزے چگے مگر کچھ زیادہ شوق کے ساتھ نہیں۔ پھر وہ بھی اڑ گئی۔

۱۰

"دروازے پہ کوئی ہے"۔ یہ کہنے کے ساتھ ساتھ میں نے گھنٹی کی آواز پر کان لگائے۔ کچھ ایسا گمان ہوا تھا کہ کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی ہے اور میں نے اس توقع پہ کان لگائے کہ اگر کوئی ہے تو پھر گھنٹی بجائے گا مگر پھر کوئی آواز ہی نہیں آئی۔

"کوئی بھی نہیں ہے"۔ زبیدہ بولی۔ "کوئی ہوتا تو دروازے کی گھنٹی بجاتا"۔

"میرا خیال ہے کہ کسی نے بجائی تھی"۔

"مجھے تو سنائی نہیں دی تھی۔ تمہارے تو کان بجتے ہیں"۔

میں تھوڑا کھسیانا ہو کر چپ ہو گیا۔ آگے دھری ہوئی پیالی اٹھائی اور خاموشی سے چائے پینے لگا۔ مگر اندر ایک خلش سی تھی کہ کیا واقعی کوئی نہیں تھا اور کیا واقعی کسی نے گھنٹی نہیں بجائی تھی۔ پھر مجھے یہ کیسے گمان ہوا۔ کیا یہ محض وہم تھا۔ مگر پھر میں نے جلد ہی اس خلش کو رفع دفع کر دیا۔ یہ سوچ کر کہ آخر یہ کونسا ایسا بڑا مسئلہ ہے۔ نہیں ہو گا کوئی۔ میرا وہم ہو گا۔ اور ایسا وہم ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ یوں بھی تو ہوتا ہے کہ کوئی آس پاس نہیں ہوتا اور لگتا ہے کہ تمہیں کسی نے پکارا ہے، تمہارا نام لیا ہے۔ تو کیا عجب ہے کہ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا ہو۔ تو اس طرف سے ذہنی فراغت کے بعد میں نے اطمینان سے چائے ختم کی، سگریٹ سلگائی۔ زبیدہ چائے کی ٹرے لے کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

اب شام ہو رہی تھی۔ میں اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ سگریٹ پیتے پیتے

بس یونہی ایک رَو میرے اندر اٹھی کہ ممکن ہے کوئی آیا ہی ہو کہ گھنٹی کی آواز تو میرے کان میں آئی تھی مگر کون تھا وہ؟ اور اس آن مجھے اس شخص کا خیال آیا جو شام کے جھٹپٹے میں میرے پاس سے گذرا تھا ایسے کہ میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھ سکا اور جس کا خیال اس سناٹی رات میں میرے دل و دماغ پہ چھایا رہا۔ وہ شخص ایک مرتبہ پھر میرے تصور میں زندہ ہو گیا۔ تو کیا وہی شخص آیا تھا؟ مگر اس طرح کیوں آتا ہے؟ آنے کا اچھا وقت چنتا ہے اور کیا خوب طور اپنایا ہے کہ شام کے جھٹپٹے میں آ کر دروازے پہ دستک دیتا ہے اور کتنی آہستگی سے دستک دیتا ہے کہ میں شک میں پڑ جاتا ہوں کہ کسی نے دستک دی بھی ہے یا نہیں اور پھر دم کے دم میں اڑنچھو ہو جاتا ہے۔

اب میں پچھتا رہا تھا کہ فوراً جا کر دروازے پہ دیکھا کیوں نہیں؟ پھر زبیدہ پہ غصہ آیا کہ اس نے بے سوچے سمجھے فوراً ہی میری بات کی تردید کر دی۔ خود پہ بھی جھنجھلاہٹ ہوئی کہ میں نے زبیدہ کی بات کیوں مان لی۔

"ایک بات بتاؤں۔ آج میں نے فال نکلوائی تھی۔" زبیدہ نے واپس آ کر قریب بیٹھتے ہوئے کچھ رازدارانہ سے لہجے میں اطلاع دی۔

"وہ کس سلسلہ میں؟" میں نے چونک کر زبیدہ کو دیکھا۔

"آشیانے کے سلسلہ میں۔" زبیدہ تھوڑا ہچکچائی۔ پھر بولی: "فال میں نکلا ہے کہ یہ زمین تمہیں راس نہیں آئی۔۔۔۔ بیچ ڈالو۔"

"کیا؟" میں کچھ بوکھلا گیا۔

"فال میں تو یہی نکلا ہے۔"

یہ بات اتنی اچانک تھی کہ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہوں۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنے آپ کو جمع کیا، کہا: "زبیدہ، سنو۔ میں تو اس جھنجھٹ میں پڑ ہی نہیں رہا تھا۔ تمہاری ضد تھی کہ مکان اپنا ہونا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہے کہ کن مصیبتوں سے پلاٹ حاصل کیا۔ پھر کیا کیا

جتن کر کے مکان بنوایا۔ اس کے قرضے ابھی تک جان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔"

"یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر مکان تمہاری جان سے زیادہ پیارا تو نہیں ہے۔"

"میری جان سے پیارا؟ میری جان تو اس کے لیے جتنی گھلنی تھی گھل چکی۔ اب یہ مکان میری جان کو کیا کھاتا ہے؟"

"خیر میں نے تو فال میں جو نکلا تھا وہ بتا دیا۔"

"تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ یہ مکان جو اتنی مصیبتوں سے بنا ہے بیچ ڈالنا چاہیے۔"

میں نے چڑ کر کہا تھا اور زبیدہ نے کس سکون کے ساتھ جواب دیا: "مکان جان سے زیادہ تو نہیں ہے۔ کمانے والے ہاتھ سلامت رہیں مکان تو اور بھی بن سکتا ہے۔"

اتنے میں بوجان برآمد ہوئیں۔ میں نے فوراً ان کے سامنے مقدمہ پیش کر دیا: "بوجان۔ آپ نے سنا۔ زبیدہ کی تجویز یہ ہے کہ آشیانہ بیچ دیا جائے۔"

"ہاں۔ سن چکی ہوں۔" بوجان نے بگڑے لہجے میں کہا اور اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ زبیدہ بوجان سے یہ ذکر پہلے ہی کر چکی ہے اور بوجان اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر چکی ہیں۔ بوجان تھوڑا چپ ہوئیں پھر زبیدہ سے مخاطب ہوئیں:

"اے دلہن۔ ہوش کی دوا لو۔ مکان کوئی گڈے گڑیا کا کھیل ہے کہ آج بنایا کل بیچ دیا۔ بی بی مکان تو آم کا پیڑ ہوتا ہے۔ نسلیں پھل کھاتی ہیں۔ خیر سے سہاگ بنا رہے۔ آج تم دو ہو کل اللہ چاہے تو تین ہو جاؤ گے اور پھر تین سے چار ہوں گے۔ ٹبر کو کہاں لیے لیے پھرو گی؟"

"اور گھر بنا لیں گے۔"

"اور گھر بنا لیں گے۔" بوجان نے کتنا منہ بگاڑ کر کہا۔ "دلہن، مکان زندگی میں ایک مرتبہ بنتا ہے پھر پشتوں چلتا ہے۔ ہماری چراغ حویلی پانچ پشتیں پہلے بنی تھی۔ اللہ رکھے اس نے پانچ پشتیں دیکھیں اور ابھی تو آگے اور پشتیں دیکھنی تھیں۔ حویلی تو کھڑی تھی۔ حویلی والے ہی اکھڑ گئے۔"

"بو جان، خوشی سے تو میں نے یہ بات نہیں کہی۔ فال میں جو نکلا ہے وہ میں نے کہا ہے۔"

"اے دلہن کیسی باتیں کرتی ہو۔ فال نکالنا ہرا یرا غیرا کا تو کام نہیں ہے۔ کسی ٹٹ پونجیا مولوی سے تم نے فال نکلوائی اور یقین کر لیا۔ ارے فال ہی نکلوانی تھی تو مولوی غلام رسول سے نکلواتیں۔ اور میں تو کہوں ہوں کہ انہیں بلوا کے کہا جائے کہ گھر کو کیل دو۔ بس پھر گھر محفوظ ہے۔"

پھر وہی گمان کہ جیسے دروازے پہ کوئی ہے جیسے کسی نے گھنٹی بجائی ہے۔ میں نے چائے پیتے پیتے سامنے بیٹھی زبیدہ پر ایک نظر ڈالی۔ اسے دیکھ کر تو نہیں لگتا تھا کہ اس نے کچھ سنا ہے۔ زبیدہ اونچا سننے لگی ہے یا سنی ان سنی کر دیتی ہے۔ خیر میں زیادہ اس سوال سے نہیں الجھا۔ سوچا کہ اٹھ کر دیکھ ہی لو۔ کیا خبر ہے کوئی ہو۔ نہ بھی ہو تو دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ کم از کم شک تو رفع ہو جائے گا۔ کل کی شام مجھے یاد تھی۔ ایک ذرا سی الکساہٹ کی وجہ سے کتنے شکوں میں گرفتار ہو گیا تھا۔ چائے بیچ میں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اخلاق یہ تمہاری کیا بُری عادت ہے کہ چائے بیچ میں چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہو۔"

"جا کہیں نہیں رہا۔ ابھی آتا ہوں۔"

کس تیزی سے میں دروازے پہ آیا۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ کوئی آیا بھی تھا، یا محض میرا وہم تھا۔ اگر آیا تھا تو کیا خالی دلیز چھونے آیا تھا۔ گھنٹی بجائی اور چھو ہو گیا۔ محض اپنے اطمینان کے لیے میں نے دروازے سے نکل کر بیچ گلی میں کھڑے ہو کر اس کی آخری حد تک نظر ڈالی۔ گلی یہاں سے وہاں تک خالی۔ مگر جب مڑ کر اندر جانے لگا تو میں نے گلی کے آخری کنارے پہ ایک ہیولی دیکھا جیسے کوئی گلی سے نکل کر سڑک پر مڑ گیا ہے۔ دیکھا یا ایسا

لگا کہ دیکھا ہے۔ فیصلہ نہیں کر پایا کہ سچ مچ کسی کو دیکھا تھا یا شک ہوا تھا۔ سوچا کہ آگے بڑھ کر دیکھے لیتے ہیں۔ تیز تیز قدم اٹھاتا گلی سے نکلا اور سڑک پہ ہو لیا۔ سڑک پہ نظر دوڑائی کہ کہاں گیا وہ۔ چند قدم کے فاصلے پہ پان سگریٹ کی دکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں ایک شخص اطمینان سے کھڑا کوکا کولا پی رہا ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے۔ یا ممکن ہے مجھے نہ دیکھ رہا ہو کہ میرا احساس ہو کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ دم بھر کے لیے مجھے خیال آیا کہ کہیں یہی تو وہ آدمی نہیں ہے۔ اس خیال کے ساتھ میں مڑ کر احتیاط سے اس کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ مگر میں نے سوچا کہ اسے مجھ پہ ایسا کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے اسے شناخت کر لیا ہے۔ تھوڑا آگے جا کر واپس آؤں گا اور سادگی سے ایسے جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے اس پر نظر ڈالوں گا۔ اگر وہی ہے تو میں اسے کسی نہ کسی طور تاڑ لوں گا۔ لیکن ابھی میں چند قدم بڑھا تھا کہ میں نے دیکھا کہ میرے آگے آگے ایک چوڑا چکلا آدمی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جا رہا ہے جیسے اسے اندیشہ ہو کہ اس نے چال سست کی تو میں اسے جا لوں گا۔ میں نے فوراً ہی اپنی چال تیز کر دی لیکن وہ تو اتنے لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا کہ میری چال میں تیزی آ جانے کے باوجود میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ آگے چوراہا تھا۔ چوراہے پر میرے پہنچتے پہنچتے وہ سڑک کو عبور کر چکا تھا۔ اور بتی سرخ ہو چکی تھی۔ مجھے ٹھہرنا پڑا۔ بتی کا رنگ بدلتے ہی میں نے تیزی سے سڑک کو عبور کیا اور نگاہ دوڑائی کہ وہ کہیں نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ مگر یہاں سڑک پہ اتنا مجمع تھا کہ خدا کی پناہ۔ لگتا تھا کہ جیسے کوئی حادثہ ہو گیا ہے یا کوئی مجرم پکڑا گیا ہے۔ میں حیران کہ یا اللہ اس سڑک پہ آج اتنی خلقت کہاں سے امنڈ پڑی۔ یہ معروف سڑک بے شک تھی مگر اتنی بھیڑ تو یہاں نہیں ہوا کرتی تھی۔ مگر میں یہ جاننے کے لیے کہ ہوا کیا ہے، رک نہیں سکتا تھا۔ یہ جو فکر تھی کہ کہیں وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

بھیڑ بھڑکا پیچھے رہ گیا۔ اب سڑک خالی اور خاموش تھی۔ خاموش سی خاموش جیسے

ہُو کا عالم ہو۔ بس جیسے میں خالی ڈھنڈار کسی بستی میں چل رہا ہوں۔ مگر وہ کہاں گیا۔ دُور دُور تک نظر دوڑائی۔ وہ تو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیا، وہاں تو چڑیا کا بچہ بھی نہیں تھا۔ سڑک سے ہٹ کر ایک گلی میں مڑ گیا۔ بس شک سا تھا کہ وہ میری نظروں سے بچنے کی غرض سے کسی گلی میں مڑا ہے۔ ایک گلی سے دوسری گلی میں، دوسری گلی سے تیسری گلی میں۔ ہر گلی خالی ہر گلی خاموش۔ میں حیران کہ یہ گلیاں تو میری دیکھی بھالی ہیں۔ اتنی اجنبی کیوں نظر آ رہی ہیں، اور اتنی بے آباد کیوں دکھائی دے رہی ہیں۔

کتنی مرتبہ اپنے ہی قدموں کی چاپ پہ چونکا۔ کتنی مرتبہ شک ہوا کہ کوئی دبے پاؤں میرے پیچھے آ رہا ہے۔ مگر کون؟ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔ وہ میرا پیچھا کیوں کرے گا۔ مگر کیا خبر ہے؟

تھک ہار کر واپس ہو لیا۔ اپنے گیٹ میں قدم رکھا تو سامنے برآمدے میں کوئی بیٹھا نظر آیا۔ وہ؟ وہ یا کوئی اور۔ بہرحال کوئی اجنبی تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ علیک سلیک ہوئی۔

"فرمائیے۔"

"میں نے سنا ہے کہ آپ اپنا مکان بیچنا چاہتے ہیں؟"

"جی۔" میں چکرا سا گیا۔

"جی بات یہ ہے کہ میں پراپرٹی ڈیلر ہوں۔" فوراً اس نے اپنی حیثیت کی وضاحت کی۔ "میں نے آج آپ کو دفتر میں بھی فون کیا تھا۔ دو مرتبہ فون کیا اور دونوں مرتبہ آپ نہیں ملے۔"

مجھے یاد آیا کہ چپراسی نے مجھے بتایا تھا کہ کسی نے آپ کو فون کیا تھا۔ میں نے اس پہ توجہ نہیں دی یہ سوچ کر کہ ہوگا کوئی؟ اب کون ایسا فون کرنے والا ہے جس کے لیے میں تردّد کروں۔ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں آیا: "اچھا اس سے پہلے بھی آپ یہاں آئے تھے۔"

"جی۔" اب پراپرٹی ڈیلر کے سٹپٹانے کی باری تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ کل بھی آئے تھے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

"نہیں۔" وہ چکرا سا گیا۔

"اچھا کمال ہے۔ وہ آپ نہیں تھے۔ پھر کون تھا؟" میں یہ کہتے کہتے ایک مرتبہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔

مگر شاید اس شخص کو اس کا احساس نہیں ہوا۔ سادگی سے بولا: "وہ کوئی اور ہوگا۔ مجھے تو آج ہی پتہ چلا تھا کہ آپ مکان بیچ رہے ہیں۔ پہلے میں نے دفتر میں آپ سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہاں نہیں ہو سکا تو یہاں حاضر ہو گیا۔ اندر سے جواب آیا کہ آپ دفتر سے تو آ گئے ہیں، یہیں کہیں ہیں۔ میں نے سوچا تھوڑا انتظار کر لیا جائے۔"

"آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے کہ میں مکان بیچ رہا ہوں۔"

"اچھا؟ پھر تو مجھے آپ سے معذرت کرنی چاہیے کہ خواہ مخواہ میں نے آپ کا وقت لیا۔"

"کوئی بات نہیں۔"

وہ تو چلا گیا مگر میں حیران تھا کہ کل ہی تو گھر میں یہ بات ہوئی ہے۔ پراپرٹی ڈیلر کے کانوں تک کیسے پہنچ گئی۔ میں نے زبیدہ سے پوچھا: "پراپرٹی ڈیلر کو کس نے اطلاع دی تھی کہ ہم مکان بیچ رہے ہیں۔"

"پراپرٹی ڈیلر کو؟ ...... اچھا ...... تعجب ہے ..... یہ آدمی کون تھا؟"

"پراپرٹی ڈیلر تھا۔ تم نے کسی سے ذکر کیا ہوگا؟"

"کسی سے نہیں۔ کل گھر ہی میں یہ بات ہوئی تھی۔ کیا کہتا تھا وہ؟"

"پوچھنے آیا تھا کہ آپ مکان بیچ رہے ہیں۔ نہیں بلکہ اس اعتماد کے ساتھ آیا تھا کہ یہ مکان بکنے لگا ہے اور اسے اس کا سودا کرانا ہے۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ ہم مکان ایسے تھوڑا ہی بیچ دیں گے آنکھیں بند کر کے۔"

پھر کیا کہا تم نے؟"

"میں نے کہہ دیا کہ تمہیں غلط اطلاع ملی ہے"۔

"اچھا کیا"۔ پھر رک کر بولی۔ "مگر ذرا ٹٹولتے تو سہی کہ کیا کہتا ہے"۔

"جب ہمیں گھر بیچنا ہی نہیں ہے تو اسے ٹٹولنے اور بات کو آگے بڑھانے کی کیا تک تھی؟"

"ذرا پتہ تو چلتا کہ وہ کیا قیمت لگاتا ہے"۔

"کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ پراپرٹی ڈیلر سے بات کرکے تو آدمی پھنس جاتا ہے۔ تم نہیں جانتیں۔ میں اس مخلوق کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ مخلوق تو وہ ہے کہ ایک مرتبہ مروت میں بھی اس سے بات کر لو تو وہ لیس ہو جاتی ہے"۔

میں نے یہ بات یونہی تھوڑا ہی کہی تھی۔ میرے ساتھ گذر چکی تھی۔ یہ تب کا واقعہ ہے جب میرے پاس گاڑی تھی۔ عجب کھٹ بگڑی گاڑی تھی۔ چلتے چلتے بلاسبب اڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ پھر میں جس تس کا منہ تکتا۔ گذرتی ہوئی ٹیکسیوں کو رکنے کے اشارے کرتا۔ کوئی اللہ کا بندہ ٹیکسی والا رحم کھا کر ٹیکسی روکتا۔ گاڑی کھول کر اس کے کل پرزے دیکھتا بھالتا، درست کرتا اور پھر میں وہاں سے چلنے کے قابل ہوتا۔ ایک روز جب سخت دوپہر تھی اور میں سڑک کے کنارے پسینہ میں شرابور کھڑا تھا تو ایک ٹیکسی والے نے میری گاڑی کے ڈانچو کا جائزہ لیتے لیتے کہا:

"صاب، آپ اس گاڑی کو بیچ ہی ڈالیں۔ نئی خرید لیں۔ آجکل فورڈ کا نیا ماڈل آیا ہوا ہے بہت اچھی گاڑی ہے"۔

جواب میں میں نے پیشانی اور گردن سے پسینہ پونچھا اور "ہوں" کہہ کر چپ ہو رہا۔ دل میں کہا کہ کہتا تو سچ ہے مگر اسے یہ پتہ نہیں کہ میں اس گاڑی کے ساتھ اپنے آپ کو بھی نہ بیچ ڈالوں تو فورڈ خریدنے کی استطاعت پیدا نہیں کر سکتا۔

تیسرے دن ایک شخص جسے میں بالکل نہیں جانتا تھا سو فٹ میرے پاس آیا اور کہنے لگا: "میرے پاس آپ کی گاڑی کے لیے ایک گاہک ہے۔ معقول اسامی ہے۔ آپکو اچھے پیسے مل جائیں گے"۔

میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا:

"آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں بس یہی موٹروں میں ڈیل کرتا ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جانتا ہوں آپ جس ورکشاپ سے اپنی گاڑی ٹھیک کراتے ہیں اس کا مالک میرا جاننے والا ہے۔ بہت آپ کی تعریف کرتا ہے"۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر فی الحال تو میں اس گاڑی کو بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا"۔

"اچھا"۔ وہ چپ ہوا۔ پھر بولا: "خیر جب بھی آپ کا ارادہ ہو آپ مجھ سے بات کریں۔ میں آپ کا اچھا سودا کراؤں گا"۔ یہ کہتے کہتے اس نے جیب سے اپنا تعارفی کارڈ نکالا اور مجھے پکڑا کر چلا گیا۔

ایک ڈیڑھ مہینے بعد پھر آن دھمکا۔ اب زیادہ اعتماد سے ملا: "تو آپ نے فیصلہ کر لیا گاڑی بیچنے کا؟"

"کون کہتا ہے۔ میں نے تو کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا"۔

"اچھا کمال ہے۔ میں نے تو یہی سنا تھا"۔

"کس سے سنا تھا؟"

اس سوال کو وہ گول کر گیا۔ زحمت دینے کی معذرت کی اور چلا گیا۔

ڈیڑھ دو مہینے بعد پھر آیا۔ اب کے تو بہت ہی بے تکلفی سے ملا جیسے برسوں کی آشنائی ہو۔ میں نے چائے کے لیے پوچھا۔ بولا:

"کوئی مضائقہ نہیں"۔

ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ کاروں کے نئے ماڈلوں کی تفصیل بتاتا رہا۔ پوچھنے لگا:

"آپ کے پاس یہ گاڑی کب سے ہے؟"

"یہی دو تین سال سے"۔

"اچھا۔ دو تین سال میں اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں آپ نے کس کے ذریعہ یہ سودا کیا تھا۔ مجھ سے آپ کی ملاقات ہو گئی ہوتی تو میں آپ کو اچھی گاڑی دلاتا۔ آپ کے قریب ہی سیٹ لائف کا دفتر ہے وہاں صدیقی صاحب ہوتے ہیں۔ انہیں میں نے اب سے چھ سال پہلے فوکس ویگن دلائی تھی۔ بالکل کوڑیوں کے مول۔ صاحب آج تک اس گاڑی نے ورکشاپ کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ صدیقی صاحب میرے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں"۔

"سیکنڈ ہینڈ گاڑی اور ورکشاپ نہ جائے۔ تعجب ہے"۔

"جناب یہی تو اپنا کمال ہے۔ جب بھی آپ کا ارادہ بنے آپ مجھ سے بات کریں۔ ویسے آپ کا ماڈل بہت پرانا ہو گیا ہے۔ اسے نکال ہی ڈالیں۔ اس وقت نکال دیں گے تو اچھے پیسے مل جائیں گے۔ تھوڑے دن کے بعد اسے کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا"۔

وہ کہتا رہا۔ میں سنتا رہا۔ ہاں ناں میں کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے بھی میرا ڈیل جاننے کے بارے میں کوئی تردد نہیں دکھایا۔ چائے پی، ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔

مہینہ نہیں گذرا تھا کہ ایک گاہک کو ساتھ لے کر آ گیا:

"انہیں آپ ذرا اپنی گاڑی دکھا دیں"۔

"کس سلسلہ میں؟"

"بس دکھا دیں"۔

"میں گاڑی بیچ تو نہیں رہا"۔

"بیچنے کو کون کہہ رہا ہے۔ مگر میں انہیں آپ کی گاڑی دکھانا چاہتا ہوں"۔

میں کسی قدر تامل کے ساتھ اپنی سیٹ سے اٹھا اور دفتر سے باہر آ کر انہیں اپنی

گاڑی کے پاس لا کھڑا کیا۔ اس شخص نے اس نووارد کو گاڑی بہت تفصیل سے دکھائی تعریف کی، زور اس پہ دیا کہ گاڑی کا انجن بالکل درست حالت میں ہے اور اصل چیز تو انجن ہوتا ہے۔

یہ ساری باتیں کر کے اس نے مجھے چابیاں لوٹائیں، رخصت کے لیے ہاتھ ملایا پھر نووارد سے کہا: "آئیے چلتے ہیں"۔

جاتے جاتے میرے کان میں کہہ گیا: "پیسے والی اسامی ہے۔ اسے گنوانا نہیں ہے"۔

میں نے تو مروت میں گاڑی دکھا دی تھی۔ مگر آدمی ایک دفعہ مروت میں آ جائے تو پھر آتا چلا جاتا ہے۔ اس کار ڈیلر نے مروت ہی مروت میں مجھ سے فروخت کے سارے مراحل طے کرائے اور اس خوش اسلوبی سے کہ آخر وقت تک مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ گاڑی کا سودا ہو رہا ہے۔

"پھر تو اچھا کیا تم نے اسے صاف جواب دے دیا لیکن اگر کبھی وہ تمہارے پیچھے آ جائے تو میں کیا کہوں"۔ زبیدہ نے ایک نیا سوال اٹھا دیا۔

"میرے پیچھے آ جائے"۔ میں چونک پڑا۔ ایک مرتبہ پھر سویا ہوا شک میرے اندر جاگا کہ کہیں یہی تو وہ آدمی نہیں ہے جو .... "کیا یہ آدمی کبھی پہلے بھی آیا تھا؟"

"نہیں۔ بس مجھے یونہی خیال آیا کہ اگر اسے یہ خیال ہے کہ ہم آشیانہ بیچ رہے ہیں تو یہ نہ ہو کہ روز آن کھڑا ہو"۔

"کیسے آن کھڑا ہو گا۔ بس اسے منہ نہیں لگانا ہے"۔

زبیدہ نے تامل کیا۔ پھر بولی:

"ہاں اگر ہم آشیانہ نہیں بیچ رہے ہیں تو پھر تو اسے منہ نہیں لگانا چاہیے۔ لیکن اگر بیچ رہے ہیں تو ....."

پتہ نہیں زبیدہ کیا کہنا چاہتی تھی، میں نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی:

"نہیں۔ ہم نہیں بیچ رہے۔ اس شخص کو بالکل منہ نہیں لگانا ہے ــــ"

۱۱

کتنے دنوں سے وہ مجھے یاد نہیں آئی تھی۔ بس جیسے دل و دماغ سے بسر گئی ہو۔ ہر جذبے کی ایک عمر ہوتی ہے، محبت کے جذبے کی بھی۔ اور ہر جذبہ کسی نہ کسی سہارے پرورش پاتا ہے۔ جذبے خلا میں تو پروان نہیں چڑھا کرتے۔ آپس میں کچھ ہوتا ہے بُرا یا بھلا تب ہی جذبے کو تقویت ملتی ہے۔ مگر یہاں تو بس دُور سے آتی ہوئی ایک شیریں آواز نے آن پکڑا تھا۔ پھر وہ آواز بھی غائب ہو گئی۔ آواز کا جادو کب تک چلتا۔ جب تک اس کے سحر میں رہا اسے ڈھونڈتا رہا، مضطرب پھرتا پھرا۔

"یار ممتاز، کیا کیا جائے۔ وہ تو چھُو ہو گئی"۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ تم نے اس کا پتہ معلوم کر لیا ہے"۔

"ہاں۔ وہ تو معلوم کر لیا تھا۔ بینک میں کام کرتی ہے۔ میں نے بینک میں جا کر معلوم کیا۔ پتہ چلا کہ وہاں سے ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ جس برانچ میں ٹرانسفر ہوا تھا اس کا پتہ لیا۔ وہاں پہنچا۔ پتہ چلا کہ لانگ لیو پر ہے۔ میں نے اس کے گھر کا پتہ معلوم کیا۔ مگر یہ دفتر کے لوگ بہت کمینے ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ کیا سمجھے آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال دیا۔ گھر کا پتہ نہیں بتایا"۔

"یار تھوڑا صبر کر لو۔ جانا کہاں ہے اسے۔ لیو ختم کرنے کے بعد تو آئے گی"۔

کتنا صبر کرتا۔ چند دن بعد پھر بینک کا پھیرا لگایا۔ پھر وقفہ وقفہ سے کتنے پھیرے

پھر یہ ہونے لگا کہ میں نے بیٹک میں قدم رکھا اور ایک نے دوسرے کو، دوسرے نے تیسرے کو اشارہ کیا اور سب کی نظریں مجھ پر، جیسے مجھے دیکھ کر محظوظ ہو رہے ہوں۔ کیا کرتا، سینہ پہ صبر کا پتھر رکھا اور ادھر کا پھیرا لگانا چھوڑ دیا۔ اور یوں بھی تو ہوتا ہے کہ آدمی ایک دفعہ صبر کر لے تو پھر صبر آتا چلا جاتا ہے اور شوق رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ہوا۔ کہاں ہر دم دل و دماغ میں بسی رہتی تھی کہاں اب کتنے کتنے دنوں تک اس کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔ خیال آتا بھی تو کسی جذباتی ہیجان کے بغیر۔ کبھی کبھی بھولی بسری باتوں کے ساتھ اس کا بھی خیال آ جاتا۔ اور میں کتنی بے تعلقی سے اپنے اس جذباتی طوفان کو یاد کرتا اس احساس کے ساتھ کہ ایک آندھی تھی جو آئی اور گذر گئی۔

تو میں تو اپنی دانست میں اس کے سحر سے نکل آیا تھا۔ کتنے دنوں سے وہ مجھے بالکل یاد نہیں آئی تھی۔ بس اچانک اس کے خیال نے مجھ پہ شبخوں مارا۔ میں اس شام گھومتا پھرتا آرٹ سنٹر میں جا نکلا جہاں تصویروں کی ایک نمائش کا افتتاح ہو رہا تھا۔ میں اس وقت آرٹ گیلری کی بالائی منزل میں تھا۔ تیسرے فلور پہ۔ تصویروں کے سامنے سے گذرتے گذرتے یوں ہی بے ارادہ میں نے نیچے کے فلور پر نظر ڈالی اور ایک دم سے ٹھٹھک گیا۔ ارے یہ تو ذکیہ ہے۔ میں تیزی سے پلٹا اور سیڑھیاں اترنے لگا کتنی تیزی سے میں سیڑھیاں اتر رہا تھا مگر سیڑھیاں تھیں کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ زینہ ایکدم سے کھنچ کر کتنا لمبا ہو گیا تھا۔ مگر میری ٹانگوں میں بھی اس آن بجلی بھر گئی تھی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ زقندیں بھر رہا تھا۔ ابھی سیڑھیوں پر تھا کہ اچانک ایک اور چہرہ سامنے آ گیا۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا:

"شیریں تم؟"

وہ بھی شاید مجھے دیکھ کر ٹھٹھکی تھی۔ مگر فوراً ہی سنبھل گئی۔

"اس میں اتنے تعجب کی کونسی بات ہے؟"

"میرا مطلب ہے کہ کب آئیں۔ اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ آنے کے بعد تو اطلاع دی ہوتی"۔

"چلو اب اطلاع ہو گئی"۔

"کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟"

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری ہی بات کی:

"تم تیزی میں کہیں جا رہے تھے۔ میں نے بیچ میں تمہیں روک لیا"۔

میں تو اسے دیکھ کر سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس کے یاد دلانے پہ یاد آیا:

"ہاں۔ ایک دوست تھے۔ کوئی بات نہیں۔ وہ انتظار کر لیں گے"۔

"نہیں۔ ان سے مل لو"۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم اوپر جا رہی ہو نا۔ تصویریں دیکھو۔ میں ان سے بات کر کے ابھی آیا۔ پھر باتیں ہوں گی"۔

میں عجلت سے نیچے آیا۔ گراؤنڈ فلور پر اس وقت بہت چہل پہل تھی۔ کتنی اچھی اچھی صورتیں امنڈی ہوئی تھیں۔ مگر وہ کہاں گئی۔ گھوم پھر کر دیکھا۔ ہر گوشے میں جا کر ٹٹولا کہیں نہیں نظر آئی۔ میں حیران کہ اتنی سی دیر میں وہ کہاں چھو ہو گئی۔

لپک کر کاؤنٹر پہ گیا اور گیلری کے انچارج سے پوچھا:

"معاف کیجیے۔ یہاں ذکیہ احمد تھیں کدھر چلی گئیں؟"

"ذکیہ احمد؟" انچارج نے ذہن پر زور ڈالا۔ "معاف کیجیے میں ان سے شناسا نہیں ویسے کچھ لوگ چائے کی طرف گئے ہیں۔ جن محترمہ کو آپ تلاش کر رہے ہیں شاید وہ وہاں ہوں"۔

تیزی سے اس گوشے میں گیا جہاں چائے کا اہتمام تھا۔ چائے پیتی خواتین میں سے

ایک ایک کی صورت دیکھی۔ جو میری طرف پشت کیے کھڑی تھیں بہانے بہانے سامنے جاکر ان کی شکلیں دیکھیں۔ کوئی کوئی پشت اتنی جاذب نظر تھی کہ گمان ہوا کہ شاید وہی ہے۔ کس عجلت میں سامنے جاکر اس کی صورت دیکھی کہ میں خود ہی اپنے اس اُتاؤلے پن پر شرمندہ ہو گیا۔

جب یقین ہو گیا کہ وہ اس گوشہ میں نہیں ہے تو پھر میں لپک کر باہر آیا۔ اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے سبزہ زاروں میں اور خوشگوار روشوں پر جہاں آرٹ کی دلدادہ خواتین اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں، نظر دوڑائی۔ وہ یہاں بھی نہیں تھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھر کر گیٹ تک گیا کہ شاید واپس جا رہی ہو۔ گیٹ سے باہر بھی نظر ڈالی۔ وہ کہیں نہیں تھی۔

سب طرف سے مایوس ہو کر میں نے سوچا کہ اب کیا کیا جائے۔ ارے ہاں شیریں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ واپس اندر گیا۔ گراؤنڈ فلور سے دوسرے فلور پر۔ دوسرے فلور سے تیسرے فلور پر۔ کہاں گئی وہ؟ سوچا کہ شاید میرا انتظار دیکھ کر نیچے چلی گئی ہو۔ واپس پھر گراؤنڈ فلور پر آیا۔ اور اب کے یہاں کا زیادہ تفصیل سے جائزہ لیا۔ نظر نہیں آئی۔ تو گویا وہ چلی گئی۔ میں اس کے اس رویّے پر حیران ہوا اور افسردہ بھی کہ ایک زمانے کے بعد ملی مگر کتنے رُوکھے پن کے ساتھ کہ ذرا میرا انتظار بھی نہیں کیا۔ شیریں تو بالکل ہی بدل گئی میں نے سوچا اور میرا دل بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر میں کتنا خوش ہوا اور اب کتنا ملول ہوا تھا۔

"بوجان۔ ایک خبر سناؤں۔ شیریں آئی ہے"۔

"شیریں؟" بوجان نے تعجب سے مجھے دیکھا۔

"ہاں شیریں۔ میں آرٹ سنٹر تصویروں کی نمائش پر گیا تھا وہاں اچانک اس سے مڈبھیڑ ہو گئی"۔

"اچھا! پھر کہاں ہے وہ؟"

"بوجان۔ اس نے کمال کیا۔ باتیں کرتے کرتے میں ذرا تصویریں دیکھنے لگا۔ وہ

نظروں سے ایسی اوجھل ہوئی کہ پھر نظر ہی نہیں آئی"۔

"اے لو۔ وہ چھلاوہ تھی کہ غائب ہو گئی"۔

"بوجان میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ میں خاصی دیر وہاں رہا کہ شاید یہیں کہیں ہو۔ سب لوگ چلے گئے ہیں تب میں وہاں سے نکلا ہوں۔ اس نے کمال ہی کر دیا"۔

"آخر کس باپ کی بیٹی ہے۔ خدا بخشے تمہارے چچا بھی ایسے ہی بے مروّت تھے۔ علی گڑھ میں جا کر ایسے بسے کہ پھر مرنے جینے کے موقعوں پر ہی ان کی صورت نظر آتی تھی اور اب تو فقہ ہی دوسرا ہے۔ تو کہاں میں کہاں؟" چپ ہو گئیں پھر افسردگی سے بولیں۔ "اس نگوڑی ہجرت نے تو خون کے رشتے تک ختم کر دیے"۔

پھر چپ ہو گئیں۔ کتنی دیر تک چپ رہیں پھر بولیں:

"بیٹے، اس کا پتہ کرو۔ اس لڑکی کی آنکھ میں تو سؤر کا بال ہے مگر ہمارا خون تو ابھی سفید نہیں ہوا ہے"۔

بوجان کی ان باتوں پر میں نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ ظاہر میں تو ایسے بنا رہا جیسے میں نے شیریں کی اس حرکت کو سرسری لیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اندر سے میں بہت مضطرب تھا۔ یوں جلدی ہی سونے کے لیے جا لیٹا لیکن رات گئے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ رہ رہ کے خیال آتا کہ شیریں نے یہ کیا کیا؟ صورت دکھا کے کیسی غائب ہوئی؟ واقعی وہ تو چھلاوہ بن گئی۔ کیوں ایسا کیا؟ کیوں پہ آ کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ سو سو طرف دھیان گیا۔ بس اسی میں وہ گھڑی یاد آ گئی جب اسے چھوڑ کر میں نیچے اترا تھا اور کس عجلت کے ساتھ گراؤنڈ فلور پر پہنچا تھا اور اسے نہ پا کر کاؤنٹر پہ جا کر انچارج سے ڈکیہ کے متعلق استفسار کیا تھا۔ اور اچانک میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ شاید اس نے میری بات سن لی تھی۔ شاید وہ میرے اترنے کے بعد وہیں سیڑھیوں پہ کھڑی دیکھتی رہی تھی کہ میں کیا کر رہا ہوں، کسے ڈھونڈ رہا ہوں؟ اس خیال نے تو میری سٹی گم کر دی۔ واقعی؟ کیا واقعی وہ بھانپ گئی تھی؟

کیا اس نے سن لیا تھا؟ پھر تو غضب ہو گیا۔ شیریں بھلا معاف کرے گی۔ جب اس نے اس وقت معاف نہ کیا تو اب کیسے معاف کر دے گی؟ اس وقت تو صرف شک تھا اور اب تو۔۔۔۔۔ بس اس کے ساتھ ہی مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا اور وہ وقت جب میں واقعی میں تھا۔ اب کی طرح تھوڑا ہی کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ میں ہوں۔ آدمی بھی کس طرح وقت کے ساتھ اپنے آپ کو گنواتا کھوتا چلا جاتا ہے۔ اور حالات و واقعات کو جانے دیجیے خود اس کی عمر اسے کتنا خراب کرتی چلی جاتی ہے کہ وہ پھر وہ رہتا ہی نہیں۔ میں اُس وقت جو تھا وہ میرے تصور میں گھوم گیا۔ اس زمانے کا اخلاق حسن متعلم علی گڑھ یونیورسٹی، کہ اب اس کے لیے وہ واحد غائب کے صیغے میں تھا۔ اپنے گھنے کالے بالوں اور کلین شیو کے ساتھ سیاہ شیروانی میں ملبوس۔ وہ ان دنوں اس دنیا میں تھا جو اپنی سیاہ چست شیروانیوں اور سیاہ برقعوں کے ساتھ الگ پہچانی جاتی تھی۔ ہر سیاہ برقعہ اس کے لیے ایک بھید تھا۔ ہر سیاہ برقعہ کو دیکھ کر تجسس میں پڑ جاتا کہ اس کے بیچ کونسا وجود ہے اور نقاب کے پیچھے کیسا چہرہ ہے۔ نقاب پڑی رہتی پھر بھی کسی نہ کسی طور ایک جھلک دکھائی دے ہی جاتی، کبھی گورے گال کا لشکارا، کبھی روشن آنکھوں کا ایک آن کا درشن۔ بہرحال ایک چہرہ تو بے نقاب تھا کہ آنکھوں میں سماتا دل میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ اب وہ چراغ حویلی کی فضا سے نکل کر ایک نئی فضا میں مل رہے تھے۔ ایک نئے جذبے کے ساتھ۔ اس نئے جذبے کے اثر میں آ کر انہیں یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھ اور جان رہے ہیں۔ شروع شروع میں وہ اپنی انگریزی سنوارنے کے لیے پورا پورا ناول اکٹھے پڑھ ڈالتے تھے۔ ناول کے ہیرو ہیروئن ان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ کبھی کیٹس کی کبھی شیلے کی نظم پڑھتے پڑھتے دفعتاً جھجک جاتے۔ پھر نظم اپنی جگہ پہ رہ جاتی اور وہ کسی اور ہی فضا میں پہنچ جاتے۔ ان کے درمیان ایک نئی جھجک اور ایک نئی بے تکلفی جنم لے رہی تھی۔ ایک نیا انجانا پن، ایک نئی جانکاری۔

دھیرے دھیرے کر کے وہ ایک دوسرے کے کتنے قریب آ گئے تھے مگر کتنی تیزی سے وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ دلوں کے قریب آنے میں کتنا وقت لگتا ہے پر جدائی کتنی جلدی ہو جاتی ہے۔ بس ایک شک کی لہر آئی اور دلوں میں فرق پیدا کرتی چلی گئی۔

"شیریں آجکل تمہاری رابعہ نہیں آ رہی؟"

شیریں ایکدم چونکی ہو گئی۔ اسے غور سے دیکھا: "میری رابعہ۔۔۔۔۔ کیوں تمہیں اس کا انتظار تھا؟"

وہ سٹپٹا گیا۔ "نہیں۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔ تمہارے پاس روزانہ جو آیا کرتی تھی۔"

"تو تم اس ٹوہ میں رہا کرتے تھے کہ وہ کب یہاں آتی ہے اور کب جاتی ہے!"

اس نے بڑی مشکل سے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے ایک راستہ نکالا: "میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا تھا کہ اس نے مجھ سے شیکسپیئر کے نوٹس مانگے تھے۔ میں نے سوچا کہ تمہاری سہیلی ہے چلو اس کی ہیلپ کیے دیتے ہیں۔"

"ہوں۔ یہ کب کی بات ہے۔ میرے سامنے تو یہ بات ہوئی نہیں تھی۔ میرے پیچھے ہوئی ہو گی۔ اور کیا باتیں ہوئی تھیں؟" شیریں کا شک اور تقویت پکڑ گیا اور وہ مزید الجھ گیا۔

وہ ایک بات کہہ کر پکڑا گیا۔ شیریں نے تو باقاعدہ جرح شروع کر دی۔ اس جرح میں اس کا وہی حال ہوا جو عدالتی جرح میں ایک ناتجربہ کار ملزم کا ہوتا ہے۔ شیریں کا شک بڑھتا چلا گیا، اس کے ساتھ ساتھ پارہ بھی چڑھتا چلا گیا۔ پہلے وہ غصے سے آگ بگولا ہوئی، پھر سسکیاں لے کر رونے لگی۔ بس اسی جوشِ گریہ میں اس نے ماں کے سامنے یہ مقدمہ پیش کر دیا:

"امی، یہ اخلاق میری سہیلیوں سے اکیلے میں کیوں باتیں کرتا ہے؟"

اور آن کی آن میں اس گھر میں اس کا چال چلن مشکوک ٹھہر گیا۔ بس اس کے ساتھ ہی دونوں کی منگنی کی جو بات چل رہی تھی، وہ بیچ ہی میں ختم ہو گئی۔

"اخلاق، تم ابھی جاگ رہے ہو؟"

"ہوں" ایک دم سے واحد غائب کے صیغہ سے واحد متکلم کے صیغہ میں۔ "ہاں نیند نہیں آرہی"۔

"تم تو لیٹتے ہی خراٹے لینے لگتے تھے۔ آج تمہیں کیا ہو گیا۔ اتنی دیر سے دیکھ رہی ہوں کروٹیں بدلے جا رہے ہو"۔

میں زبیدہ کو کیا بتاتا۔ میں نے الٹا اس سے سوال کر دیا: "مگر تم بھی ابھی تک نہیں سوئی ہو"۔

"مجھے تو اس مکان کی فکر کھائے جا رہی ہے۔" اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں، اس نے سوال داغ دیا: "پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"کس بارے میں؟" سوال اتنا اچانک تھا کہ واقعی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ زبیدہ نے کس بارے میں یہ پوچھا ہے۔

زبیدہ جھنجھلا گئی:

"کونسی بیٹی بیاہنے کو بیٹھی ہے جس کے بارے میں پوچھوں گی۔ آشیانے کے بارے میں پوچھ رہی ہوں"۔

"آشیانے کے بارے میں....؟" میرے لیے زبیدہ کے سوالوں کو سمجھنا اور جواب دینا اس وقت دوبھر ہوا جا رہا تھا۔ میں تو کسی اور ہی فضا میں پرواز کر رہا تھا، جہاں دنیا کے یہ قصے تھے ہی نہیں۔ بس شیریں تھی اور میں تھا۔ میں جو اس وقت تھا۔ مگر اسی کے ساتھ مجھے تعجب ہوا کہ شیریں کا تو ابھی تک کچھ بھی نہیں بگڑا۔ ہاں اس وقت گدڑی کچی تھی، اب پک کر بھر گئی ہے اور ترش گئی ہے۔ واقعی کیا ترشی ترشائی نظر آرہی تھی کہ

ہر خم ہر گولائی نمایاں اور متناسب۔ اور بھری ہوئی ایسی کہ اب چھلکی۔ اور اب مجھے افسوس ہونے لگا کہ اسے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں۔ کیسی غائب ہوئی، بس جیسے آنکھوں کے آگے بجلی کوند گئی ہو۔ اور پھر مجھے وہی خیال ستانے لگا کہ شاید اسے شک پڑ گیا تھا۔ مگر کمال ہے۔ اتنے برسوں بعد ملی اور اسی شکی طبیعت کے ساتھ۔ شک بھی، میں نے سوچا، کیا فتنہ ہے۔ دو دل کتنی مشکلوں سے، کتنے نازک مرحلے طے کر کے قریب آتے ہیں، گھل مل جاتے ہیں جیسے کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ مگر ایک ذرا سا شک آن کی آن میں ساری قربتوں، ساری ملاقاتوں کو اکارت کر دیتا ہے۔

"وہ پراپرٹی ڈیلر تو پھر نہیں ملا؟"

"پراپرٹی ڈیلر؟" میں چکرا گیا۔ چکرانا ہی تھا۔ میرا دھیان تو کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

"میں نے کوئی پہیلی تو نہیں پوچھی ہے۔" زبیدہ پھر جھنجھلا گئی۔ "سیدھی سی بات پوچھی ہے کہ پراپرٹی ڈیلر جو اس دن آیا تھا پھر ملا یا نہیں؟"

"نہیں"۔

"ایک دفعہ صورت دکھا کے کمبخت کہاں دفان ہو گیا"۔

اسی گھڑی جیل کے پہریدار کی آواز آئی: "جاگتے رہو"۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ رات واقعی بہت گذر گئی ہے۔

"زبیدہ اب سو جاؤ۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ اس مسئلہ پر پھر بات کریں گے"۔

"میں تو اچھی بھلی سو گئی تھی۔ تمہاری الٹی سیدھی کروٹوں نے میری نیند اچاٹ کر دی"۔

بہرحال میری بات نے اثر کیا۔ اس نے مسئلہ کو ملتوی کیا اور تھوڑی ہی دیر میں خراٹے لینے لگی۔ ادھر میں شیریں کے تصور کے ساتھ آدھا سو رہا تھا آدھا جاگ رہا تھا۔

۱۲

"اے دلہن، ہوش کی دوا کرو۔ خدا کا خوف کرو۔ مجھ بوڑھی پہ تہمتیں لگاتی تم اچھی نہیں لگتیں۔ بھلا میں کیوں پوت میاں کو سکھاتی پڑھاتی۔ میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں جو بیٹے بہو کی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہیں اور بیٹے کو اکیلا پا کے اس کے کان بھرتی ہیں۔ میں تو جو بات کرتی ہوں عالم آشکارا کرتی ہوں اور جو بات مجھ کال کھاتی نے کہی تھی تمہارے بھلے ہی کے لیے کہی تھی۔ اری بی بی مجھے اب اس گھر کو کونسا برتنا ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ سانس کی ڈوری اب ٹوٹی کہ اب ٹوٹی۔ اس گھر میں تو تمہیں ہی رہنا بسنا ہے۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ ابھی تو تم دو جنے ہو، جب اللہ رکھو پوت ہوں گے اور دلہنوں کی ڈولیاں آئیں گی پھر تمہیں اس گھر کی قدر معلوم ہوگی۔ پھر میری بات کی بھی قدر معلوم ہوگی۔ ویسے تو تم سیاہ کرو سفید کرو، میں کون دخل دینے والی۔ لیکن جب گھر اجڑنے کے سامان ہوں تو منہ میں تالا ڈال کے کیسے بیٹھ جاؤں۔ اور دنیا تم دونوں کو تو یہ کہہ کے بخش دے گی کہ ناتجربہ کار تھے عقل پہ پردہ پڑ گیا تھا۔ مگر میرے منہ میں گو دے گی کہ بڑھیل سفید چونڈا لیے بیٹھی رہی اور بیٹے کے گھر کی نیلامی کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہی تو مجھے سمجھانا تھا سمجھا دیا۔ باقی تمہیں اختیار ہے۔ تمہاری چیز ہے۔ تم ہی نے بنایا تم ہی اسے اُجاڑ دو۔" بولتے بولتے بوجان مجھ سے مخاطب ہوئیں: "میرے لال، تمہارا گھر ہے، میں کون ہوتی ہوں بولنے والی۔ بیچو، نیلام کرو۔ کسی کو بخش دو مگر تھوڑا انتظار کر لو۔ میں بس

آخری دموں پہ ہوں۔ یہ حسرت پوری ہو جانے دو کہ جنازہ اپنی ڈیوڑھی سے نکلے۔"

بوجان نے تو اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ زبیدہ چپ۔ میں بھی بالکل چپ رہا۔ سچ پوچھو تو زبیدہ کی باتوں سے میں اپنے اس ارادے میں کہ مکان کو بیچنا نہیں ہے، کچھ ڈانواڈول ہو گیا تھا اور بوجان نے جیسے میرے تذبذب کو بھانپ لیا ہو۔ مگر میں تو یہ سوچ کر پریشان تھا کہ گھر میں یہ کیا فساد شروع ہو گیا۔ وہ جو گھروں میں ساس بہو کے بیچ کٹاچھنی رہا کرتی ہے اس سے اپنا گھر آج تک ناآشنا تھا۔ ستم ظریفی دیکھو کہ جب تک ہم لوگ کرائے کے مکانوں میں رہے امن چین سے رہے۔ ساس بہو پرواری، بہو ساس کی خدمت گذار۔ مگر اپنے گھر میں آ کر بسے تو جھگڑے ٹنٹے شروع ہو گئے۔ سو طرح کے وسوسے، اندیشے، بدشگنیاں، الزام، جوابی الزام، زبیدہ کو میری طرف سے خوش فہمی پیدا ہو چلی تھی کہ میں اس کے اثر میں آ گیا ہوں اور مکان بیچنے پر آمادہ ہوں مگر یہ کہ بوجان موقعہ پا کر میرے کان بھرتی ہیں اور میں پھر بدک جاتا ہوں۔ ادھر بوجان بھی میری طرف سے اتنی ہی خوش فہمی رکھتی تھیں کہ مکان بیچنے کا شگوفہ ان کی بہو نے چھوڑا ہے۔ خیر یہاں تک تو وہ صحیح سمجھتی تھیں مگر اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ میں بیوی سے بہت دبتا ہوں اور دباؤ میں آ کر مکان بیچ ڈالنے پر طوعاً و کرہاً آمادہ ہو گیا ہوں۔ میں خوش فہمی کے ان دو پاٹوں کے بیچ میں پستا چلا جا رہا تھا۔

بوجان اور زبیدہ دونوں پر میں کتنا حیران تھا۔ بوجان پہ یہ سوچ کر کہ انھوں نے تو اپنی آنکھوں سے ست دو آباد گھروں کو اُجڑتے اور اونچی حویلیوں کو ڈھیتے دیکھا تھا، پھر بھی ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ گھر کتنے بے ثبات ہوتے ہیں۔ اصل میں زبیدہ سے زیادہ بوجان نے مجھے مکان بنانے پہ آمادہ کیا تھا۔ میرے اندر یہ بات اتار دی تھی تھوڑے وقت ہی کے لیے سہی کہ جب تک آدمی کا اپنا مکان نہیں ہوتا وہ اکھڑا ہوا رہتا ہے۔ میری سادہ دل ماں نے مطلق یاد نہ کیا کہ کتنے جمے جمائے گھرانے اور بڑھ کے پیڑ کی مثال

مستحکم لوگ اس کی آنکھوں دیکھتے گہری بنیادوں اور اونچی چھتوں والے محل دو محلوں سے نکلے اور پت جھڑ کے پتوں کی طرح دور کی گلیوں میں رُلتے پھرے۔ مگر مجھے رفتہ رفتہ یہ احساس ہوا کہ آدمی مکان تعمیر کرے تو ساتھ میں ایک کشتی بھی ضرور تیار کرے کہ کیا خبر ہے کہ کب گھر کے چولھے کی تہ پھٹے اور اس میں سے پانی اُبلنے لگے۔

زبیدہ پر یہ سوچ کر حیران ہوا کہ اس نیک بخت نے اس وقت مکان بنانے کیلیے میری تلی اکھاڑ دی تھی اور اب اسی مکان کو ٹھکانے لگانے کے لیے میری تلی اکھاڑے دے رہی تھی۔ ایک بیوی کا مکان بنانے کے لیے اصرار تو میری سمجھ میں آتا ہے کہ اس کے یہاں احساسِ تحفظ کے لیے خالی شوہر کا ہونا کافی نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ مکان کا ہونا بھی ضروری ہے اور بینک بیلنس کا ہونا بھی۔ شوہر، مکان، بینک بیلنس — یہ تین چیزیں مل کر بیوی کو احساسِ تحفظ عطا کرتی ہیں۔ مگر ایک بیوی شوہر سے مکان بیچ ڈالنے کا تقاضا کرے، تعجب کی بات تو یہ تھی۔ یہ تو خیر تھا ہی کہ جیں کی ہمسائیگی نے اسے ایک وہم میں مبتلا کر دیا تھا مگر پھر مجھے ایکدن یوں ہی خیال آیا کہ ہمارے اڑوس پڑوس سے کتنے ہی کوٹھی والے ہمارے دیکھتے دیکھتے اپنی کوٹھیاں بیچ کھوچ کر گلبرگ کے علاقہ میں جا بسے ہیں کیا وہ بھی ایسے ہی کسی وہم میں پڑ گئے تھے۔ نہیں ان کا مسئلہ دوسرا تھا۔ بات یہ تھی کہ یہ علاقہ اس مقامِ بلند سے جسے نئی زبان میں پوش لوکالٹی کہتے ہیں، بہت تیزی سے گر رہا تھا۔ اب سے پہلے یہاں آکر رہنا بسنا سٹیٹس کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اب یہاں سے نقل مکانی کر کے گلبرگ یا کسی ایسی نئی آبادی میں جا کر بسنا سٹیٹس کی نشانی بن گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ شہر کی توسیع کے ساتھ نئے نئے پوش علاقے وجود میں آ رہے تھے اور پرانے پوش علاقے زوال کرتے جا رہے تھے جیسے انہیں گھن لگ گیا ہو۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اس علاقے میں دیکھتے دیکھتے دکانیں بہت کھل گئی تھیں۔ موٹر ورکشاپس، جنرل سٹورز، ہوٹل، کباب بکنے کی دکانیں، پان سگریٹ اور کولڈ ڈرنکس کے سٹال غرض ہر رنگ کی دکان اب یہاں نظر

آنے لگی تھی اور ہر قماش کی مخلوق۔ مکینک، پرچون فروش، تھوک فروش، تیلی تمبولی، پراپرٹی ڈیلر، غرض یہ کہ رنگ رنگ کی چھوٹی مخلوق یہاں امنڈ آئی تھی۔ گویا اب یہ سڑک ٹھنڈی سڑک نہیں رہی تھی۔ جن راستوں پہ کسی زمانے میں صبح منہ اندھیرے اور شام پڑے شرفا چہل قدمی کرتے نظر آتے تھے وہ رستے اب ہر طرح کے ٹریفک اور ہر قماش کی مخلوق کے شور سے اور دھوئیں اور گرد کے اڑنے سے گرم گرد آلود ہو گئے تھے۔

ایک واقعہ اور ہوا۔ اچانک اس علاقہ میں زمین کی قیمتیں چڑھ گئیں۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ علاقہ کمرشیل ایریا بننے والا ہے۔ یہ کمرشیل ایریا بھی عجب متعدی شے ہے نئے شہروں میں بالکل آکاس بیل کی طرح پھیلتا ہے اور سرسبز علاقوں کو نگلتا چلا جاتا ہے۔ جیسے صحرائی علاقوں میں ریگستان پھیلتا ہے اور مرغزاروں نخلستانوں کو نگلتا چلا جاتا ہے تو کمرشیل ایریا اس شہر کی کتنی شاداب آبادیوں کو اپنی لپیٹ میں لینے کے بعد تیزی سے ہمارے علاقے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ادھر مجھے یہ سوچ سوچ کر وحشت ہو رہی تھی کہ اگر یہ علاقہ واقعی کمرشیل ایریا بن گیا تو انسانی مخلوق کی ریل پیل اور ٹریفک کا شور تو اس سرسبز علاقے کی چڑیوں کا جینا اجیرن کر دے گا۔ پھر وہ کاہے کو یہاں ٹھہریں گی۔ آدمی تو مکان تعمیر کر کے اپنے پاؤں میں بیڑیاں ڈال لیتا ہے۔ چڑیوں کے پاؤں میں ایسی کوئی بیڑی نہیں ہوتی۔ کسی علاقے کی آب و ہوا ان کے لیے سازگار نہ رہے تو انہیں کونسی طاقت وہاں باندھ کر رکھ سکتی ہے۔ تو اگر اس علاقے کی ہوا بدلی تو چڑیاں تو پھُر سے اڑ جائیں گی۔ اور ہر صبح کو جو میرے ہار سنگھار تلے سبھا جمتی ہے وہ بکھر جائے گی۔ پھر میں کیا کروں گا؟ اردگرد آدمی ہی آدمی ہوں اور چڑیا کوئی نہ ہو ایسی غیر انسانی صورتحال کا تصور میرے لیے سخت گھناؤنا تھا۔ وہ تو یہ کہیے کہ اس دھرتی پہ چرند پرند اور پھول اور درخت بھی ہیں۔ اگر صرف انسانی مخلوق ہوتی تو اس کے بیچ بسر کرنا کتنا اذیت ناک عمل ہوتا۔ تو جب میں نے آنے والی زندگی کا اس طرح تصور کیا کہ چڑیاں ہجرت

کر چکی ہیں اور ہار سنگھار کا پیڑ مُرجھا چکا ہے اور چاروں طرف آدمی ہی آدمی ہیں تو مجھے زندگی کا یہ نقشہ بہت مکروہ نظر آیا۔

زبیدہ نے جب میرے اس وسوسے کو سمجھ لیا تو پھر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جان لیا کہ اب اس کی بات بے اثر نہیں جائے گی۔ رفتہ رفتہ یہ صورت حال ابھری کہ اس علاقے سے نقل مکانی زبیدہ اور مجھے دونوں کو وارا کھانے لگی۔ زبیدہ کو یہ نظر آ رہا تھا کہ کمرشیل ایریا بننے کی صورت میں آشیانہ اچھے داموں نکل جائے گا جس سے گلبرگ میں اچھی بھلی کوٹھی تعمیر ہو سکے گی۔ اگر اس رقم سے پورا نہ پڑا تو اس نے یہ تو جان ہی لیا تھا کہ میں ٹپس لگا کر کہیں نہ کہیں سے قرضے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ بہر حال گلبرگ میں کوٹھی بن جائے گی۔ یوں سٹیٹس بھی بلند ہو جائے گا اور جمیل کی ہمسائیگی سے بھی نجات مل جائے گی۔ ادھر میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے پہلے کہ چڑیاں میری پھولوں کی کیاری سے ہجرت کر جائیں اور اس سے پہلے کہ میرے پھول پودے ٹریفک کے شور اور دھوئیں سے جھلس جائیں مجھے اس علاقے سے نکل جانا چاہیے۔ اس خیال نے دھیرے دھیرے اتنی شدت پکڑی کہ میں بالکل اس کی گرفت میں آ گیا۔ اس عالم میں مجھے اس پراپرٹی ڈیلر کا خیال آیا۔ تب میں دل ہی دل میں زبیدہ کی عاقبت اندیشی کا قائل ہوا جو پراپرٹی ڈیلر کو قطعی جواب دینے کے حق میں نہیں تھی۔ ایک تاسف کے ساتھ میں نے سوچا کہ خواہ مخواہ میں نے اسے دھتکارا۔ ڈور پہ لگائے رکھتا تو آج اس سے کام لیا جا سکتا تھا۔ اور کمال ہوا کہ جس دن میرے دماغ میں یہ بات آئی اس کے دوسرے دن ہی وہ آن موجود ہوا۔ میں تو ہکا بکا رہ گیا۔ کیا اسے القا ہوا تھا۔ میں ڈر گیا کہ یہ شخص کیا شے ہے۔ آدمی ہے یا جن ہے۔

اس دفعہ پراپرٹی ڈیلر سے میں بہت گرمجوشی سے ملا۔ زبیدہ کو اندر پتہ چلا کہ پراپرٹی ڈیلر آیا ہے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔ فوراً ہی چائے بنانے بیٹھ گئی۔ مجھے بلا کر سمجھایا کہ اسے پہلے کی طرح مت ٹرخا دینا۔ ذرا کریدو تو سہی کہ

زمینوں کا کیا بھاؤ جا رہا ہے اور اگر ہم اپنا آشیانہ بیچیں تو کتنے میں نکل جائے گا؟ مگر فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ اس نے غیر محتاط انداز میں بات کر دی ہے۔ سو اس نے ٹکڑا لگایا کہ بے شک ہم نہ بیچیں اور کونسا ابھی بیچ رہے ہیں مگر ہر بات کا پتہ تو ہونا چاہیے۔

میں زبیدہ سے سبق پڑھ کر باہر آیا اور پراپرٹی ڈیلر کے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ خیال تھا کہ وہ خود ہی مکانوں جائدادوں کی خرید و فروخت کا ذکر چھیڑے گا مگر اس نے اشارۃً بھی کوئی ایسا ذکر نہیں کیا۔ اور اور باتیں کرتا رہا۔ کچھ موسم کا ذکر، کچھ میرے مشاغل کے بارے میں پوچھ گچھ۔

آخر خود میں نے ہی ذکر چھیڑا: "کہیے آجکل آپ کا کاروبار کیسا جا رہا ہے؟"

"پچھلے دنوں تو مندا ہی رہا۔ ہاں اس وقت بہت اعلیٰ جا رہا ہے"۔

"اچھا؟"

"صاحب آپ کو تو پتہ ہونا چاہیے۔ آپ کے علاقے میں تو ان دنوں بہت خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ ایک دو کوٹھی والوں سے تو میں نے معذرت کر لی۔ انہیں بیچنے کی کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔ لوگ بھی تو ہتھیلی پہ سرسوں جماتے ہیں۔ میں نے معذرت کر لی کہ جناب ابھی تو میری مٹھی میں کوئی گاہک نہیں ہے"۔

"اچھا؟ مجھے تو پتہ نہیں مگر خرید و فروخت میں یہ گرما گرمی کیسے پیدا ہو گئی؟"

"صاحب بات یہ ہے کہ یہ علاقہ کمرشیل ایریا میں آ گیا ہے۔ بس سمجھو کہ فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس سے اچانک زمین کا بھاؤ چڑھ گیا ہے۔ کوٹھیوں والوں کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ منہ مانگی قیمت مل رہی ہے۔ تو اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ رہائش کے لیے تو یہ علاقہ اب موزوں رہا نہیں۔ تو ایک تو شرفا ویسے ہی یہاں سے جانے پہ تیار ہیں۔ پھر انہیں دام بھی اچھے مل رہے ہیں"۔

"واقعی یہ جگہ کمرشیل ایریا میں آگئی ہے؟"

"بالکل صاحب۔ فیصلہ ہو چکا ہے۔ فائل اس وقت گورنر صاحب کی میز پر ہے۔ ایک دو دن میں ان کے دستخط ہو جائیں گے۔ پھر دیکھیے یہاں کیسا انقلاب آتا ہے۔"

"ہاں۔ مگر اس علاقے کا سکون ختم ہو جائے گا۔"

"یہ تو ہے۔ یہاں کا سکون تو واقعی غارت ہو جائے گا۔ اتنا شور ہو جائے گا کہ آپ جیسے نفیس مزاج لوگوں کے لیے تو یہاں سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔"

"پھر تو کسی نہ کسی وقت یہ علاقہ چھوڑنا ہی پڑے گا۔ مگر بڑی مشکل ہے۔ اچھی کوٹھی میں تو زمین نایاب ہے۔"

"پیسہ پاس ہو تو پھر نایاب نہیں ہے۔ گلبرگ میں ابھی بہت گنجائش ہے۔ لوگ گلبرگ کی طرف بہت دوڑ رہے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ کینال بینک اس سے بہتر علاقہ ہے۔ جینٹری کا رجحان تو اسی طرف ہے۔ پھر وہاں زمین کا ریٹ بھی کم ہے۔"

"اچھا؟"

"بالکل۔ ابھی آپ کی کوٹھی کے دو جنٹلمینوں کو تو میں دلوا چکا ہوں۔ بہت سوہنی جگہ ملی ہے۔ اور سستی بھی ہے۔ ویسے صاحب زمین کی قیمت وہاں بھی بہت تیزی سے چڑھ رہی ہے۔ ایک مہینے کے اندر اندر ریٹ بائیس ہزار مرلہ سے پچیس ہزار مرلہ تک پہنچ گیا۔"

میں نے اس کا بیان بہت توجہ سے سنا۔ سوچ رہا تھا کہ مطلب کی طرف کیسے آؤں۔ یہ ظاہر بھی کرنا نہیں چاہتا تھا کہ مکان بیچنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ ظاہر کرنا مصلحت کے خلاف بھی تھا اور پھر آنے والے دنوں سے ساری بیزاری کے باوجود ابھی میں مذبذب تھا۔ خیر کچھ کہنے لگا تھا کہ کامریڈ آن دھمکا۔ بات منہ ہی میں رہ گئی۔ کامریڈ نے میز پہ چائے کی پیالیوں کے برابر اپنا تھیلا رکھتے ہوئے پراپرٹی ڈیلر کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

پراپرٹی ڈیلر کچھ سٹپٹا سا گیا۔ کیوں؟ میں نہیں سمجھ سکا۔

"سلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" کامریڈ نے پراپرٹی ڈیلر کے سلام کا جواب بہت روکھے لہجے میں دیا۔ مجھے لگا کہ وہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس حد تک کہ کسی قدر ایک دوسرے کو سمجھتے بھی ہیں۔ کامریڈ کی آمد نے پراپرٹی ڈیلر کو سٹپٹایا ہوا تھا ہی، ادھر میرا بھی حال یہ تھا کہ جیسے میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔

"کامریڈ، چائے چلے گی نا؟"

"کیوں، بہت جلدی میں ہو۔" کامریڈ نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "کیا کہیں جانا ہے؟"

"نہیں۔ جانا کہاں ہوتا۔ ٹھیک ہے، ٹھہر کے پئیں گے۔"

پراپرٹی ڈیلر اکھڑ تو پہلے ہی گیا تھا، کامریڈ کے ان فقروں سے جو بڑے معنی خیز لہجہ میں کہے گئے تھے بالکل ہی اکھڑ گیا۔ فوراً ہی کھڑا ہو گیا:

"اچھا جناب۔ مجھے اجازت دیجیے۔"

"اچھا پھر کسی وقت آیئے۔ باتیں ہوں گی۔" میں اسے گیٹ تک چھوڑنے گیا اور ایک دفعہ پھر اصرار کیا کہ کسی وقت ضرور آئے۔

واپس آ کر بیٹھا ہی تھا کہ کامریڈ نے ہلّہ بول دیا:

"یہ فراڈیا تمہارے پاس کیا لینے آیا تھا؟"

"تم اسے جانتے ہو؟"

"میں اس شہر کے ہر فراڈیے کو پہچانتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا اس کے ساتھ کیا چکر ہے۔ کیا کوئی نئی جائداد خرید رہے ہو۔ سودا سوچ سمجھ کے کرنا۔"

"نئی جائداد؟ تم نئی کی بات کر رہے ہو۔ یہاں پرانی بلائے جان بنی ہوئی ہے۔ میں اسے ٹھکانے لگانے کے لیے پھر رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔ گھونسلہ کو ٹھکانے لگا رہے ہو۔ لبو جان نے ایک مرتبہ مجھ سے ذکر کیا تھا بلکہ فریاد کی تھی کہ تمہارا دوست مکان بیچنے پہ تُلا ہوا ہے۔ تو گویا وہ بھوت تم پہ ابھی تک سوار ہے۔"

"یار اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا۔"

کامریڈ نے ایک زہر بھرا قہقہہ لگایا: "تیری ماں نے خصم کیا۔ بُرا کیا۔ کر کے چھوڑ دیا اور بھی بُرا کیا۔"

"ہاں یار یہی سمجھ لو۔ مگر کیا کیا جائے۔ ایک تو ہاؤسنگ کارپوریشن نے میری ایسی کی تیسی کر رکھی ہے۔ شروع میں قسطیں ادا نہیں کی تھیں ان کی سزا اب تک بھگت رہا ہوں۔ اس کے سُود نے میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ پھر جو قرض خواہ سوئے ہوئے تھے وہ بھی جاگ اٹھے ہیں۔ سو چتا ہوں کہ مکان کو اونے پونے بیچو اور قرض خواہوں سے اپنی جان چھڑاؤ۔"

"تو پھر بھابی کو بھی طلاق دے رہے ہو؟"

"کیا مطلب؟" میں نے غصے سے کامریڈ کو دیکھا۔

"دیکھو کامریڈ۔ اس میں بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں ہے۔" اب کامریڈ سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ "شریف لوگ زندگی میں ایک ہی دفعہ شادی کرتے ہیں اور ایک ہی دفعہ مکان بناتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ جتنے ارمانوں سے شادی کی جاتی ہے اتنے ہی ارمانوں سے مکان بنایا جاتا ہے۔ مگر ارمان تو بس ارمان ہی رہتے ہیں۔ شادی والے ارمان ہم نے تو ازدواجی زندگی میں کبھی پورے ہوتے دیکھے نہیں۔ مگر اس وجہ سے کوئی شریف آدمی بیوی کو طلاق تو نہیں دے دیتا۔"

میں خاموش سنتا رہا۔ اتنے میں اندر سے چائے کی ٹرالی آ گئی۔ کامریڈ کو چائے بنا کر دی۔ جب دیکھا کہ کامریڈ اب ٹھنڈا ہو گیا ہے تو میں نے کہا:

"یار کامریڈ۔ ایک بات بتاؤ۔ تم تو مکان بنانے کے قائل ہی نہیں ہو۔ اسے سخت

غیر انقلابی بلکہ انقلاب دشمن کاروبار سمجھتے ہو۔ سو تم نے مکان نہیں بنایا۔ پھر تم میرے مکان بیچنے کی مخالفت کیوں کر رہے ہو؟"

"میری چھوڑو۔ میں نے شادی بھی تو نہیں کی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے شادی کر لی ہوتی تو پھر تم بھی مکان بناتے۔"

"بناتا یا نہ بناتا' بنانے کے چکر میں ضرور مبتلا ہو جاتا۔"

"شاید کامریڈ۔ تیرے حق میں یہ اچھا ہی ہوتا۔"

"اپنے کام سے جاتا۔ یہی اچھا ہوتا نا۔"

"کامریڈ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ شادی، اولاد، مکان، یہ جھمیلے ضرور ہیں، مگر ضروری بھی ہیں۔ ان کی وجہ سے آدمی تھوڑا اٹک جاتا ہے۔ کچھ جڑ پکڑ لیتا ہے۔ نہیں تو زندگی کے بہاؤ میں آدمی تنکے کی طرح بہتا ہی رہتا ہے۔"

"دم کٹی لومڑیوں کا فلسفہ۔" کامریڈ نے تحقیر سے کہا۔

میں کچھ بولنے لگا تھا کہ کامریڈ نے بات کاٹ دی: "یار کوئی کام کی بات کرو۔ لاؤ سگریٹ پلاؤ۔"

میں نے سگریٹ پیش کی۔ کامریڈ نے سگریٹ سلگائی۔ لمبے لمبے کش لیے۔ اپنا تھیلا اٹھایا اور چل کھڑا ہوا۔

بہرحال کامریڈ اپنا کام کر گیا۔ فیصلہ پہ پہنچتے پہنچتے میں پھر ڈانوا ڈول ہو گیا۔

۱۳

دروازے پر پھر وہی دستک۔ اور میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے۔ جسم جیسے پتھر ہو گیا ہو۔

"اے ہے کانوں میں ڈاٹ لگائے بیٹھے ہو۔ سن نہیں رہے ہو۔ کسی نے بیل دی ہے۔"

"وہی ہو گا!"

"کون؟"

"وہی پراپرٹی ڈیلر۔ بور کر دیا اس شخص نے۔ دفتر میں ہوتا ہوں تو فون آ جاتا ہے، اور اتنی لمبی بات کرتا ہے کہ جی چاہتا ہے ریسیور پٹخ کر باہر نکل جاؤں۔ گھر آؤ تو خود آن دھمکتا ہے۔"

"تم تو بس کامریڈ جیسوں کے ساتھ خوش رہتے ہو جو گوبر کا چوتھ نہ لیپتے ہوں گا نہ پوتنے جوگا۔ کام کے آدمی سے بھاگتے ہو۔"

اتنے میں پھر بیل ہوئی۔

"اجی جاؤ۔ دیکھو نا۔"

اور میں بیزاری کے عالم میں اٹھا، دروازہ کھولا۔ میرا گمان صحیح تھا وہی پراپرٹی ڈیلر تھا۔ اسے برآمدے میں بٹھایا۔ زبیدہ نے فوراً چائے بھجوا دی۔ زبیدہ اس کی کتنی

تواضع کرنے لگی تھی۔ کامریڈ کی آمد کا تو اس نے کبھی اس طرح نوٹس نہیں لیا تھا۔ مجھے کہنا پڑتا تھا کہ زبیدہ، اپنا کامریڈ آ گیا ہے۔ ذرا چائے ہو جائے۔

اس کے چلے جانے کے بعد زبیدہ نے کتنے تجسس اور اشتیاق سے پوچھا:

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہی اول بٹال باتیں۔ فلاں سکیم میں پلاٹوں کے لیے قرعہ اندازی ہونے والی ہے فلاں علاقہ میں فلاں کوٹھی فروخت ہو رہی ہے۔"

"بخت مارے نے اب بتایا ہے جب قرعہ اندازی ہونے لگی ہے۔ پہلے سے بتایا ہوتا تو ہم بھی فارم داخل کر دیتے۔ اور وہ جو اس نے پہلے کنال بینک کے پلاٹوں کا ذکر کیا تھا ان کے متعلق اب کیا کہتا ہے۔"

"زبیدہ۔ ابھی تو ہم نہیں خرید رہے ہیں۔ جب فیصلہ کریں گے آشیانے کو چھوڑ دینا ہے تو پھر معلومات حاصل کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔"

"ایسے معاملوں میں، ہتھیلی پہ سرسوں نہیں جما کرتی ہے۔ ابھی سے معلومات حاصل کرتے رہو گے پھر وقت آنے پہ کچھ ہو سکے گا۔ اور میں کہتی ہوں کہ ہم نہ خریدیں لیکن ہمیں پتہ تو رہنا چاہیے کہ زمینوں کا کیا حال ہے۔ باقی رہی فیصلہ کی بات تو تم تو فیصلہ کر چکے۔ تمہیں تو جان کوئی فیصلہ نہیں کرنے دیں گی اور اوپر سے اس بخت مارے کامریڈ نے بیچ میں ٹانگ اڑا دی۔ خود ننگا پھرتا ہے۔ ہمارے مکان کے لیے اس کے پیٹ میں بہت درد اٹھ رہا ہے۔"

اب یہ روز کا معمول ٹھہرا تھا۔ دفتر کے اوقات میں فون۔ دفتر کے اوقات کے بعد گھر پہ نازل ہو جانا۔ اس کے جانے کے بعد زبیدہ کی طنز و تعریض سننا۔ اور فون سے اب میں کتنا ڈرنے لگا تھا۔ ایک وقت تھا اور کیا وقت تھا کہ میز پہ رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ میں گویا جان پڑ گئی تھی۔ کتنی زندہ شے نظر آتا تھا۔ اب ایک دفعہ پھر فون میرے لیے

زندہ چیز بن گیا تھا۔ مگر اب کے دوسرے رنگ سے۔ اب وہ میرے لیے ایک ڈراؤنی چیز تھا۔ فون کی گھنٹی بجی اور میرا دم خشک ہوا۔ کتنا ڈرتے ڈرتے میں فون اٹھاتا تھا۔ یہی کیفیت اس وقت ہوتی تھی جب گیٹ کی بیل بجتی تھی۔ اس شخص کا کتنا ڈر میرے اندر سما گیا تھا۔ جتنی دیر وہ مجھ سے باتیں کرتا رہتا اتنی دیر مجھے یہ خیال رہتا کہ وہ مجھ سے باتیں نہیں کر رہا ہے، میرے اندر جھانک رہا ہے۔ گھات میں بیٹھا ہے کہ میں اب گرا اور اب گرا۔ جب نہیں ہوتا تھا تب بھی یہی وہم رہتا تھا کہ کہیں آس پاس منڈلا رہا ہے۔ کبھی کبھی چلتے چلتے یوں لگتا کہ وہ پیچھے آ رہا ہے۔ پیدل چلتے ہوئے کتنی مرتبہ مجھے اس وسوسہ نے ستایا اور کتنی مرتبہ میں نے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھا۔

بس اس روز میرا اس سے خوش اخلاقی سے پیش آنا اور چائے سے تواضع کرنا غضب ہو گیا۔ وہ تو اسی روز مجھے کتنے غیر محسوس طور پہ راہ پہ لے آیا تھا مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عین وقت پہ کامریڈ آن ٹپکا اور میں بدک گیا۔ اس کے بعد عجب صورت حال پیدا ہوئی۔ جیسے شکار چوکنا ہو گیا ہو اور شکاری اس کے پیچھے لگا ہوا ہو۔ میں اب اسے اس طرح دھتکار بھی نہیں سکتا تھا جیسے شروع میں دھتکارا تھا۔ اس سے خائف بھی تھا اس کے اثر میں بھی تھا۔ ایسے اس سے ڈرتا تھا جیسے گائے قصائی سے ڈرتی ہے۔ ایسے اس کی طرف کھنچتا تھا جیسے سانپ سپیرے کی طرف کھنچتا ہے۔

گھر میں اب نقشہ یہ تھا کہ ایک تناتنی کی فضا۔ بوجان اور زبیدہ میں اب بحث تو نہیں ہوتی تھی مگر دونوں ایک دوسرے سے دور دور رہنے لگی تھیں۔ بوجان نے زبیدہ ہی کو نہیں مجھے بھی اب نصیحت کرنی بند کر دی تھی۔ چپ چپ رہنے لگی تھیں۔ جب دروازے کی گھنٹی بجتی اور پتہ چلتا کہ پراپرٹی ڈیلر آیا ہے تو تشویش کی ایک کیفیت ان کے چہرے پہ ظاہر ہوتی جسے زبیدہ تو نہیں مگر میں فوراً جان لیتا تھا۔ ویسے منہ سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔

عجب ہوا کہ بوجان کے چپ ہونے کے ساتھ ہمارے گھر میں بھی خاموشی نے ڈیرا کر لیا۔ اس گھر میں بولنے، باتیں کرنے کا سلسلہ تو بوجان ہی کی کسی بات سے شروع ہوتا تھا۔ اے دلہن۔ اے بیٹے۔ اے لال۔ کبھی زبیدہ سے خطاب کبھی مجھ سے خطاب۔ بس پھر شروع ہو جاتی تھیں۔ کوئی یہاں کی بات کوئی وہاں کی بات۔ اگلے پچھلے قصے، کب کب کی کہانیاں۔ ایک ان کے دم سے کتنے زمانے کتنے جگ اس گھر میں دم لے رہے تھے۔ وہ چپ ہوئیں تو جیسے اس گھر میں کرنے کے لیے کوئی بات ہی نہیں رہی۔ سب زمانے روپوش ہو گئے۔ میں نے اپنی طرف سے انہیں چھیڑا بھی۔ وہ باتیں بھی کیں جو ان کے تخیل کے لیے قمچی کا کام کرتی تھیں۔ چراغ حویلی کا ذکر بھی چھیڑ کر دیکھ لیا۔ ذرا جو بولی ہوں۔ لمبا ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئیں۔ ہاں ایک دن خود ہی شروع ہو گئیں۔ کتنی دیر سے چپ بیٹھی تھیں۔ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگیں:

"آجکل چراغ حویلی خواب میں بہت آ رہی ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ رات کیا دیکھا کہ جیسے حویلی میں سفیدی ہو رہی ہے۔ راج مزدور لگے ہوئے ہیں۔ پھر جیسے صفائی ستھرائی ہو گئی ہو۔ کیسی جگمگ رہی تھی ماشاءاللہ۔ مردانے کے صحن میں چھڑکاؤ پہ چھڑکاؤ۔ میں جیسے ملاں سے کہہ رہی ہوں کہ بہشتی جی کتنی مشکیں انڈیلو گے۔ اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ مشک خالی کی اور پھر کنوئیں پہ ڈول بھر بھر مشک میں اور پھر مشک سے صحن میں چھڑکاؤ۔ پھر جیسے میاں جان ہیں۔ تخت پہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ سفید براق کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ چہرے پہ ایسی رونق کہ کیا بتاؤں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ کتنی شفقت سے کہا کہ بہو تم آ گئیں۔ بس اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔"

بوجان چپ ہو گئیں۔ خیالوں میں غرق ہو گئیں۔ پھر خود ہی بولنے لگیں:

"پرسوں رات کی بات ہے۔ دیکھا کہ جیسے رات کا وقت ہے۔ حویلی کا بڑا پھاٹک بھاڑ سا کھلا ہوا۔ اندر اندھیرا۔ میں حیران ہو کے کہہ رہی ہوں کہ نہ جانے کیا بات ہے کہ آج

حویلی کا پھاٹک کھلا پڑا ہے اور ڈیوڑھی میں لالٹین بھی نہیں جل رہی - اندر سے دل دھکڑ پکڑ کرے کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں۔ پھر جیسے حویلی میں اکیلی بھٹک رہی ہوں۔ چلا رہی ہوں کہ اری او سکینہ، تو کہاں مر گئی۔ چولہا ٹھنڈا پڑا ہے۔ باورچی خانے میں جھاڑو بھی نہیں لگی ہے۔ کب ہنڈیا چڑھائے گی اکب کھانا پکے گا۔ اے لو! ابھی میں سکینہ کو آواز دے ہی رہی ہوں کہ میری آنکھ کھل گئی"۔

پھر چپ۔ گم سم۔ اپنے خیالوں میں غرق۔

یہ بوجان کی آخری گفتگو تھی۔ پھر نہیں بولیں۔ بیٹھی ہوئی یوں لگتیں کہ یہاں نہیں ہیں، کہیں اور پہنچی ہوئی ہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ کہاں پہنچی ہوئی تھیں۔ جسم یہاں تھا، روح چراغ حویلی میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ اصلی بوجان تو چراغ حویلی ہی میں تھیں۔ ان دنوں کیا دبدبہ تھا ان کا۔ نوکر چاکر، چھوٹے بڑے سب ان کے رعب میں رہتے تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے کہے کو ٹال جائے۔ حویلی میں زنانے سے مردانے تک ان کا حکم چلتا تھا۔ میاں جان تک رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ بھی وہی تھیں۔ تو اصلی بوجان تو وہ تھیں۔ یہ تو ان کی پرچھائیں تھی۔ جیسے اصلی بوجان وہیں حویلی میں رہ گئی ہوں۔ صحت گرتی جا رہی تھی۔ بدن پہ پہلے بھی ایسی کونسی بوٹی چڑھی ہوئی تھی مگر اب تو خدا جھوٹ نہ بلوائے بدن پہ تولہ بھر گوشت بھی نہیں تھا۔ سوکھ کے چرخ ہو گئی تھیں۔ خوراک بچھو کہ چڑیا کا چگا۔ چلنا پھرنا بھی اب موقوف تھا۔ نہیں تو گھر کے اندر شخ شخ چلتی ہی رہتی تھیں۔ صحن کے بیچ کھڑے ہو کر انگلی اٹھا کر دعا پڑھنے کا ورد بھی معطل ہو چکا تھا۔ بلکہ اب تو نماز بھی بیٹھے بیٹھے ہی پڑھ لیتی تھیں۔ بالکل ہی تھک گئی تھیں۔ مگر کسی حال میں بھی ہوتیں ہر دم ہر گھڑی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی رہتی تھیں۔

اس دن بھی چوکی پہ بیٹھی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ میرے ساتھ ٹھیکیدار کو گھر کے اندر آتے اور اندر باہر کا جائزہ لیتے دیکھا تو جیسے ہونٹ ایکدم سے سل گئے ہوں۔

پورا جسم ساکت۔ بس آنکھیں حرکت میں تھیں جیسے ٹھیکیدار کی ہر حرکت کا تعاقب کر رہی ہوں۔

اس میں میرا ارادہ شامل نہیں تھا۔ بس وہ پراپرٹی ڈیلر کسی گاہک کو لے کر ایک دم سے آن دھمکا۔ کس بے تکلفی سے تعارف کرایا:

"بختیار صاحب، یہ ہیں ہمارے اخلاق صاحب"۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا: "اخلاق صاحب، یہ اپنے بختیار صاحب آشیانہ دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ میں نے کہا کہ چلیے ابھی دکھائے دیتے ہیں"۔

"کس سلسلہ میں۔ میں اسے فی الحال بیچنے کی تو کوئی نیت نہیں رکھتا"۔

"لاحول ولاقوۃ۔ میں نے کب کہا کہ آپ اسے بیچ رہے ہیں۔ میں نے بختیار صاحب کے سامنے آپکے مکان کی تعریف کی۔ انہوں نے مکان دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا کہ کیا مضائقہ ہے۔ گھر کی بات ہے۔ اخلاق صاحب سے ایسی کوئی غیریت تو ہے نہیں"۔

میں نے تامل کیا۔ میرے تامل کو دیکھ کر بختیار صاحب خوش اخلاق سے بولے:

"جناب ہم آپ سے زبردستی کوئی سودا تو کرنے نہیں آئے ہیں۔ مگر اپنے ڈیلر صاحب نے آپ کے مکان کی اتنی تعریف کی کہ میرا بے ساختہ جی چاہا کہ چل کر اس مکان کو دیکھا جائے"۔

ڈیلر نے فوراً ٹکڑا لگایا: "بختیار صاحب آپ دیکھیں گے تو دیکھتے ہی رہ جائیں گے"۔

"مکان اچھا ہو تو اسے خواہ مخواہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر مکان خریدنا یا بنانا ہو تو اس سے بہت مدد ملتی ہے۔ ایک تصور قائم ہو جاتا ہے کہ مکان ایسا ہونا چاہیے"۔

پھر میں انکار نہ کر سکا۔ مکان دکھایا۔ بختیار صاحب نے دیکھا۔ ساتھ میں پراپرٹی ڈیلر نے بھی۔ اس نے بھی پہلی مرتبہ ہی یہ مکان اندر باہر سے دیکھا تھا۔ بغیر دیکھے ہی اس نے بختیار صاحب کے سامنے اس مکان کی تعریف کے پل باندھ ڈالے تھے۔ بہرحال بختیار صاحب مکان دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دیر تک باتیں کیا کیے۔ مکان کی تعریف کرتے رہے۔ مشورہ دیا کہ بیچئے مت۔ ایسے مکان روز روز نہیں بنائے جا سکتے۔ مگر

چلتے چلتے ٹکڑا لگا گئے: "ویسے اگر کبھی یہ مکان نکالنے کا خیال ہو تو مجھے ضرور یاد کیجیے۔"

بختیار صاحب اور پراپرٹی ڈیلر کو رخصت کر کے جب میں اندر آیا تو دیکھا کہ بوجان چوکی پہ گم سم بیٹھی ہیں۔ میں سٹپٹا کر فوراً شروع ہو گیا:

"یہ صاحب پتہ نہیں کہاں سے آن ٹپکے۔ پراپرٹی ڈیلر نے انہیں لا کے مجھ پہ مسلط کر دیا۔ مصر تھے کہ آپ کا گھر دیکھنا ہے۔ میں نے کہا دیکھ لیجیے مگر یہ مت سمجھیے کہ میں مکان کو بیچ رہا ہوں۔" میں نے جلدی جلدی یہ ساری باتیں ایسے کہیں جیسے بوجان کے سامنے اپنی صفائی پیش کر رہا ہوں۔

بوجان نے ذرا جو کسی ردِ عمل کا مظاہرہ کیا ہو۔ بس ایک دفعہ مجھے دیکھا ضرور ایسی نظروں سے کہ میں ڈھے ہی تو گیا۔ پھر اٹھیں اور آہستہ آہستہ چل کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

زبیدہ جیسے بوجان کے جانے کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ ان کے جاتے ہی بڑے بے صبرے پن سے پوچھا:

"اخلاق۔ انھوں نے کیا قیمت لگائی؟"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ ہمیں بیچنا ہی ہے تو سوچ سمجھ کے بیچیں گے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ کوئی منہ اٹھائے چلا آئے۔ قیمت لگائے اور ہم بیچ دیں۔"

"یہ میں کب کہہ رہی ہوں کہ ہم بے سوچے سمجھے اونے پونے بیچ دیں۔ ٹھوک بجا کے سودا کریں گے۔"

"ہاں ہاں میں تیرا احسان۔ مجھے تو پراپرٹی ڈیلر پہ بہت غصہ آیا۔ پہلے اس نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ کسی گاہک کو مکان دکھانے کے لیے لے کر آ رہا ہے۔ غیر آدمی کے سامنے اسے میں کیا کہتا۔ مروت میں مکان تو دکھا دیا مگر صاف کہہ دیا کہ فی الحال بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"یہ تو اچھا کیا۔ آنے والے کو بھی احساس رہے کہ ہم کوئی بہت ضرورتمند نہیں ہیں۔

اور بیچنے کی کوئی عجلت نہیں ہے۔ عجلت میں اچھے پیسے نہیں ملتے۔ مگر اندازہ تو کیا ہوتا کہ کیسی اسامی ہے۔ کتنے میں خریدنے کی نیت رکھتا ہے۔"

"خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔ کونسا بھاگا جا رہا ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی مجھے بوجان کا خیال آیا: "لگتا ہے کہ آج بوجان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

اور اس سے پہلے کہ زبیدہ کچھ کہتی میں اٹھا اور بوجان کے کمرے کی طرف ہو لیا۔

بوجان اس شام اپنے کمرے میں ایسی گئیں کہ پھر باہر نہیں نکلیں۔ میں نے جا کر دیکھا تو ان کی طبیعت بگڑی ہوئی تھی۔ پھر بگڑتی ہی چلی گئی۔

ہم دونوں نے تین راتیں ان کے سرہانے سوتے جاگتے گذاریں۔ زبیدہ نے حق یہ ہے کہ ان تین دنوں میں ان کی بہت خدمت کی۔ دل میں جو ایک پھانس پڑ گئی تھی وہ تو ویسی ہی رات نکل گئی۔ کس بے قراری کے ساتھ بوجان کی حالت کو اور گھڑی کی سوئی کو دیکھتی رہی۔ بار بار دعا کرتی کہ الٰہی رات خیریت سے گذر جائے۔

پہلی رات۔ دوسری رات۔ تیسری رات۔ بوجان کی پٹی تھی اور ہم دونوں تھے پوری رات آنکھوں میں کٹتی تھی۔ خیر اصل دیکھ بھال تو زبیدہ کر رہی تھی۔ میں تو بس اس کا حوصلہ بندھانے کے لیے پاس رہتا تھا۔ کچھ سوچتا ہوا کچھ جاگتا ہوا۔ ہاں تیسرے دن ہم دونوں کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ ایک تیسرے نے آ کر ہمارا بوجھ بٹا لیا۔ تیسرے پہر کا وقت تھا کہ دروازے پہ کوئی کار آ کر رکی۔ ہارن کی آواز پہ میں باہر گیا اور حیران رہ گیا:

"ارے شیریں تم؟"

"اب تم ہر مرتبہ مجھے دیکھ کر حیرت کا اظہار کرو گے۔" اور فوراً ہی لہجہ بدل کر بولی۔

"تائی اماں کا کیا حال ہے؟"

"دیکھ لو چل کر۔ ویسے تمہیں کس نے بتایا؟"

میرے اس سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سیدھی اندر گئی اور بوجان کے پلنگ کے پاس پہنچ کر ان پر جھک گئی۔

"تائی اماں۔ تائی اماں۔ آپ کیسی ہیں؟"

تائی اماں ہوش میں ہوتیں تو جواب دیتیں۔ وہیں پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر گم بیٹھی رہی پھر زبیدہ سے مخاطب ہوئی: "کب سے یہ حال ہے؟"

"دو دن ہو گئے۔ اچھی بھلی تھیں۔ برآمدے میں بیٹھے بیٹھے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ مجھے تو کوئی ایسا گمان بھی نہیں ہوا۔ اخلاق نے کہا کہ بوجان کی طبیعت ٹھیک نظر نہیں آتی۔ اندر آ کے دیکھا تو وہ تو بخار میں بھن رہی تھیں۔ بس پھر حالت بگڑتی ہی چلی گئی۔"

"کس ڈاکٹر کو دکھایا۔ کیا کہتا ہے۔ ہسپتال میں داخل کیوں نہیں کرایا۔" کتنی دیر تک یہی پوچھ گچھ کرتی رہی۔

"میں نے جب بوجان سے ذکر کیا کہ شیریں اسی شہر میں ہے تو بہت خوش ہوئیں۔ پھر بگڑنے لگیں کہ ساتھ لے کر کیوں نہیں آئے۔ روز پوچھتی تھیں کہ شیریں آئی نہیں۔ کیا بات ہے۔"

"ہاں مجھے سب سے پہلے تو تائی اماں کے پاس آنا چاہیے تھا۔"

"اس روز تو تم نے کمال کیا۔ ایسی اوجھل ہوئیں کہ میں ڈھونڈتا پھرا، تم کہیں نظر ہی نہیں آئیں۔ بہرحال تم نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر کیوں نہیں آئیں۔"

جواب میں اس نے مجھے ایسی تیز نظروں سے دیکھا کہ میں سٹپٹا گیا۔ میں نے فوراً بات بدلی: "زبیدہ۔ شیریں کے لیے چائے بناؤ۔"

"نہیں بھابی نہیں۔ میں چائے نہیں پیوں گی۔"

"تو۔ کیوں نہیں پیو گی؟"

"بیماری کے گھر میں ایسے تکلفات اچھے نہیں لگتے۔"

"نہیں۔ تکلفات بالکل نہیں ہوں گے۔ سیدھی سیدھی چائے ہوگی۔"

"آپ لوگ مجھے مہمان سمجھ رہے ہیں۔ میں یہاں تائی اماں کی خدمت کرنے کے لیے آئی ہوں۔ میں رات کو یہیں رہوں گی۔ تم لوگوں کو دو راتیں جاگتے گذر گئی ہیں۔"

"پھر کیا ہوا۔" زبیدہ نے کہا۔ "ایسے وقت میں جاگنا پڑتا ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ بیٹے بہو ہیں مگر تائی اماں میری بھی کچھ لگتی ہیں۔ کچھ ان کا حق مجھ پر بھی ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں شیریں ایسے ہو گئی جیسے وہ بہت دنوں سے یہاں رہ رہی ہو۔ اپنی تائی اماں کا چارج اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ زبیدہ سے کہا: "بھابی، آپ گھر کا کام دیکھیں۔ تائی اماں کو مجھ پہ چھوڑ دیں۔"

زبیدہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ گھر جو دو دنوں سے اجڑا پڑا تھا اسے درست کرنے لگی۔ وقفوں سے کمرے میں جھانک جاتی: "شیریں میری ضرورت تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ آپ بے فکر ہو کر اپنے کام کریں۔"

ہنڈیا روٹی اور گھر کے دوسرے کاموں سے فراغت پا کر جب زبیدہ آ کر بیٹھی تو شیریں نے جلدی ہی اسے آرام کرنے کا نوٹس دیدیا: "بھابی آپ دو رات کی جاگی ہوئی ہیں۔ آپ اپنے بستر میں جا کر فوراً سو جائیں۔"

"کیسے سو جاؤں۔ مجھے تو حالت سنبھلتی نظر نہیں آتی۔ پتہ نہیں رات کیسے گذرے۔"

"آپ سوئیں۔ میں جاگوں گی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو آپ کو اٹھا لوں گی۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "اخلاق تم بھی آرام کرو۔"

"بس تم اپنی بھابی کو سلا دو۔ اس غریب نے دو راتوں سے آنکھ نہیں جھپکی۔ میں تو سوتا جاگتا رہا ہوں۔ آج بھی یہی کروں گا۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں بیٹھے بیٹھے بھی سو لیتا ہوں۔"

"ہاں۔ پتہ ہے"۔ بہت بے تعلقی سے اور کسی قدر آہستہ سے کہا۔ پھر فوراً ہی زبیدہ کی طرف رُخ کر لیا۔ "بھابی۔ آپ آرام کریں"۔

زبیدہ تھوڑی ہچر مچر کے بعد یہ کہتے ہوئے کہ اچھا ذرا پیٹھ لگا لوں، قریب پڑے پلنگ پہ لیٹ گئی اور فوراً ہی ایسی سوئی کہ خراٹے لینے لگی۔

ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے سے بات نہ کر سکے۔ شیریں نے کافی دیر تک اپنے آپ کو بوجان کی تیمارداری میں مصروف رکھا۔ میں دیکھتا رہا کہ کس طرح وہ تیمارداری کے بہانے اپنے آپکو مصروف رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

"شیریں۔ بوجان نے پچھلے دنوں تمہیں بہت یاد کیا"۔ آخر میں نے زبان کھولی۔

شیریں جیسے شرمندہ ہو گئی، آہستہ سے بولی: "ہاں مجھے آنا چاہیے تھا"۔

"پچھلے چند دنوں سے انہیں خاندان والے بہت یاد آرہے تھے۔ ایک ایک کا نام لیا۔ ایک ایک کو یاد کیا۔ پھر ایک روز بیٹھے بیٹھے کہنے لگیں کہ نہ جانے کیا بات ہے آجکل خواب میں چراغ حویلی مجھے بہت دکھائی دے رہی ہے"۔

"چراغ حویلی"۔ شیریں نے آہستہ سے کہا اور اس انداز سے جیسے اسے بہت کچھ یاد آگیا ہو۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "شیریں، تمہیں چراغ حویلی یاد ہے؟"

"یاد کیوں نہ ہوتی۔ میں اتنی بچی تو نہیں تھی۔ مجھے وہاں کی ان دنوں کی ایک ایک بات یاد ہے"۔

"اچھا؟" میں نے تعجب سے کہا۔

مگر اس نے میرے ردِ عمل پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ یادوں کے رستے پر چل پڑی تھی۔ اس کے لہجے سے بے تعلقی کا رنگ خارج ہو چلا تھا۔ "اخلاق تمہیں یاد ہے جب

حویلی کی ممٹی پہ ایک دن مور آکے بیٹھا تھا اور ہم نے کہا کہ آؤ اسے پکڑتے ہیں"۔ یہ کہتے کہتے وہ ایک دم سے بدل گئی۔ اس کا وہ لیا دیا پن، وہ غیریت کا احساس بالکل ہی غائب ہو گیا۔ وہی بھولپن، وہی لہک جیسے اُس وقت کی شیریں واپس آگئی ہو۔ "کتنے چپکے چپکے ہولے ہولے قدم رکھتے ہوئے ہم چھت پہ گئے تھے۔ یہ لمبی دم اور ایک دم سے نیلی۔ بس دم کو پکڑنے لگے تھے کہ پھر سے اُڑ گیا"۔

اس کے بیان کے ساتھ ساتھ وہ پورا منظر میری آنکھوں میں پھر گیا۔ چراغ حویلی کی اونچی چھت، ممٹی پر بیٹھا ہوا مور، اس کی جھاڑ جیسی گھنی لمبی نیلی دم۔ اور جب وہ اچانک اُڑا تو بالکل ایسے لگا جیسے کوئی نیلا جزیرہ ہوا میں بہتا چلا جا رہا ہے۔

"اخلاق۔ اسے ہمارے آنے کا پتہ کیسے چل گیا تھا۔ ہم نے تو اپنے قدموں سے ذرا آہٹ نہیں ہونے دی تھی"۔

"ہمارا اسے پتہ نہیں چلا تھا"۔

"پھر؟"

"اسی وقت دور سے میاؤں میاؤں کی آواز آئی تھی نا؟"

"ہاں بالکل۔ میاؤں میاؤں کی آواز سنائی دی تھی"۔

"مورنی نے اسے پکارا تھا۔ وہ اس پکار کو سن کر تڑپ گیا"۔

"مور اپنی مورنی کو اتنا چاہتا ہے؟"

"ہوں"۔

ہم دونوں ہی اس فضا میں پہنچ گئے تھے یا جیسے اس نے مجھے انگلی سے پکڑا اور یادوں کی ہری بھری وادی میں اتر گئی۔ یادوں کی ہری بھری وادی میں قدم سے قدم ملا کر ایک لمبا سفر۔

"اخلاق تمہیں یاد ہے وہ جو ایک سٹا ماچڑیا منڈیر پہ آکے بیٹھا کرتی تھی۔ تم آ

شام پری کہا کرتے تھے"۔

"شام پری کو میں نے پکڑنے کے لیے بہت جتن کیے مگر وہ ہمیشہ جُل دے جاتی تھی"۔

شیریں کھلکھلا کر ہنسی۔ پھر ایکدم سے سنجیدہ ہوگئی:

"اخلاق!"

میں گھبرا گیا: "ہاں"۔

"حویلی میں جو کنواں تھا وہ تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے"۔

"کیا واقعی اس کے اندر جن رہتے تھے"۔

"پتہ نہیں۔ ویسے اس وقت میں یہی سمجھتا تھا"۔

"اس وقت ہم کتنے بے وقوف تھے۔ سمجھتے تھے کہ کنوؤں میں جن رہتے ہیں"۔

"اس وقت ہم کچھ نہیں جانتے تھے"۔

"ہاں۔ اس وقت ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔ دنیا کی کسی بات کا پتہ نہیں تھا۔ شاید انہیں دنوں ہم اچھے تھے"۔ شیریں اداس ہوگئی۔

ایک یاد سے دوسری یاد، دوسری یاد سے تیسری یاد، کس طرح سب یادیں ایک دوسری میں بندھی ہوئی، آپس میں گتھی ہوئی تھیں۔ موتیوں کی ایک لمبی لڑی کچھ سلجھی ہوئی کچھ الجھی ہوئی۔ یادیں امنڈ گھمنڈ آتی چلی جا رہی تھیں۔

"اخلاق تمہیں یاد ہے حویلی کے احاطے میں وہ جو پیڑ تھے نا، کتنے گھنے اونچے پیڑ تھے۔ وہ جو آم کا پیڑ تھا کتنا ہرا بھرا اور گھنا تھا۔ ایک دفعہ ہم چڑھتے چڑھتے کتنے اونچے چڑھ گئے تھے"۔ اور یہ کہتے کہتے وہ اچانک رک گئی۔ میں بھی ٹھٹھک گیا۔ ایک دم سے سب کچھ یاد آگیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب شیریں نے نیا نیا دوپٹہ اوڑھنا شروع کیا تھا۔ سینہ

اب ڈھکا رہنے لگا تھا اور ناک میں نیم کا فقط تنکا۔ انہیں دنوں ناک چھدی تھی۔ میری انگلی بار بار اس کی ناک پر جاتی تھی۔ کتنا بدکتی تھی میری اس حرکت سے: "مت چھوؤ جی۔ میری ناک دکھتی ہے"۔ اصل میں نیم کے تنکے کے ارد گرد جو جگہ سرخ ہوگئی تھی اسے چھونا مجھے اچھا لگتا تھا۔ پھر جب وہ بدکتی تھی تو اور بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ ایک گرم دوپہر تھی۔ ہم دونوں خس کی ٹٹیوں والے بڑے کمرے سے چپکے سے نکل کر احاطے میں پیڑوں کی چھاؤں میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ ہرے بھرے گھنے آم کے پیڑ کے نیچے پہنچ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ یہ بڑی بڑی امیاں لٹک رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ کس طرح لہراتی تھیں۔

"آؤ امیاں توڑیں"۔ میں نے تجویز پیش کی۔

"بہت اونچائی پہ ہیں"۔

"پھر کیا ہوا؟"

سہارا دے کر شیریں کو تنے سے اوپر کھسکایا۔ پھر خود لپک کر چڑھ گیا۔ پھر ہم دونوں ایک گدے سے دوسرے گدے پر، دوسرے گدے سے تیسرے گدے پر چڑھتے چلے گئے۔

"بس بھئی۔ اب اور اوپر نہیں جائیں گے نہیں تو گر پڑیں گے"۔

واقعی ہم بہت اوپر چلے گئے تھے۔ اور پتوں میں چھپ گئے تھے۔ پتوں میں چھپے ایک ڈال پہ پاس پاس بیٹھے ہم امیاں توڑ کے کھاتے رہے۔

"بہت کھٹی ہے"۔ اس نے منہ بگاڑ کے کہا۔

"پھر میں چکھوں"۔ میں نے اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر امیا اپنے منہ میں رکھ لی۔

"کوئی بھی کھٹی نہیں ہے۔ بہت مزے کی ہے"۔

"ہماری امیا ہمیں دیدو"۔

میں اس کی درخواست کو خاطر ہی میں نہیں لایا۔ کتر کتر کے مزے لے لے کر

کھاتا چلا گیا۔ اس نے چھیننے کی، میں نے بچانے کی کوشش کی۔ اس چھینا جھپٹی میں میرا ہاتھ اس کی ناک پر جا لگا۔ وہ تڑپ ہی تو گئی۔

"اوئی مر گئی"۔

"چوٹ لگ گئی۔ اچھا لا، میں ٹھیک کرتا ہوں"۔ میں نے انگلی کی پور منہ کی بھاپ سے گرم کی اور چھدرے ہوئے نتھنے پر اسے آہستہ آہستہ پھیرا۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ۔ اسے آرام آتا چلا گیا۔ آنکھیں مندتی چلی گئیں۔ میں نے منہ ناک کے قریب لا کر دکھتی جگہ کو بھاپ دینی شروع کر دی۔ پھر آہستہ سے ہونٹ اس جگہ پر رکھ دیے۔ کتنی دیر رکھے رہا۔ ہم دونوں اس تنگ جگہ میں ایک گدے پر بیٹھے بیٹھے کتنے قریب آ گئے تھے۔ جیسے ایک دوسرے کے ساتھ چپک گئے ہوں۔ دوپٹہ سرکتے سرکتے نیچے جا گرا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ الگ سرکتے ہوئے کہا: "ہٹ، میرا دوپٹہ گر گیا"۔ بغیر دوپٹے کے اسے دیکھ کر میں کتنا حیران ہوا۔ یہ وہی شیریں تھی کہ جب ابھی دوپٹہ اوڑھنا شروع نہیں کیا تھا تو بالکل لڑکوں کی طرح لگتی تھی اور اب.......... اس نے مجھے گھورتے دیکھا تو سٹپٹا گئی: "بے شرم"۔ اور درخت سے نیچے اتر گئی۔

ہم دونوں یادوں کی شاداب وادی سے واپس آ گئے تھے مگر سٹپٹائے ہوئے تھے جیسے ابھی ابھی یہ واقعہ گذرا ہے۔ شیریں کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو اس نے بوجان کی نبض دیکھنی شروع کر دی۔ پھر سانس کی آواز کو غور سے سنا۔ گھبرا گئی:

"اخلاق دیکھو، تائی اماں کے سانس کی آواز کیسی ہے؟" پھر بہت عجلت میں زبیدہ کو جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ "بھابی، ذرا اٹھو تو سہی"۔

زبیدہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ "کیا بات ہے؟"

"ذرا آ کے دیکھو"۔

زبیدہ دوڑ کے بوجان کے سرہانے پہنچی۔ سانس کی آواز غور سے سنی۔ سخت تشویش

کے لہجہ میں بولی: "یہ تو سانس چل رہا ہے"۔

میں نے گھڑی پہ نظر ڈالی۔ "اب تو صبح ہونے کو ہے۔ ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں"۔

فون کی طرف لپکا۔ ڈائل بار بار گھمایا۔ نمبر نہیں مل رہا تھا۔ شیریں نے پکارا:

"اخلاق ٹیلی فون کو چھوڑو۔ یہاں آ کے تائی اماں کے قریب بیٹھو"۔

میں نے شیریں کے لہجہ کی گھمبیرتا سے اندازہ لگایا کہ بوجان پہ کونسی گھڑی گذر رہی ہے۔ ٹیلی فون چھوڑ خاموشی سے بوجان کے قریب آ کر سرہانے کھڑا ہو گیا۔

ہم تینوں کھڑے رہے۔ بوجان کا سانس چلتا اکھڑتا دیکھتے رہے۔ سانس چلتا آخر کے تئیں بند ہو گیا۔ شیریں نے جھک کر دیکھا۔ جسم کو چھوا۔ پھر یوں کیا کہ بہت آہستہ سے بوجان کی آنکھیں بند کیں، گردن بہت دھیرے سے سیدھی کی:

"بھابی پیر سیدھے کر دو"۔

اور پورے بدن کو چادر سے ڈھانک دیا۔ اس طرف سے فراغت پا کر میرے قریب آئی۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ "اخلاق۔ تائی اماں ہمیں چھوڑ گئیں"۔ اور میرے سینے سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے کتنی مشکل سے اسے سنبھالا۔

تھوڑی دیر میں شیریں خود سنبھل گئی۔ دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں پونچھیں۔ ایک احساس ذمہ داری کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی اور بہت سنجیدگی سے مجھے اور زبیدہ کو ہدایات دینی شروع کر دیں۔

"اخلاق عزیزوں کو اطلاع کر دو"۔

اس ہدایت نے مجھے بوکھلا دیا۔ "ہمارے کون عزیز ہیں اس شہر میں۔ مجھے تو کسی کے متعلق معلوم نہیں ہے"۔

"میں بتاتی ہوں۔ فون لاؤ"۔

میں فون اٹھا لایا۔ اس نے پرس سے ڈائری نکالی۔ نام لے لے کر فون نمبر بتاتی گئی۔

میں ڈائل گھماتا گیا۔ میں حیران تھا اتنے زمانے سے اس شہر میں رہ رہا تھا اور احساس ہی نہیں تھا کہ اس شہر میں ہمارے کتنے عزیز موجود ہیں۔ وہ انہیں دنوں اس شہر میں وارد ہوئی تھی اور اس کے پاس ایک ایک عزیز کا پورا پتہ معہ فون نمبر کے موجود تھا۔

"شیریں۔ تم کل بھی دفتر نہیں گئیں۔ آج بھی نہیں گئیں۔ اپنے دفتر کو اطلاع تو دیدی ہوتی۔ مجھے نمبر بتاؤ۔ میں فون کر دوں"۔

"دفتر کو اطلاع ہے۔ جب مجھے پتہ چلا تھا تب ہی مجھے ایک دھڑکا سا لگ گیا تھا دفتر میں اطلاع کر کے ادھر آئی تھی"۔ رکی، پھر بولی: "میں کتنی دور سے کھنچ کر یہاں پہنچی ہوں۔ بے فکر نیویارک میں بیٹھی تھی۔ سان نہ گمان۔ اچانک اپنے انسٹی ٹیوٹ کی سردے ٹیم کا ادھر کا دورہ نکل آیا اور میرا نام اس میں آگیا۔ بس نانی اماں کی صورت دیکھنی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ان کی صورت تو دیکھ لی۔ اپنی صورت نہیں دکھا سکی۔ ۔ ۔ ۔ بس مجھ سے کوتاہی ہو گئی۔ جیسے اب یہاں آئی تھی ویسے ہی پہلے میں ادھر آجاتی۔ کئی دفعہ ارادہ بھی کیا مگر۔ ۔ ۔ ۔" کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

زبیدہ کہنے لگی: "آخری دنوں میں تو ایسا ہو گیا تھا کہ خاندان کے ایک ایک فرد کا نام لے کر یاد کرتی تھیں۔ تمہارے بارے میں کتنی مرتبہ اخلاق سے پوچھا 'اے بیٹے، شیریں کا پتہ کرو۔ ادھر آتی کیوں نہیں؟'"

"ہاں۔ بزرگ تو بچوں بڑوں سب کو یاد رکھتے ہیں۔ خاندان کتنا بکھر گیا تھا۔ مگر ایک ان کی ذات کی وجہ سے آپس میں ایک تعلق قائم تھا، جیسا کیسا بھی تھا۔ نانی اماں اس خاندان کی آخری بزرگ تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے سروں پر آخری سایہ۔ اب ہمارے سروں پہ

کوئی سایہ نہیں ہے"۔ شیریں کی آواز بھرانے لگی تھی۔ چپ ہو گئی۔

"بہت ڈھارس تھی ان کے دم سے۔ بوجان نہ ہوتیں تو اللہ قسم میرا تو اس گھر میں دم الٹ جاتا"۔

"بھابی، آپ نے بوجان کا حویلی والا زمانہ نہیں دیکھا۔ حویلی انہیں کے دم سے حویلی نظر آتی تھی۔ اخلاق، تمہیں یاد ہے۔ ان کی ڈانٹ سے ہماری میاں مر جاتی تھی۔ باپ رے باپ جتنی مہربان تھیں اتنی ہی سخت بھی تھیں۔ جب اپنے چھپر کھٹ پہ سامنے پاندان رکھ کر اور ہاتھ میں سروطہ لے کر بیٹھتی تھیں تو کتنا دبدبہ ان سے ٹپکتا تھا اور کس وقار کے ساتھ حکم دیتی تھیں۔ نوکر چاکر، چھوٹے بڑے، سب کی ایک ایک حرکت پر ان کی نظر رہتی تھی"۔

"مگر یہاں آکر بالکل بدل گئی تھیں"۔ میں نے بتایا۔ "کسی معاملہ میں دخل نہیں دیتی تھیں بس جیسے حویلی سے نکل کر مرجھا گئی ہوں۔ پھر مرجھاتی ہی چلی گئیں"۔

"وہاں کتنی سرخ و سفید تھیں۔ اور اشرفی کی چھینٹ والے تنگ پاجامہ میں انکی پنڈلیاں کتنی کسی کسی نظر آتی تھیں"۔

"اب تو یہ حال تھا"۔ زبیدہ نے کہا "کہ ہڈیاں ہی ہڈیاں۔ تولہ بھر گوشت رہ گیا ہوگا۔ باقی ہڈیاں ایسی کہ ایک ایک گن لو"۔

بوجان اپنے چھریرے بدن کے ساتھ میرے تصور میں گھوم گئیں: "عمر کا سفر بھی کتنا تباہ کن ہوتا ہے اور وقت آدمی کے ساتھ کیا کچھ کر ڈالتا ہے"۔

"ہاں وقت"۔ شیریں بس آہستہ سے اتنا کہہ کر چپ ہو گئی اور افسردہ بھی۔

شیریں ہمارے ساتھ سوئم تک رہی۔ کتنا گھل مل کر رہی جیسے برس برس سے ہم اسی طرح

گھلے ملے چلے آرہے ہیں۔ غیریت کا، دوری کا ذرا جو اس نے احساس ہونے دیا ہو۔ ہر وقت باتیں۔ ان دو ڈھائی دنوں میں کتنی باتیں کر ڈالی تھیں ہم نے۔ سب چراغ حویلی کے دنوں کی باتیں۔ ہر بات کی ایک ایک تفصیل۔ اپنے سارے بچپن لڑکپن کو کھونڈ ڈالا۔ مگر اس سفر میں ہم دونوں ایک مقام پر جاکر رک جاتے تھے۔ بس ایک دفعہ میں نے جھجکتے جھجکتے اس سرحد کو عبور کرنے کی کوشش کی تھی۔

مگر شیریں نے اتنی تیزی سے بات کاٹی کہ دوبارہ سرحد عبور کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑی۔

سوئم کے دوسرے دن اس نے اپنے دفتر فون کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں گاڑی دروازے سے آن لگی۔

"لو گاڑی آگئی۔ بھابی میرا جانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا مگر دفتر کی وجہ سے جانا پڑ رہا ہے۔"

زبیدہ نے کتنے تشکر آمیز لہجہ میں کہا: "شیریں، تم نے ہمارا بہت ہاتھ بٹایا۔ تم نہ ہوتیں تو ہم کیا کرتے۔ یہاں کون تھا ہمارا۔ جب بوجان کی حالت بگڑی تھی تو میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے کہ اگر ایسی ویسی بات ہو گئی تو میں اکیلی کیا کروں گی۔ اللہ قسم تم تو بالکل رحمت کا فرشتہ بن کر آئیں۔"

"بھابی۔ تم تو ایسے میرا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ جیسے میں کوئی غیر ہوں۔ اور میں نے آکر کیا کیا۔ تائی اماں نے تو مجھے خدمت کا موقعہ ہی نہیں دیا۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔

جب وہ کار میں بیٹھنے لگی تو میں نے تقریباً کار کے اندر منہ ڈال کر آہستہ سے کہا جیسے راز کی بات ہو:

"سنو!"

"ہاں"۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

"آؤ گی؟"

تامل کیا۔ پھر آہستہ سے کہا: "اچھا۔"

۱۴

دروازے پر کسی گاڑی نے ہارن دیا میرے وجدان نے کہا کہ ہو نہ ہو وہی ہے۔ لپک کر دروازے پر گیا وہی تھی کتنی کھلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ پچھلے دن تو سوگ کے دن تھے ایک زمانے کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا، دیکھ کر حیران ہوئے، اس موت کی فضا میں مل کر بیٹھے، گذرے دنوں کو یاد کیا۔ جانا کہ اپنے آپ کو پا رہے ہیں، کم از کم مجھے تو بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں کھو گیا تھا اور اب اپنے آپ کو پانے لگا ہوں۔ ایک غم نے ہمارا ملاپ کرایا تھا اس غم نے اپنا کام انجام دیا اور چھنٹ گیا۔ کوئی غم پائیدار نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ ناپائیدار موت کا غم ہوتا ہے جس دن نوجوان کا انتقال ہوا ہے اس دن ہمیں دنیا اندھیر نظر آرہی تھی۔ مگر دوسرے ہی دن اندھیرا چھنٹ گیا۔ باتیں شروع ہو گئیں گویا نوجوان کے گذر جانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس بہانے ہم اپنے کھوئے ہوئے دنوں کی تلاش میں نکلیں اور اب تو سوئم ہوئے بھی کئی دن ہو چکے تھے سوگ کی فضا بالکل چھنٹ چکی تھی اس گھڑی وہ کتنی نکھری نکھری نظر آرہی تھی۔

"ارے شیریں تم؟"

"پھر تم نے حیرت کا اظہار کیا۔ مجھ میں کیا ہے کہ جب مجھے دیکھتے ہو حیران ہوتے ہو۔"

"حیرت کے پردے میں اصل میں مسرت کا اظہار ہوتا ہے۔"

"کار سے اترتے ہوئے بولی" آرٹ سنٹر میں آج کوئی نمائش اوپن ہو رہی ہے۔

چلوگے نہیں؟" یہ کہتے کہتے اندر آئی" بھابی فوراً تیار ہو جاؤ، تمہیں پینٹنگ کی نمائش میں لے کر چلتے ہیں۔"

"شیریں کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اگر پیچھے کوئی آگیا تو کیا کہے گا کہ ابھی دسواں بھی نہیں ہوا، بیٹے بہو نے سیر و تفریح شروع کر دی۔"

شیریں شرمندہ ہو گئی۔

"اچھا ایسا کرتے ہیں" میں نے تجویز پیش کی" میں شیریں کو کمپنی دیتا ہوں۔ نمائش دیکھنے تو بہرحال مجھے جانا ہی تھا"

"یہ ٹھیک ہے" زبیدہ نے کہا" تم ہو آؤ۔ کوئی ایک تو گھر پہ رہے۔"

کتنے خوش خوش ہم گھر سے چلے تھے شیریں کتنی چہک رہی تھی۔

"ایک تجویز" مجھے دفعتاً سوجھی۔"

"کیا تجویز ہے"؟

"نمائش کونسی صحیح وقت پہ اوپن ہو جائے گی۔ پہلے ایک ایک پیالی چائے ہو جائے چل کر کسی پرسکون گوشے میں بیٹھتے ہیں۔"

شیریں نے تجویز بلا تکلف منظور کر لی۔ گاڑی آرٹ سنٹر کی بجائے کیفے وکٹوریہ کی طرف مڑ گئی۔

کیفے وکٹوریہ کے ایک خاموش گوشے میں ہم کتنی دیر بیٹھے رہے۔ مشترکہ یادوں کے سہارے ماضی میں تاک جھانک کرتے رہے۔" اخلاق تمہیں یاد ہے نا جب ......" اور پچھلی کسی یاد کو اس طرح کریدا کہ ایک ایک تفصیل سنا ڈالی۔ اس کا چپ ہونا۔ تو میرا رواں ہو جانا" شیریں تمہیں یاد ہے یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم ......"

"سب یاد ہے اخلاق مت یاد دلاؤ۔" ابھی کتنی خوش تھی۔ ایک دم سے اداس ہو گئی۔

"یاد بھی نہ کریں۔"

"اس وقت تو یاد کر کے خوش ہو لیں گے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوگا۔ یاد ہے ہم نے گھر بیٹھ کر چراغ حویلی کی کتنی باتیں کی تھیں اس وقت پچھلی باتوں کو یاد کر کے کتنا جی خوش ہوا تھا کتنا سکون ملا تھا۔ کتنے زمانے بعد اتنی خوشی اتنا سکون ملا تھا لیکن جب تمہارے یہاں سے گئی تو رات کو بالکل نیند نہیں آئی۔"

"شیریں۔"

"ہوں۔"

"وہ دن واپس نہیں آسکتے؟"

شیریں نے مجھے غور سے دیکھا۔ آہستہ سے اداس لہجہ میں بولی "نہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی کہ کیوں۔ مگر جو وقت چلا جاتا ہے وہ واپس نہیں آیا کرتا" پھر آہستہ سے جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو "یہی تو مشکل ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو یہی ساری مشکل ہے بس ایک دفعہ ذرا سی چوک ہو جائے پھر وقت ہاتھ سے ایسا نکلتا ہے کہ ــــ کہ بس ــــ" میرا دھیان کہاں سے کہاں نکل گیا۔ اس وقت کی ایک چوک ــــ۔"

شیریں نے فوراً بات بدلی "میرے خیال میں ایک ایک پیالی اور ہو جائے۔"

دیر تک ہم دونوں چپ رہے چپ چاپ چائے پیتے رہے مگر میں بہت دیر تک چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ اندر ایک گرہ جو پڑی ہوئی تھی پھر پھر کر دھیان وہیں آکر اٹک جاتا تھا "وہاں رہتے تو شاید آگے چل کر کچھ ــــ مگر اس کے فوراً بعد ہی تو یہاں آنا پڑ گیا ــــ کتنی مرتبہ میں نے سوچا کہ تمہیں خط لکھوں۔ ہمت نہیں پڑی، سوچ سوچ کر رہ گیا۔"

ویسے اس کے بعد ہم بھی جلدی ہی یہاں آگئے تھے اسی شہر میں۔"

"واقعی؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ کتنے دنوں یہاں رہے۔ پھر کراچی گئے ہیں۔"

"کمال ہے میں یہی سمجھتا رہا کہ تم وہیں ہو۔ اگر مجھے پتہ ہو جاتا کہ تم یہاں آگئی ہو تو پھر۔"

"ہمارے حالات ان دنوں اتنے خستہ تھے کہ ہم نے کسی عزیز رشتہ دار کو پتہ ہونے نہیں دیا کہ ہم یہاں آگئے ہیں ویسے ہمیں سب عزیزوں کا پتہ تھا کہ کون کہاں ہے۔"

"حالات ان دنوں سب ہی کے خستہ تھے۔ ہمارے حالات کونسے اچھے تھے بہرحال اگر مجھے کسی طرح یہ پتہ چل جاتا... کہ تم یہاں ہو تو......"۔

"تو؟" پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ "تو پھر پاکستان کی تاریخ آج مختلف ہوتی۔" فوراً ہی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی "دیر ہو چکی۔ چلنا چاہیے۔" اور کھڑی ہو گئی۔

"تقریب تو ختم ہو گئی ہوگی۔"

"خراب دیکھنے کا موڈ بھی نہیں رہا۔ واپس چلتے ہیں۔"

"افتتاح میں شریک ہونا کیا ضرور تھا۔ نمائش ہی دیکھنی ہے وہ کل بھی دیکھی جا سکتی ہے۔"

دروازے پر آکر آہستہ سے گاڑی روکی۔ میں نے اترتے ہوئے اسے دیکھا "اندر نہیں آؤ گی؟"

"نہیں بہت دیر ہو گئی ہے بھابی سے میری طرف سے معذرت کر دینا۔"

"تو نمائش کل دیکھنے جاؤ گی...؟"

"ہاں۔ میں تمہیں فون کروں گی۔"

"یا میں یاد کراؤں؟"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے میں آؤں گی۔ اسی وقت جس وقت آج آئی

تھی۔"سوچ کر۔ مگر ایک بات ہے"۔

"کیا ؟"

"بھابی کہیں گی کہ میرے میاں کو یہ عورت روز کہاں اڑا کے لے جاتی ہے"۔

"جب روز کا پروگرام بنے گا تب اس پہلو پر غور کریں گے"

اس پر کھلکھلا کر ہنسی "اچھا۔ رخصت"۔ فوراً ہی موٹر سٹارٹ کر دی۔

"وکٹوریہ کیفے کی طرف نہ چلیں" ؟ میں نے تجویز پیش کی۔

"کوئی لازم ہے کہ جو کل کیا تھا وہ آج بھی کریں"۔

"دیکھیں چائے تو کہیں نہ کہیں چل کر پینی چاہیئے ان مسخروں نے تو کوکا کولا کی ایک بوتل ہاتھ میں تھما دی"۔

"بڑی فضول بات ہے تواضع کا یہ کیا طریقہ لوگوں نے نکالا ہے"۔

"تو پھر گاڑی وکٹوریہ کی طرف موڑ لو۔ چائے تو بہر حال پینی ہے"۔

"مگر یہ کیا ضرور ہے کہ آج بھی چائے اسی کیفے میں پی جائے"۔

"ہاں کسی خوشگوار تجربے کو دہرانے کی کوشش تو نہیں کرنی چاہیئے پھر بھی"۔

شیریں ہنسی۔ گاڑی۔ گاڑی موڑتے ہوئے بولی "مگر ایک شرط ہے"۔

"کیا ؟"

"ہم آج ماضی کو نہیں کریدیں گے۔

"منظور ہے۔"

"مگر میں وکٹوریہ کے اس خاموش گوشے میں پہنچ کر اس شرط کو بالکل بھول گیا۔

فوراً ہی شروع ہو گیا "شیریں تمہیں یاد ہے ——————"؟

"بھول گئے کیا معاہدہ ہوا تھا یہ کہ ہم آج ماضی کو نہیں کریدیں گے یادوں کی نان سنس آج نہیں چلے گی۔

"بڑی مشکل ہے میں تو جتنا بھی ہوں ماضی ہی میں ہوں"۔

"حال میں ہونے کی کوشش کرو۔"

"مگر کیسے ؟"

"یہ کوئی دوسرا تو نہیں بتا سکتا۔ آدمی کو خود ہی یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ یادوں میں مقید ہو کر نہ رہ جائے جس طرح بھی ہو اسے حال کی ساعتوں میں اپنے آپ کو دریافت کرنا ہوتا ہے"۔

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ شیریں کو جو بزرگ بن کر نصیحت کرنے کی عادت تھی خاص طور پر مجھے وہ ابھی تک گئی نہیں ہے میں نے بھی سعادتمند بن کر اس کی نصیحت سنی۔ پھر کہا "ٹھیک ہے ماضی کو نہیں کریدتے۔ ماضی کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے وہ آج ہے۔ آج کا یہ لمحہ، یہ ساعت جو اس وقت میرے اور تمہارے درمیان گذر رہی ہے"

اس بات پہ تھوڑی گڑبڑائی۔ "پتہ نہیں"۔

"پتہ ہونا چاہیئے۔ مشکل یہی ہے کہ اصل ساعت کا اس ساعت میں پتہ نہیں چلتا ہے۔ جب گذر جاتی ہے تب اس کا پتہ چلتا ہے۔ کامیاب آدمی وہ ہے جو ساعت کو اسی ساعت میں پہچان اور گرفت میں لے لے"۔

"وہ کس طرح ؟"

کتنی معصومیت سے شیریں نے پوچھا اور کس شدت سے میرا جی چاہا کہ اسے آغوش میں بھینچ لوں اور کہوں "اس طرح"۔

عین اس ساعت میں کتنی گذری ساعتیں میرے تصور میں منور ہو گئیں اور گذرتی ساعت ان کی چکا چوند میں گم ہوتی چلی گئی۔

واپسی میں عجب ہوا۔ جب کار اس تاریخی منی بس سٹاپ کے سامنے سے گزری تو مجھے ایک شک سا ہوا کہ جیسے وہ کھڑی بس کا انتظار کر رہی ہے۔ میں بے چین ہو گیا "ذرا روکو۔"

شیریں نے گاڑی کو بریک دیئے "کیوں، کیا بات ہے ؟"

بہت عجلت میں گاڑی سے اترتے ہوئے کہا "ابھی آیا" تیزی سے بس سٹاپ کی طرف چلا۔ کار سٹاپ سے اچھی خاصی دور نکل کر رکی تھی مجھے تیز تیز چلنا پڑا۔ مگر جس وقت میں وہاں پہنچا اسی وقت کمبخت منی بس آن پہنچی۔ جو دو چار سواریاں کھڑی تھیں جلدی سے سوار ہو گئیں۔ کنڈکٹر نے بس کا دروازہ بند کرتے ہوئے سیٹی دی اور بس چل پڑی۔ میں نے زنانہ نشستوں کا جلدی جلدی جائزہ لیا کہ اگر وہی تھی تو انہیں میں سے کسی نشست پر بیٹھی ہو گی۔ وہ تو نظر نہیں آئی۔ منی بس تیزی سے آگے نکل گئی۔ مجھے کتنی جھنجھلاہٹ ہوئی کہ منی بسیں آخر تیز کیوں چلتی ہیں۔

میں ہارا ہوا سا واپس آیا اور دروازہ کھول کر خاموشی سے شیریں کے برابر آن بیٹھا۔ شیریں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ اچھا ہی ہوا۔ پوچھ بیٹھتی تو میں جانے کیا اول جلول جواب دیتا۔ خواہ مخواہ وہ شک میں پڑ جاتی۔ تو اچھا ہوا کہ اس نے یوں میرے عجلت سے اتر کر جانے پر کسی تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ خاموش گاڑی چلاتی رہی۔ ادھر میں خاموش، اس شش و پنج میں کہ کیا سچ مچ وہ تھی یا مجھے وہم ہوا تھا۔

گھر پہنچنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ مجھے اتنا خاموش نہیں رہنا چاہیے تھا۔ کوئی نہ کوئی بات کرنی چاہیے تھی کہ وہ بلا وجہ کسی شک میں نہ پڑ جائے مگر اس تردد نے زیادہ طول نہ پکڑا۔ میں اپنی الجھن میں پھنسا ہوا تھا۔ بار بار خیال آتا کہ کیا وہ تھی یا مجھے محض وہم ہوا تھا کہ وہ ہے خیر اس وقت تو یہ سوچ کر اس الجھن کو رفع دفع کر دیا کہ میں اب کونسا اس کے عشق میں مبتلا ہوں جو اس بارے میں زیادہ تردد کروں۔ وہ تو بس ایک تجسس تھا کہ دیکھوں تو سہی کہ کیا وہی ہے اگر تھی تو کیا ہوا، نہیں تھی تو کیا ہوا۔ مگر صبح ہونے پر جب میں دفتر کے لیے چلنے لگا تو یوں ہی مجھے خیال آیا کہ اگر

وہ واپس آگئی ہے تو پھر اس کا وہی ورد ہوگا کہ دفتر جانے کے لیے منی بس سٹینڈ پر پہنچا اور منی بس کا انتظار کرنا۔ سوچا کہ معلوم تو کیا جائے کہ وہ واقعی آگئی ہے تو میں نے سکوٹر گھر پہ چھوڑا اور دفتر کے لیے پیدل گھر سے نکلا۔ اسی سٹاپ پر پہنچ کر منی بس کا انتظار کرنے لگا وہ تو وہاں نہیں تھی۔ ایک ویگن آئی، اسے نکل جانے دیا دوسری آئی، اس میں بھی سوار نہیں ہوا۔ دیر بعد تیسری آئی۔ کیا کرتا وہ تو کہیں نظر نہیں آ رہی تھی ویگن میں سوار ہو گیا دوسرے دن پھر یہی کیا مگر وہ نظر نہیں آئی۔

پھر سوچا کہ کیوں نہ اس کے دفتر جا کر دیکھ لیا جائے۔ سو اس کے بینک میں جا کر ٹوہ لی۔

"ذکیہ احمد ــــ ؟ ـــــ وہ تو اب یہاں نہیں ہوتی ہیں"

"ٹرانسفر ہو گیا کیا ؟"

"وہ تو بینک ہی چھوڑ گئی کسی فرم میں اسے جاب مل گئی۔"

"آپ اس فرم کا پتہ بتا سکیں گے ؟"

ایک نے دوسرے سے، دوسرے نے تیسرے سے پوچھا "یار وہ ذکیہ احمد تھی نا، وہ کس فرم میں گئی ہے ؟"

سب انجانے بن گئے "پتہ نہیں جی۔ بہر حال یہاں سے چلی گئی۔"

ان کے اس جواب پر مجھے تعجب نہیں ہوا۔ دفتر والوں کی ایک خاص ذہنیت ہوتی ہے ان کے درمیان کوئی لڑکی کام کرتی ہے تو وہ کسی باہر والے کو اس میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھ سکتے۔ اس کے متعلق کبھی کچھ پوچھنا پڑ جائے تو کبھی صحیح نہیں بتاتے مگر دفتر والوں پہ کیا موقوف ہے کوئی بھی شخص کسی دوسرے کو محبت کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ ویسے تو ہر آدمی ہی ہر آدمی کا دشمن ہوتا ہے مگر محبت کرنے والے کے خلاف تو متحدہ محاذ قائم ہو جاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس سے محبت

کر رہا تھا میں نے اپنے آپ کو مطلع کیا کہ تم نے محض تجسس کے طور پر یہ ساری پوچھ گچھ کی ہے کسی جذباتی وابستگی کی بنا پر نہیں۔

"بوجان کے چالیسویں کا انتظام کرنا ہے۔" زبیدہ نے مجھے نوٹس دیا۔

"اچھا؟" بوجان کے جہلم کو تو میں بھولا ہی بیٹھا تھا۔ "کیا انتظام کرنا ہے؟"

"ایک تو سب عزیزوں کو اطلاع دینی ہے۔"

"عزیزوں کو اطلاع۔ یہ تو بہت مشکل کام ہے مجھے تو کسی کا پتہ بھی معلوم نہیں ہے۔"

"شیریں کو سب کے پتے معلوم ہیں اس وقت بھی اس نے سب کو فون کئے تھے وہ تو ایسی گئی کہ پھر آئی ہی نہیں؟"

تب میں چونکا۔ میں اس کے چکر میں شیریں کو بھول ہی بیٹھا تھا۔ اب خیال آیا کہ وہ تو ایسی گئی کہ پھر آئی ہی نہیں۔ سوچنے پر یاد آیا کہ جس شام ہم نمائش دیکھنے گئے تھے اس شام کے بعد سے شیریں نے اپنا پتہ نہیں دیا۔ نہ خود آئی نہ فون کیا اسے ہوا کیا۔ پہلے شیریں پر تعجب ہوا۔ پھر اپنے آپ پر تعجب ہوا کہ اس شام کے بعد مجھے شیریں کا خیال ہی نہیں آیا۔ دھیان سے ایسی اتری کہ اب جب زبیدہ نے اس کا ذکر کیا تب اس کی یاد آئی۔ تعجب۔ اتنے قرب کے بعد اتنی بیگانگی۔ کھو کر ایک عمر کے بعد اسے پایا تھا۔ پاکر اتنی ناقدری۔ آخر کیوں۔ تب میں نے ہوش کی دوا لی۔ اپنے آپ کو سرزنش کی کہ کس کے پیچھے خراب ہو رہے ہو۔ وہ ہے کہاں جو ملے گی۔ وہ تو ساری اپنی آواز میں تھی تم نے جانا کہ وہ آواز کے سوا بھی ہے۔ شہزادے نے وہ خوش رنگ پھول اپنے گلدان میں سجا دیا پھر یوں ہوا کہ روز صبح کو جب وہ جاگتا تو اپنی انگلی میں ایک خوبصورت نگینہ جڑی انگوٹھی دیکھتا اور حیران ہوتا۔ کتنا حیران ہوتا کہ یا عالم الغیب رات کے پردے میں کون آتی ہے اور روز ایک نئی انگوٹھی مجھے پہنا جاتی ہے آخر اس نے رتجگے کی ٹھانی۔ کانی انگلی تھوڑی کاٹ کر اس میں مرچیں بھر لیں کہ درد سے نیند نہیں آئے

گی۔ مکر بنا کر پڑ رہا جیسے سو رہا ہے جب رات آدھی گذری تب پھول مہکا کہ مہک سے اس کا ایوان سارا مہک گیا۔ پھر دھیرے دھیرے اٹھتے قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر اس نے جانا کہ اس کی انگشت میں انگوٹھی پہنائی جا رہی ہے۔ شوقِ دید میں اس نے آنکھیں کھولیں اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مگر اسے بس اس کی جھلک نظر آئی۔ پھر دم کے دم میں وہ پھول میں سما گئی۔ اِدھر وہ ورطۂ حیرت میں غرق ہوا کہ وہ کون تھی جو پھول سے خوشبو کی مثال برآمد ہوئی اور اسے انگوٹھی پہنا کر صورت دکھائے بغیر پھول میں چھپ گئی۔ تب پھول کے بارے میں اس نے تجسس کیا مگر اب گلدان خالی پڑا تھا۔ حیرت میں ایک اور حیرت کہ یا الٰہی پھول کہاں گیا۔ تب دربدری خاک بسری قسمت میں اس کی لکھی گئی جنگلوں باغوں میں ڈھونڈتا پھرتا تھا، حیران و پریشان ہوتا تھا کہ اے جہانِ رنگ و بو کے پیدا کرنے والے، باغِ عالم میں وہ کونسا گلشن ہے جہاں یہ شگوفہ پھوٹا تھا اور یہ پھول پھولا تھا۔ پھول میں کون گلبدن پری پیکر سمایا تھا۔ انگوٹھی اس نے کیوں پہنائی، صورت کیوں نہیں دکھائی۔

"میں تو جانوں تم شیریں کو فون کر کے بلا لو۔ وہی آکے انتظام کرے گی۔"

"ہوں۔"

"ہوں نہیں۔ آج ہی اسے فون کر دو۔"

"اچھا۔" بات میں زبیدہ سے کر رہا تھا' دھیان کہیں اور تھا۔ تو وہ ساری اپنی آواز میں تھی نادان تیری بیتابی سے وہ پراسرار رشتہ جو اس آواز کے ساتھ پیدا ہوا تھا ٹوٹ گیا۔ اِدھر سے جو عطا ہونا تھا عطا ہو چکا۔ وہ باب اب بند ہو چکا ہے

اب کوہِ ندا سے آواز نہیں آئے گی۔

"دن بہت کم رہ گئے ہیں ابھی اسے فون کر دو۔" زبیدہ نے فون لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔"

مگر اس کا فون نمبر کیا ہے۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ اس سے فون نمبر معلوم کر کے نوٹ کر لوں۔ یہ تو میں نے بات بنائی تھی اس نے جان کر مجھے اپنا فون نمبر نہیں بتایا تھا جب بھی فون نمبر اس سے معلوم کرنا چاہا وہ طرح دے گئی۔ بہت ٹوہ لینے کے بعد بس اتنا پتہ چل سکا تھا کہ نیویارک میں کوئی ایشین انسٹی ٹیوٹ یا ساؤتھ ایشین (؟)، آرگنائزیشن' یا اسی سے ملتے جلتے نام کا کوئی ادارہ ہے جس کی سروے ٹیم کے ساتھ وہ یہاں آئی ہے۔

"میرے پاس ہے اس کا نمبر۔"

"تمہارے پاس؟" میں نے تعجب سے زبیدہ کو دیکھا۔

"ہاں، شیریں نے وقت بے وقت کے لیے مجھے اپنا نمبر لکھا دیا تھا۔"

خوب' میں نے دل میں کہا کس واسطے سے اپنا پتہ مجھ تک پہنچایا ہے۔

زبیدہ نے نمبر بتایا۔ میں نے ڈائل گھمایا "ہیلو مس شیریں ہیں؟"

"مس شیریں"۔ ادھر سے جواب آیا "وہ جا چکی ہیں۔"

"کتنی دیر میں واپس آئیں گی۔"

"وہ تو ہیڈ کوارٹرز واپس چلی گئی ہیں۔"

میں چکرایا "ہیڈ کوارٹر؟ کیا مطلب؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"جی ہیڈ کوارٹر۔ نیویارک۔"

"نیویارک! میں سخت چکرایا کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے" میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔ انہیں تو سروے ٹیم کے ساتھ واپس جانا تھا، نہیں تو ابھی یہاں STAY کرنا تھا۔"

"جی ہاں۔ مگر ان کا پروگرام بدل گیا۔ ایمرجنسی میں انہیں واپس جانا پڑا۔"

میرے اندر تو ایک ہلچل مچ گئی۔ کیسے چلی گئی۔ کیوں چلی گئی۔ غلط ہے پتہ نہیں

ادھر سے کون بول رہا تھا، ممکن ہے شیریں نام کی کوئی اور خاتون ہو جس کے بارے میں وہ بتا رہا ہو۔ مجھے خود جا کر معلوم کرنا چاہیئے۔ میں فوراً ہی تو اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے ادھر سے صحیح جواب نہیں آ رہا۔ مجھے خود جا کر معلوم کرنا پڑے گا۔"

"ہاں جا کے معلوم کرو لو بھلا شیریں اتنی جلدی کیسے واپس چلی جائے گی اور اگر ان دنوں جانا ہوتا تو وہ ہم سے ذکر نہ کرتی۔"

"دفتروں کا عجب عالم ہے کسی کے بارے میں پوچھو کبھی صحیح اطلاع نہیں ملتی۔"

بدحواس سٹپٹایا ہوا دفتر پہنچا۔ پوچھ گچھ کی۔ فون پر صحیح بتایا گیا تھا۔ شیریں نیویارک جا چکی تھی میں ایسے ہو گیا جیسے بڑا سا پتھر گرنے سے ایک دم سے کشتی ڈول جائے۔ چلی گئی۔ مگر کیوں؟ اور اتنی اچانک کہ مل کر بھی نہیں گئی ایمرجینسی؟ کیا ایمرجنسی ہو سکتی ہے؟ سو سو طرف دھیان گیا۔ کتنے امکانات، کتنے وسوسے دماغ میں پیدا ہوئے۔ کسی پہ جی ٹھکا نہیں۔ اور ایک دم سے بجلی کی طرح ایک خیال آیا۔ میری تو کوئی بات گراں نہیں گذری۔ تھوڑی دیر کے لیے میں چکر میں آ گیا۔ مگر پھر فوراً ہی اندر سے تردید ہوئی۔ تم اس کے لیے جب اہم تھے تب اہم تھے اب تم اس کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتے تھے کہ تمہارا کوئی سلوک کوئی بات اس طرح اس پر اثر کرے کہ وہ اپنا سارا پروگرام تلپٹ کر کے واپس چلی جائے۔ پھر؟ تو پھر کیا نیویارک میں کوئی ایسا ہے کہ اس کی خاطر —— مگر اس خیال نے مجھے اتنا وحشت زدہ کیا کہ میں نے بیچ میں ہی اس کا گلا گھونٹ دیا۔ نہیں ایسا کوئی چکر اس کے ساتھ نظر نہیں آتا ہو ہی نہیں سکتا۔

جاتے ہوئے میرے قدموں میں بجلی بھری ہوئی تھی واپس ہوتے ہوئے قدم سو سو من کے ہو گئے۔ کن مصیبتوں سے اپنا بھاری بوجھ سنبھالے میں وہاں سے

نکلا۔

میرا ایک قدم ٹریفک سے بھری مال پر تھا، دوسرا قدم صحرا میں تھا۔ سڑک پر چل رہا تھا کہ ویرانے میں بھٹک رہا تھا۔ ٹریفک کا شور بے معنی تھا۔ میرے اندر اس سے بڑھ کر شور مچا ہوا تھا۔ باہر کسی چیز کے کوئی معنے نہیں رہے تھے۔

۱۵

کتنی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ میں خاموش بیٹھا ہوں۔ کتنی دیر بعد؟ میں اندازہ نہیں کر سکا۔ بس ایسا گمان ہوا کہ خاموشی کی ایک صدی گذر گئی ہے اور تب مجھے کامریڈ کی موجودگی کا خیال آیا۔ کب سے کامریڈ آیا بیٹھا ہے اور میں نے اس سے کوئی بات ہی نہیں کی، وہ دل میں کیا سوچتا ہوگا۔ کب سے؟ میں نے ذہن پر بہت زور ڈالا کہ کامریڈ کس وقت آیا تھا کچھ یاد نہیں آیا۔ کامریڈ کو میں نے ایک نظر دیکھا۔ میرے اور اس کے درمیان خاموشی کی ایک صدی پھیلی ہوئی تھی مجھے اس سے بات کرنی چاہیئے میں ہونٹ کھولنے لگا تھا کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کہنے کے لیے میرے پاس کوئی بات نہیں ہے کوئی رسمی سی بات آخر بات شروع کرنی ہے کوئی بھی اِدھر اُدھر کی بات کر کے بات شروع کی جا سکتی ہے مگر میری سمجھ میں کوئی بات ہی نہیں آئی۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ میں اندر سے خالی ہو چکا ہوں۔ کوئی خیال، کوئی احساس، کوئی بات، کوئی اٹل بے جوڑ بات ہی سہی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک بیچارگی کے ساتھ کامریڈ کو دیکھا درمیان میں پھیلی ہوئی خاموشی کی صدی کو عبور کرنا مجھے کس قدر مشکل نظر آ رہا تھا۔

"کامریڈ ——؟" بالآخر میں خاموشی کی مہر توڑنے میں کامیاب ہو گیا کتنی بڑی ہم میں نے سر کی تھی ایک دفعہ آدمی خاموش ہو جائے تو پھر زبان کھولنا اس کے لیے کتنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے مگر اب سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آگے مجھے کیا کہنا ہے۔ خیر کامریڈ نے خود ہی میری اس مشکل کو حل کر دیا۔ "ہوں" اور اس کے ساتھ اس نے ایک لمبی جمائی

لی۔ وہ بھی شاید دور نکل گیا تھا اس کی لمبی ہوں اور لمبی جماہی بتا رہی تھی کہ لمبے سفر سے واپس ہوا ہے" پھر کامریڈ سگریٹ ہی پلواؤ۔"

میں نے فوراً سگریٹ کی ڈبیا کامریڈ کو پکڑا دی اسے غور سے دیکھا" کامریڈ"

"ہوں"

"یار آج میں نے تمہیں بور کر دیا"

"نہیں کامریڈ"

"پھر چونچ بند کئے ہوئے کیوں بیٹھے ہو"

کامریڈ نے سگریٹ سلگایا۔ لمبا کش لیا۔ میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ابھی تک میں نے کامریڈ کے اس غیر معمولی رویے پر دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ میں خود اپنی رامی میں گم بیٹھا تھا اب خیال آیا اور تعجب ہوا کہ کامریڈ کو آج ہوا کیا ہے وہ تو آتے ہی شروع ہو جایا کرتا تھا۔ سوچا کہ شاید مجھے چپ دیکھ کر کامریڈ کو چپ لگ گئی۔ مگر یہ تو اس کے مزاج کے خلاف بات تھی۔ کسی کا کیسا ہی موڈ ہو، کوئی کسی پریشانی میں ہو، کامریڈ کب اس پر دھیان کرتا تھا۔ بس اچانک آ دھمکنا، پمفلٹوں اخباروں سے بھرے اپنے تھیلے کو ایک طرف پٹخنا اور بیٹھنے سے پہلے رواں ہو جانا۔ بات کوئی پورب کی، کوئی پچھم کی، تان بہرحال انقلاب پر توڑنا۔

"اچھا کامریڈ یوں کرتے ہیں کہ چائے بنواتے ہیں۔ چائے پی کر تمہارا موڈ ٹھیک ہو گا۔" میں نے سوچا کہ شاید اس طور میرا موڈ بھی کچھ بحال ہو جائے۔

"نہیں کامریڈ"

میں نے کامریڈ کو تعجب سے دیکھا" کامریڈ، چائے سے انکار کر رہے ہو"

"یہاں نہیں"

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے کہیں باہر نکل کر بیٹھتے ہیں۔ چلو تمہیں آج ہلٹن میں

چائے پلاتے ہیں"۔ اور میں فوراً ہی کھڑا ہو گیا۔

"نہیں ہلٹن میں نہیں"

"انٹر کان میں؟"

"نہیں کامریڈ۔ ایبٹ روڈ چلتے ہیں"

"ایبٹ روڈ؟" میں نے کامریڈ کو تعجب سے دیکھا" کامریڈ میں تمہیں انٹر کون اور ہلٹن میں چائے پلانے پر آمادہ ہوں۔ تم ایبٹ روڈ کی بات کر رہے ہو۔ وہاں کونسا معقول ریستوران ہے"

"بس ایبٹ روڈ چلنا ہے"

"اچھا تمہاری مرضی۔ میں تو تمہیں ہائی کلاس چائے پلانے کی سوچ رہا تھا۔"

ایبٹ روڈ کے اس بوسیدہ چائے خانے میں داخل ہوتے ہوئے کامریڈ بولا "یہ جگہ بھی بدل گئی"

"بدل گئی" میں نے کامریڈ کو تعجب سے دیکھا" کامریڈ، کیا کہہ رہے ہو۔ میں تو بہت شروع میں، بس سمجھ لو کہ [illegible] میں ایک دو دفعہ یہاں آیا تھا۔ جتنا میلا اس وقت تھا اتنا ہی اب ہے کمال ہے اتنے عرصے میں یہاں کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ بالکل وہی نقشہ ہے" اور یہ کہتے کہتے ایک تعجب نے مجھے آ لیا۔ تب سے اب تک کتنا زمانہ گذر چکا ہے مگر یہ جگہ ویسی ہی ہے۔ اتنی ہی میلی، اتنی ہی بوسیدہ۔

"وہ نقشہ؟ ——— نہیں یار، وہ تو نقشہ ہی اور تھا۔ باہر کھلے میں لکڑی کی ایک لمبی تپائی پڑی رہتی تھی اس کے ساتھ ایک لمبی میز۔ دادا اسی بنچ پہ آکے بیٹھا کرتے تھے کتنی رونق ہوا کرتی تھی ان دنوں۔ ہر زمین کا بندہ نظر آتا تھا۔ سب دادا کے گرد جمع رہتے تھے" لمبا ٹھنڈا سانس لے کر "اب ان میں سے کوئی بندہ نظر نہیں آتا اور ان سالوں نے وہ تپائی اور میز بھی یہاں سے غائب کر دی؟"

"کامریڈ، یاں باہر تمہیں تپائی اور میز کے لیے کوئی گنجائش نظر آ رہی ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو کامریڈ، ان دنوں تو یہاں سامنے بہت ساری جگہ خالی پڑی تھی۔ اب یاں پہ سالی قدم رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔"

کامریڈ کے اس کہنے کے ساتھ مجھے احساس ہوا کہ واقعی یہ جگہ تو بہت بدل گئی ہے۔ بےشک چائے خانہ اندر سے نہیں بدلا۔ وہی میلا پن وہی بوسیدگی۔ مگر ارد گرد تو سارا بدل گیا ہے کتنی کشادہ جگہ تھی اور اب قدم رکھنے کی جگہ نہیں۔ تجاوزات اور بڑھتے ہوئے ٹریفک نے اس گوشے کو کتنا بدہیت بنا دیا تھا۔

"عجب بات ہے یہ شہر آدمیوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے اور جگہیں بھرتی چلی جا رہی ہیں۔"

کامریڈ نے تائید میں سر ہلایا "ٹھیک کہتے ہو کامریڈ۔ سالا ہجوم اتنا اور آدمی غائب۔ ایک وقت آنے والا ہے کہ یہاں سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔"

"وہ وقت آ نہیں چکا ہے۔"

"بالکل بالکل۔" کامریڈ نے فوراً اپنی تصحیح کی۔ پھر بولا "حالات اس زمانے میں بھی خراب تھے۔ مگر زمانہ اچھا تھا" اس کے ساتھ ہی اس نے ایک لمبا غوطہ لگایا بالکل خاموش، کسی سوچ میں کھویا ہوا۔ دیر بعد تہہ سے سر نکالا "ایک بات پوچھوں۔"

"پوچھو۔"

"تم نے کبھی محبت کی ہے؟"

"محبت؟" کامریڈ کے منہ سے یہ نام سن کر میں کتنا حیران ہوا "کامریڈ تمہارا مضمون تو انقلاب ہے اسی مضمون تک رہو۔"

"کامریڈ، مذاق میں بات مت ٹالو۔ میں اس وقت سخت سیریس ہوں۔"

"اچھا؟" اور میں نے کامریڈ کو غور سے دیکھا اس نے ٹھیک کہا، اسوقت وہ

بہت سنجیدہ تھا۔ "یار کامریڈ بات یہ ہے کہ ——— ؟" میں سوچ میں پڑ گیا "یار یہ بتانا بہت مشکل ہے۔"

"کیوں مشکل ہے؟ تم عورت تو نہیں ہو اس غریب کے لیے تو بتانا واقعی مشکل ہوتا ہے۔"

"یار کامریڈ بات یہ ہے کہ اس سوال کا دوٹوک جواب دینا مشکل ہے۔"

"کوئی مشکل نہیں ہے آدمی نے یا تو محبت کی ہوتی ہے یا محبت نہیں کی ہوتی ہے اور ہاں کامریڈ ایک بات بتا دوں۔ محبت سے میری مراد ہے محبت۔ اب اگر تم نے کسی لڑکی سے فلرٹ کیا ہے یا رومانس لڑایا ہے یا کسی لڑکی کے چکر میں پھنس گئے ہو تو وہ قصہ الگ ہے جیسے تم ایک زمانے میں ایک لڑکی کے چکر میں تھے نا اس سے تمہاری ملاقات نہیں ہو پا رہی تھی۔ ممتاز تمہارا مخبر بنا ہوا تھا۔ اس سے آگے مجھے معلوم نہیں۔ میں اسوقت پارٹی کے کام میں دن رات جتا رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ سالے بورژوا ان کو تو اور کوئی کام ہے ہی نہیں۔ ٹھالی سے بیگار بھلی۔ تو کامریڈ تمہاری ملاقات اس سے ہو گئی تھی؟"

"ملاقات؟" میں کھسیانا سا ہو گیا "پتہ نہیں اسے ملاقات کہنا چاہیے یا کیا کہنا چاہیے۔"

"تو پھر خط بازی ہی ہوتی رہی؟"

"خط بازی؟ نہیں۔ خط بازی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ غائب ہی ہو گئی۔"

"اچھا؟ کمال ہے کامریڈ۔ تم نے جان کو روگ تو اتنا لگا رکھا تھا۔ ہوا کچھ بھی نہیں۔"

"یہی تو میں کہہ رہا تھا کہ بہت بے ہنگم سی بات ہے تمہاری زبان میں پھسپھسا۔ میری سمجھ میں خود نہیں آیا کہ میرے ساتھ یہ کیا ہوا۔ میں تمہیں کیا جواب دوں۔"

کامریڈ نے سوچا، پھر کہا "بس کامریڈ، پتہ چل گیا، تم نے محبت کی ہے۔"

"پتہ چل گیا؟ کیا پتہ چل گیا۔ کامریڈ مجھے خود پتہ نہیں چلا کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ تمہیں کیسے

پتہ چل گیا۔"

کامریڈ ہنسا" کامریڈ محبت اسے ہی کہتے ہیں بس جھمیل جھوسا ہے میں نے ایک مرتبہ فاروق سے پوچھا تھا اس نے رومانی سسکیوں اور آنسوؤں سے بھرپور ایک کہانی سنا دی ایسی کہانی ظالم نے سنائی کہ اس پر فلم بنائی جائے تو ہٹ جائے۔ مگر میں نے سمجھ لیا کہ اس نامعقول آدمی نے کوئی محبت وحبت نہیں کی ہے بس جب آدمی جھمیل جھوسے میں پڑ جائے اور یہ طے نہ کر سکے کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تو وہی محبت ہوتی ہے جیسے میرے ساتھ ہوا۔"

"تمہارے ساتھ ؟ کامریڈ، تمہارا تو یہ خانہ ہی خالی ہے۔"

" میں بھی یہی سمجھتا تھا مگر خانہ خراب ہوتے دیر تھوڑا ہی لگتی ہے۔ خیر میں تو اسے بھول ہی گیا تھا۔ مگر رات وہ مجھے یاد آ گئی۔ سالی عجیب سی بات ہے۔ یاد آنے کی کوئی وجہ تو ہوتی۔ بس بلا وجہ بلا سبب یاد آ گئی۔ اور بہت یاد آئی۔ پھر میں سو نہیں سکا۔"

" اچھا ؟" میں حیران کامریڈ کو دیکھ رہا تھا۔

" کامریڈ آگے مت پوچھنا۔"

" چلو نہیں پوچھتے۔" مگر پھر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ ایک دو باتیں کر کے پھر اسی موضوع پر آ گیا" کامریڈ ؛ یہ تو میں نہیں پوچھوں گا کہ کون تھی، کیا قصہ ہوا۔ اس سے ہٹ کر ایک بات بتا دو۔ یہ افلاطونی محبت تھی یا کچھ اور بھی قصہ تھا۔"

"کامریڈ، تم نے بے ڈھب سوال پوچھا ہے۔" رُکتے ہوئے کچھ جھجکتے ہوئے

" ویسے تو افلاطونی جھمیل جھوسا ہی تھا مگر ایک دفعہ ۔۔ بس ایک دفعہ ۔۔۔ ہوا یوں کہ ۔۔۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ کیسے ہوا۔ ۔۔۔ بس وہ میرے بازؤں میں جکڑی ہوئی اور میرے ہونٹ اس کے ہونٹوں کے ساتھ پیوست۔" چپ ہو گیا کسی خیال میں کھو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی بولا" کامریڈ، میری زندگی میں بس ایک

بوسہ ہے اور کچھ نہیں ہے۔"

" بس ایک بوسہ ؟"

" کامریڈ، ایک بوسہ بھی بہت ہوتا ہے آدمی اگر ڈھکانے سے بیلے تو عمر بھر کے لیے کافی ہوتا ہے کیا سمجھے کامریڈ ؟"

کامریڈ جیسے بات کر کے فارغ ہو گیا ہو۔ مگر میرے اندر ایک بیکلی شروع ہو گئی تھی میں چاہتا تھا کہ یہ ذکر تھوڑا اور چلے" تو کامریڈ، رات وہ تمہیں بہت یاد آئی ؟"

" ہاں کامریڈ، پتہ نہیں کیوں اچانک سے یاد آ گئی۔ پھر رات بھر میں سو نہیں سکا۔"

" وہ گئی کہاں ؟"

" کامریڈ، عورت کے بارے میں یہ نہیں پوچھا کرتے یہی تو اس کے بارے میں پتہ نہیں چلتا چھم سے آ جاتی ہے پتہ نہیں چلتا کہ کیسے آئی، کہاں سے آئی۔ ایک دم سے چلی جاتی ہے پتہ نہیں چلتا کہ کیسے چلی گئی، کہاں چلی گئی۔"

" ٹھیک کہتے ہو کامریڈ، پھر تم نے اسے تلاش کیا ؟"

" نہیں کامریڈ"

" کیوں ؟"

" بس گئی سو گئی۔ پھر تلاش بے سود ہے"

کامریڈ کی اس بات پر میں جھنجھلا گیا" کامریڈ، انقلاب کے معاملہ میں تو تم مایوسی کو کفر سمجھتے ہو، مگر زندگی کے معاملہ میں تم اتنے قنوطی ہو۔"

" دیکھو کامریڈ، انقلاب اور عورت میں یہی تو فرق ہے انقلاب تو آ دے ہی آوے مگر عورت، وہ جا کر پھر کبھی نہیں آتی۔"

" یار کامریڈ، فتوے دینا چھوڑ دو۔ یہ زندگی ہے اس کے بارے میں قطعی حکم نہیں لگا سکتے۔"

"اچھا کامریڈ، پھر تم ڈھونڈو۔ ڈھونڈتے رہو۔"

"نہیں یار، میں اپنے بارے میں نہیں کہہ رہا۔ وہ تو قصہ ہی بہت پرانا ہوگیا۔"

کامریڈ زور سے ہنسا "کامریڈ، یہ قصہ کبھی پرانا نہیں ہوا کرتا۔" پھر افسردہ ہوگیا۔ "یہی تو خراب بات ہے کتنا ہی پرانا ہوجائے مگر ذرا کسی بہانے یاد آجائے کمبخت تازہ ہوجاتا ہے۔"

کامریڈ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ بات کہہ کر جتنا وہ افسردہ ہوا اتنا ہی میں افسردہ ہوا۔ کتنی دیر تک ہم دونوں چپ بیٹھے رہے چپ بیٹھے چائے پیتے رہے۔

"پھر یوں ہی میں بول اٹھا" ویسے کامریڈ، اس وقت میں نے واقعی اسے بہت ڈھونڈا تھا۔"

"پھر ملی؟"

"ملنا کہاں تھا۔ وہ تو بالکل ایسے اوجھل ہوئی۔ جیسے پرانی کہانیوں میں پری ایک جھلک دکھا کے غائب ہوجاتی تھی غریب شہزادہ جنوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ نتیجہ ڈھاک کے تین پات۔ مگر میرے معاملہ میں کچھ اور ہی گل کھلا۔"

"کیا؟"

"میں ڈھونڈ رہا تھا اسے۔ اور مل گئی وہ"

"وہ؟ وہ کون تھی؟"

"وہ بھی تھی۔"

"کامریڈ، پہیلیاں مت بوجھواؤ۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ یہ کونسا قصہ ہے؟"

"یہ دوسرا قصہ ہے —— نہیں۔ پہلا قصہ۔ اس میں وہیں رہتے ہوئے کھنڈت پڑگئی تھی۔ جب میں ادھر آگیا تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اور اب تو میرا دھیان ہی کہیں اور تھا۔ لیکن اس بیچ وہ اچانک سے آگئی۔ —— یار کامریڈ،

کمال ہوگیا۔ ایک دم سے سارا کچھ جو میں بھول بیٹھا تھا دھیان میں آگیا جیسے میں اسی ساعت میں واپس چلا گیا ہوں۔ مگر کیا ہوا کہ وہ ایک دم سے چلی گئی۔ جیسے ایک دم سے آئی تھی۔"

"کامریڈ یہی ہوتا ہے اچانچک سے آتی ہے۔ اچانچک سے چلی جاتی ہے۔"

ایک دفعہ پھر چپ، وہ بھی، میں بھی۔ اپنے خیالوں میں گم۔ میں اپنے خیالوں میں گم۔

"یار کامریڈ!" آخر میں نے ہی خاموشی کی مہر توڑی "تم لوگوں کے پاس تو متبادل نظام ہوتا ہے۔ عشق کا نعم البدل انقلابی جدّوجہد۔ وہ نہیں تو یہ۔ مگر ہم جیسے ادھر سے ہٹیں تو کدھر جائیں۔"

"انقلابی جدّوجہد" کامریڈ منھ ہی منھ میں بڑبڑایا اور چپ ہوگیا پھر بولا "ویسے میں اب سوچتا ہوں کہ اس وقت میں اس کے پیچھے گیا ہوتا تو وہ واپس آہی جاتی مگر اس وقت مجھ پہ سودا سوار تھا کہ انقلاب بس اب آیا تو جراس طرف سے نہیں ہٹنی چاہیے" لمبا ٹھنڈا سانس لیا "سالا انقلاب بھی نہیں آیا اور وہ بھی چلی گئی۔"

"کامریڈ، وہ تو خیر چلی گئی۔ مگر انقلاب تو بقول تمہارے آوے ہی آوے۔ آج نہیں تو کل۔"

کامریڈ کو غصہ آگیا "یاں پہ سالا کوئی انقلاب ونقلاب نہیں آوے گا۔"

"کیوں نہیں آئے گا"؟

"بس کامریڈ، یاں یہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ سب سالے فراڈیئے ہیں۔ ڈیوس کتے کے بچے" اور کچکچا کر ایک ہی سانس میں کتنی گالیاں دے ڈالیں۔ پھر اپنے تھیلے کو میرے سامنے کردیا "دیکھتے نہیں ہو۔ آج میرا تھیلا خالی ہے۔"

میں نے حیرت سے اس تھیلے کو دیکھا جس میں پمفلٹ اور اخبار ٹھسا ٹھس بھرے

رہتے تھے "آج یہ خالی کیسے ہو گئی۔

"میں نے سارا کچرا نہر میں الٹ دیا۔"

"کامریڈ، کیا کہہ رہے ہو۔"

"صحیح کہہ رہا ہوں۔" یہ کہتے کہتے اس نے اپنا ایک گھٹنا کھول دیا "یہ گھٹنے دیکھ رہے ہو ان میں درد بیٹھ گیا ہے۔ خالی چائے کا ایک کوپ چڑھایا اور تھیلا بغل میں داب نکل پڑا۔ پورے شہر کا گشت کرتا تھا۔ پمفلٹ، اخبار، کتابیں، ایک ایک دفتر میں ایک ایک شخص کو پہنچاتا تھا کہ کسی پہ تو اثر ہوگا۔ مگر کامریڈ، یاں یہ تو کسی پہ کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ میں نے سوچا کہ یہ سب چھپے ہوئے لفظ بے برکت ہیں جب ان کا کسی پہ اثر ہی نہیں ہوتا تو یہ لفظ محض کیلا کانٹے ہیں۔ دلوں میں اترتے نہیں۔ بس کاغذ کالے ہوتے ہیں تو میں نے سوچا کہ ان بے برکت لفظوں کے پیچھے میں کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہوں۔ دفع کرو اس کچرے کو۔ تو میں نے نہر پہ جا کر اپنا تھیلا الٹ دیا۔ سب لفظوں کو نہر میں غرق کر دیا۔" کھڑا ہو گیا "بس یار چلو یاں سے۔"

"یار کامریڈ اب یہاں آئے ہیں تو ذرا تھوڑا وقت بیٹھیں۔"

"نہیں کامریڈ۔ یاں اب نہیں بیٹھا جا سکتا۔ سالوں نے وہ بنچ بھی غائب کر دی جس پہ دادا بیٹھا کرتے تھے۔"

یہ جا وہ جا۔

میں اکیلا دیر تک ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ اودبڑ کھابڑ خیالوں نے رات تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ رات کو میں نے خواب دیکھا کہ جیسے وہ مرا بڑا گھنا پیڑ ہے وہی میں ہوں، وہی ——— بیچ ہی میں آنکھ کھل گئی۔ پھر میں صبح تک نہ سو سکا خواب میری آنکھوں میں صبح کے بعد تک پھوٹتا رہا۔

۱۶

"ارے ہاں اس کا ٹیلی فون آیا تھا۔"

"کس کا؟" میں چونک پڑا۔ فوراً دھیان اسی کی طرف گیا۔ اسی کا ہوگا۔ کتنی امید بھری نظروں سے میں نے زبیدہ کو دیکھا۔

"پراپرٹی ڈیلر کا۔"

"پراپرٹی ڈیلر کا؟ ..... اچھا؟" توقعات کا سیلاب آن کی آن میں امنڈا اور آن کی آن میں بیٹھ گیا۔ آنکھوں کی چمک غائب۔ آواز میں مردنی "کیا کہتا تھا؟"

"پوچھ رہا تھا کہ کیا سوچا ہے۔"

"کیا سوچا ہے؟ کس بارے میں؟"

زبیدہ نے مجھے غور سے دیکھا۔ شاید اُسے میرا یہ بے تعلقی کا لہجہ پسند نہیں آیا تھا۔ مگر یہ دانستہ تو نہیں تھا۔ میں ان دنوں اور ہی خیالوں میں تھا۔ فوری طور پر دھیان میں بات آئی ہی نہیں۔ زبیدہ نے ناخوشگوار سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر اُس نے بھی وہی بے تعلقی کا لہجہ اپنایا۔ خشک لہجہ میں مختصر جواب دیا "آشیانے کے بارے میں۔"

آشیانے کے بارے میں؟ میں پہلے سٹپٹایا۔ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ میں اصل میں بے خبری میں پکڑا گیا تھا۔ میرے تو دھیان ہی سے وہ سارا قصہ دفع دفع ہو چکا تھا۔ جس روز پراپرٹی ڈیلر آشیانے کا گاہک لے کر آیا تھا اسی روز تو بوجان کی طبیعت بگڑی

تھی۔ ایسے لینے کے دینے پڑے کہ ان کی بیماری کے سوا کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔ پھر شیریں آن پہنچی۔ ہم دونوں بوجان کے سرہانے بیٹھے چراغ حویلی کی طرف جا نکلے۔ آشیانہ اپنے مسائل و معاملات کے ساتھ دھیان سے اوجھل ہو گیا اور اب ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ بوجان گذر چکی تھیں اور شیریں جا چکی تھی۔ چراغ حویلی میرے حافظہ سے بسرنے لگی تھی۔ میں کتنا پریشان تھا۔

بوجان نے گذرتے گذرتے ہمارے حافظہ کو لو دیدی تھی۔ چراغ حویلی ایک دم سے ان کے آخری دموں کے ساتھ ہمارے تصور میں کتنی منور ہو گئی تھی اور جب انہوں نے آخری ہچکی لی تو یہ امانت ہمیں پوری طرح منتقل ہو چکی تھی۔ ہم نے ان کی یاد کے سائے میں بیٹھ کر کس خوبصورتی سے ان در و دیوار کو اپنے بیچ زندہ کیا اور
اس بیچ سے اپنے آپ کو برآمد کیا۔ ہم ایسے خوش ہوئے کہ جیسے برسوں کی کھوئی ہوئی ہماری چیز ہمیں مل گئی ہے۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ شیریں چلی گئی۔ تو شیریں جا چکی تھی اور میں اکیلا اس امانت کو سنبھال کر نہیں رکھ سکتا تھا۔

اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ کیوں میرے اجداد ایک عمر پر پہنچ کر تذکرہ لکھنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یا تو بوجان کی سی فضائے یادہو۔ جہاں دیکھے ان دیکھے سب زمانے سدا بہار تھے کہ بوجان تو اپنی ذات میں زمانوں کا سنگم تھیں کہ کتنے زمانے کہاں کہاں سے آ کر یہاں ملتے تھے اور خوش اسلوبی سے جدا ہو جاتے تھے یا پھر آدمی تذکرہ لکھے۔ نہیں تو یادیں بسر جائیں گی یا الجھ جائیں گی اور آپس میں رل مل جائیں گی۔ تو مجھے بھی، میں نے سوچا، تذکرہ لکھنا چاہیے۔ مگر یہ خیال اتنا مضحکہ خیز نظر آیا کہ میں نے اسے فوراً ہی رد کر دیا۔ تذکرہ لکھنے کے لئے آدمی کو روایت میں رچا بسا ہونا چاہیے نہیں تو اول پٹال ہی لکھے گا۔

"کل وہ پھر فون کرے گا؟" زبیدہ تھوڑا چپ رہنے کے بعد پھر بول پڑی۔

"اچھا؟"

"ہاں میں نے تو اس سے کوئی بات کی نہیں۔ کہہ دیا ہے کہ کل اخلاق صاحب گھر پہ ہوں گے۔ وہ ہی بتائیں گے۔"

یہ بات بظاہر میں نے بے اعتنائی سے سنی۔ لیکن دل میں ایک تشویش پیدا ہو گئی کہ یہ تو پھر وہی مصیبت شروع ہو گئی۔ پھر وہی وقت بے وقت کے پھیرے۔ کبھی دروازے کی گھنٹی بج رہی ہے کبھی فون بول رہا ہے۔ مجھے وہ دن یاد آ گئے۔ ہر وقت یہ لگتا تھا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

"پہلے سے سوچ لو کہ کیا بات کرنی ہے۔"

"ہاں سوچ لیں گے۔" اور اس سے پہلے کہ زبیدہ دوسری بات کرے میں نے توس کے ریزے طشتری میں بکھائے اور باہر برآمدے میں نکل گیا۔

توس کے ریزے ہار سنگھار کے سائے میں بکھیرے اور برآمدے میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ پنچھی سہاترت پھرت اکٹھی ہو گئی۔ گوریاں تو جیسے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ فوراً ہی آن پہنچیں۔ بلبلوں کا جوڑا تھوڑا بعد میں آیا۔

انہیں کے پیچھے دو گرڈسلین بھی آ گئیں۔ ایک کوا بھی بیچ میں آن دھمکا۔ گلہری اوپر کی شاخ سے چلی اور کودتی پھاندتی آن موجود ہوئی۔ ایک گہری نیلی پدی بھی ہار سنگھار کی شاخ پہ بیٹھی چوں چوں کرتی نظر آ رہی تھی۔ مجھے اس آن ایک عجیب سا خیال آیا کہ شاما چڑیا بھی یہاں آ گئی ہوتی تو یہ سبھا مکمل تھی۔ شاما چڑیا بس میرے دھیان کو پر لگ گئے۔

"اخلاق، او اخلاق۔ شاما چڑیا۔"

"کہاں ہے؟"

"وہ بیٹھی ہے۔"

"ہولے بول۔ سن لے گی تو اڑ جائے گی۔"

"ہولے ہی تو بول رہی ہوں۔ اس باولی کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ ہم یہاں پہ ہیں۔"

آہستہ سے ایک قدم۔ پھر دوسرا قدم۔ شیریں مجھے ہدایات دے رہی ہے۔ میں شیریں کو ہولے بولنے کی تاکید کر رہا ہوں۔ ہم بالکل منڈیر کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ بس اسی آن شاما چڑیا اپنی دُم ہلاتی ہے اور پھر سے اُڑ جاتی ہے۔

"شیریں کی بچی، تو نے اُسے اڑایا ہے۔"

"ارے واہ میں کیوں اُڑاتی۔ میں نے تو تجھے بتایا تھا۔ تجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ بیٹھی ہے۔"

"تو کانا پھوسی کئے چلی جا رہی تھی۔ بس اس کے کان میں بھنک پڑ گئی۔"

"باولے خاں، شاما چڑیا کے کان کہاں ہوتے ہیں۔ جب اس کے کان نہیں ہیں تو سنے گی کیسے۔"

اور اسی کے ساتھ ایک اور تصویر دھیان میں اُبھر آئی۔ گرمیوں میں منہ اندھیرے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ سامنے منڈیر پہ شاما چڑیا عجلت میں اُتری ہے۔ دھیمی میٹھی آواز میں چہکتی ہے، دم کو تیز تیز گردش دیتی ہے اور اڑ جاتی ہے جیسے بس یہ بتانے آئی ہو کہ صبح ہو گئی ہے۔

میں نے سوچا کہ میں اصل میں شاما چڑیا سے شروع ہوتا ہوں۔ سو اگر میں واقعی تذکرہ لکھنے لگوں تو میں شاما چڑیا سے اس کی ابتدا کروں گا۔ پھر وہی خیال کہ اگر میں تذکرہ لکھوں۔ میں نے اس خیال کو کتنا رد کیا۔ مگر وہ تو میرے اندر سماتا ہی چلا گیا۔

ابتدا کرتا ہوں اس پیدا کرنے والے کے نام سے جس نے شاما چڑیا کو پیدا کیا۔

مگر شاما چڑیا پیدا کیسے ہوئی۔ ہمارے پنڈت گنگا دت مہجور کہا کرتے تھے کہ پرجاپتی اور اوشا نے مل کر سب انسان حیوان کو جنم دیا۔ اوشا نے پرجاپتی کی لالسا سے بچنے کیلئے سو روپ بدلے۔ مگر وہ جس مخلوق کا روپ بھرتی پرجاپتی بھی اسی مخلوق کے نر کا روپ لے لیتے اور اس روپ میں اس سے صحبت کرتے۔ اس کے نتیجے میں وہ مخلوق جنم لیتی۔ پنڈت گنگا دت کا یہ بیان اگر صحیح ہے تو پھر مجھے لگتا ہے کہ اوشا نے سب سے پہلے شاما چڑیا کو پیدا کیا اور شاما چڑیا کے ساتھ رنگ رنگ کی مخلوق پیدا کی۔ مگر رنگوں کا فرق کیوں، اجل پنکھ دیئے بگلا کو، کوئل کس بدھ کاری ---- خیر یہ اس کی اپنی مصلحتیں ہیں۔ بہر حال تعریف اس پاک ذات کی جس نے شاما چڑیا کو پیدا کیا اور دنیا بنائی اس رنگ سے کہ اوپر آسمان پاٹ دیا جس کی چال ٹیڑھی ہے اور نیچے زمین بچھائی۔ زمین پہ دریا بہائے، گنگا ندی، جمنا ندی، نہر فرات، بحر سمندر، سبزہ زار، ریگ زار، کوہسار، مگر ان کے بیچ مقتل کیسے نمودار ہو گئے۔ کورو کشیتر، کربلا، سری رنگا پٹم۔

خیر آدمی کو ٹھکانے لگانا کوئی مسئلہ نہیں مسئلہ یہ چلا آتا ہے کہ لاش کو کیسے ٹھکانے لگایا جائے۔ قابیل نے اسی تردد میں پوری زمین کو کھوند ڈالا۔ لاش کے بوجھ سے اس کے کاندھے دکھنے لگے تھے۔ مسئلہ تب سے جوں کا توں چلا آ رہا ہے۔ کاندھے تب سے دکھ رہے۔ دکھنے ہی ہیں کہ مولد کہیں مقتل کہیں۔ مدفن کہیں۔ آدمی آنکھ کہاں کھولتا ہے سوتا کہاں جا کر ہے۔ میرے مورث اعلیٰ خلد آشیاں احمد باللہ اصفہاں کی مٹی تھے قزوین کی خاک میں جا کر آسودہ ہوئے۔ ان کے فرزند حکیم علی شیر ریحان قزوین میں پلے بڑھے۔ مگر ان کا خالی قصر ریحان قزوین میں رہ گیا۔ خود جہان آباد کی خاک تلے جا کر آرام کیا۔ قضا کہاں سے کہاں لے گئی۔ مکینوں کو میرے اجداد میں کس نے کہاں آنکھ کھولی۔ کہاں جا کر آنکھ بند کی۔ ہاں میرے دادا یعنی میاں جان نے سخت صبر و استقلال کا مظاہرہ کر کے اپنی تقدیر کو اجداد کی تقدیر سے الگ کر لیا۔ اپنی جگہ پتھر کی طرح جمے

رہے ۔ جہاں آنکھ کھولی تھی وہیں آنکھ بند کی ۔ یوں وہ مٹی کے افسوس سے بچ گئے ۔ مگر اس کے بدلے میں دوسرے افسوس ان کے نوشتے میں لکھے گئے ۔ دکھ اور افسوس سے تو بہرحال آدمی کو مفر نہیں ہے اور اپنے خاندان کی ریت میں نے یہ دیکھی کہ ہر پیڑھی کے ساتھ کوئی بڑا افسوس وابستہ ہو گیا ۔ میرے مورث اعلیٰ احمد باللہ جب تک قزوین میں رہے بیت الابیض کو یاد کرتے رہے اور اصفہان کی مٹی کے لئے افسوس کرتے رہے ۔ حکیم علی شیر ریحان کے سرمے نے جہان آباد کے کتنے نینوں کو سکھ دیا کتنی اندھی آنکھوں کو روشن کیا مگر وہ مستقل کفِ افسوس ملتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے قزوین کی کتنی آنکھوں میں اندھیرا اترا اور ہم انہیں روشن نہ کر سکے ۔ میرے لکڑ دادا حکیم گل نوباغ علی نے چراغ حویلی کی صورت میں ایک نیا محل کھڑا کر دیا ۔ مگر گلستان محل کے لئے رونا رہ گیا ۔

میں کن اگلے پچھلے قصوں میں پڑ گیا ۔ اگلوں کے افسوس اگلوں کے ساتھ گئے ۔

اب میں ہوں اور میرے اپنے افسوس ہیں ۔ ہر زمانے کے اپنے افسوس ہوتے ہیں اور اپنی مسرتیں راحتیں ۔ اگلے زمانے کے ستم ایجادوں نے کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کئے ۔ یار و اغیار کی آنکھیں نکلوائیں اور اس میں راحت پائی ۔ اس زمانے نے اپنی ضرورتوں کے حساب سے ستم ایجاد کئے ہیں ۔ وہ میرے اجداد کا زمانہ تھا ۔ یہ میرا زمانہ ہے ۔ مجھے چاہیئے کہ اپنی ذات سے اور اپنے زمانے سے غرض رکھوں ۔ وہی طور اپناؤں جو میاں جان نے اپنایا کہ حمد و نعت کے بعد اپنا اور اپنے زمانے کے آشوب کا تذکرہ شروع کر دیا ۔ تذکرے کا یہی اسلوب ہے ۔ اسی میں سہولت بھی ہے ۔ میں اور میرے زمانے کا آشوب مگر میں کہاں سے شروع ہوتا ہوں اور میرا زمانہ کب سے شروع ہوتا ہے ۔ خیر میں تو شاما چڑیا سے شروع ہوتا ہوں ۔ مگر میرا زمانہ ۔ وہ کہاں سے کب سے شروع ہوتا ہے ۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے جو بھی زمانہ ملا خراب ملا یا زمانہ سدا سے خراب چلا آرہا

ہے ۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں چراغ حویلی میں تھا اور جب روز صبح سویرے منہ اندھیرے اوشا دھندلکے میں لپٹی منڈیر پہ آکر درشن دیتی، میٹھا گیت گاتی اور اوجھل ہو جاتی ۔ مجھے شیریں سے شکایت ہے عین وقت پہ کوئی گڑبڑ کر دیتی تھی یا گڑبڑا جاتی تھی ۔ سو میں کبھی شاما چڑیا کو اس کے گرم دھڑکتے بپوٹے کے ساتھ اپنی مٹھیوں میں محسوس نہیں کر سکا ۔ شاما چڑیا ہمیشہ میرے لئے دور کا درشن رہی ۔ تو محرومی کوئی آج کی نہیں ہے ۔ پھر بھی وہ زمانہ اچھا تھا ۔ شاما، اوشا، شیریں ۔ ایسا لگتا تھا کہ سارا زمانہ گھل مل کر چل رہا ہے ۔ کہیں کوئی تفریق ہی نظر نہ آتی تھی ۔ میں اور شیریں دن دن بھر ہرے بھرے گھنے پیڑوں کی دھوپ چھاؤں میں پھرتے پھراتے رہتے ۔ گرمیوں میں امبیوں سے لدے پیڑ ہمیں رجھاتے ۔ جاڑوں میں ان پیڑوں سے بے تعلق ہو کر املی کے پیڑوں کے ساتھ الجھتے سلجھتے رہتے ۔ ہر رت کھٹاس سے شروع ہوتی اور میٹھی ہوتی چلی جاتی ۔ امیاں کتنی کھٹی ہوتیں ۔ ساون کی بوندوں کے ساتھ ان میں رس بھرتا چلا جاتا اور میٹھا ہوتا چلا جاتا ۔ جاڑوں میں املی کے پیڑ کے نیچے ننھی ننھی گلابی کلیاں اتنی بکھری ہوتیں جیسے گلابی بستر بچھا ہوا ہے ۔ یہ کلیاں دانت اور زبان کے بیچ جاکر ہلکی سی کھٹاس کے ساتھ ہمیں ایک نئے ذائقہ سے آشنا کرتیں ۔ پھر کھٹی کھٹی کتاریں جن کا ہرا گودا کھٹمٹھا ہوتا چلا جاتا اور اپنے میں ایک مٹھاس پیدا کر لیتا ۔

سب ذائقے زائل ہو گئے ۔ موسم ہی بدل گیا ۔ شب و روز اور سے اور ہو گئے ۔
میاں جان کی آنریری مجسٹریٹی جا چکی تھی ۔ سو اب کچہری لگنا موقوف تھا ۔ نہ مدعا علیہ نہ مدعی، نہ ملزموں کی پکار نہ انصاف طلبی کا شور ۔ چراغ حویلی کی ڈیوڑھی ویران نظر آتی تھی ۔ میاں جان کا رعب داب ختم تھا ۔ اب وہ واقعی بوڑھے پھونس دکھائی پڑتے تھے ۔ دنیا جہان کے قصوں بکھیڑوں سے بے تعلق اپنے گوشے میں بیٹھے جانے کیا کچھ لکھتے رہتے تھے ۔ والد صاحب نے آکر کبھی شہر کا احوال سنایا تو ایک بے تعلقی کے سے انداز

میں سنا۔ اکا دکا بات کی اور پھر اپنے اوراق پر جھک گئے۔ آگے رکھی کالی سیاہی کی دوات میں نرسل کے قلم کو بار بار ڈبونا اور لکھے چلے جانا۔

عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے۔ عاصی پر معاصی مشاق علی گور کنارے بیٹھا ہے اور پیک اجل کا انتظار کھینچتا ہے۔ وقت آخر زمانے نے کیسی آنکھ پھیری ہے کہ ہم اپنے ہی شہر میں اجنبی ٹھہرے۔ ڈیوڑھی سے اس ڈر سے قدم نہیں نکالتا کہ کسی نے کھڑے ہو کر سلام نہ کیا تو فقیر کی کیا عزت رہ جائے گی۔ اپنی عزت سنبھالے گوشے میں بیٹھا ہوں۔ باغ میں بھی جانا موقوف ہے۔ سو نہیں معلوم کہ عزیز اشجار کا کیا حال ہے اور اثمار کی کیا کیفیت ہے۔

اب یہ شہر آفت زدہ شہر ہے۔ دیکھتے دیکھتے کتنے گھر خالی کتنے کوچے ویران ہوگئے۔ بلوے فساد کی خبریں قریب و دور سے دمبدم چلی آ رہی ہیں۔ خبریں کم افواہیں زیادہ افواہ گرم ہے کہ یہاں بھی اب کچھ ہونے والا ہے۔ جو دم گذرتا ہے غنیمت ہے۔ کس دم کیا گذر جائے کچھ خبر نہیں۔ کل ہی کی بات ہے برخوردار مصداق علی خبر لے کر آئے کہ آج رات چراغ حویلی پر حملہ ہوگا۔ پھر برخوردار نے اپنی بندوق بھری اور رات ٹہل ٹہل کر بسر کی۔ ادھر اپنی رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی۔

مصداق علی کے دماغ میں عجب سمائی ہے کہ چراغ حویلی کے کوٹھے کٹے جائیں اور پاکستان کی سمت کوچ کیا جائے۔ میں تحمل سے بیٹے کا خطبہ سنا کیا۔ جب پیمانہ صبر لبریز ہوگیا تو کہا کہ فرزند، جائداد لٹ جائے کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر جائیداد نیلام کی جائے اس میں ہمیں سخن ہے۔ یہ حقیر فقیر اسے آئینِ غیرت کے خلاف جانتا ہے سو ہمارے جیتے جی تو یہ نہیں ہوگا۔ ہماری آنکھ بند ہو جانے کے بعد تم مالک و مختار ہو۔ باقی پاکستان جانے نہ جانے کے باب میں تمہارا باپ کچھ نہیں کہتا۔ تم بے شک اہلِ خاندان کو لے کر نئے وطن سدھارو مگر اس افتادۂ خاک کو اپنی مٹی میں پڑا رہنے دو۔

قدم ہمارے اس زمین نے پکڑے ہوئے ہیں۔ جہاں کی مٹی ہے وہیں سار ہو تو اچھا ہے۔ جس دیار میں آنکھ کھولی ہے۔ اسی دیار میں آنکھ بند کریں گے۔

فرزندِ دلبند ہمارا جواب سن کر کبیدہ خاطر ہوئے۔ خاموشی سے اُٹھے اور اپنی بھری بندوق کے ساتھ حویلی کی پہرہ داری کرنے لگے۔ ادھر یہ فقیر اپنے خیالوں میں غلطاں اجداد کو دھیان میں لایا کہ ان کا کیا شعار تھا اور فرزند نے کیا طور اپنایا ہے۔ ہمارے خاندان پر ایسا وقت کب کب نہیں آیا۔ اس خاندان کی تو تقدیر ہی یہ چلی آتی ہے کہ چند پیڑیاں امن چین کے ساتھ گذاریں، اس کے بعد اکھڑے اور در بدر خاک بسر ہوئے پھر کسی دور کے نگر میں جا کر ڈیرے ڈالے اور بہ آئینِ شائستہ اس مٹی سے نباہ کیا۔ مگر کیا مجال کہ آن میں کبھی فرق آنے دیا ہو۔ جب زمین تنگ ہوئی سب ٹھاٹ چھوڑا اور دامن جھاڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ آئی دولت کو ٹھکرانے میں مضائقہ نہیں جانا۔ جاتی دولت کے لئے کف افسوس نہیں ملا۔ ابا جانی فرمایا کرتے تھے کہ جب ہمارا خاندان گلستان محل سے نکلا تھا تو تنکا ساتھ نہیں لیا۔ جیسے بیٹھے تھے بس ویسے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شہر سے نکل کر صبح کے ہونے میں دادی حضرت کو پان کی طلب ہوئی۔ متاسف ہوئیں کہ پاندان کیوں ساتھ نہ لے لیا۔ منہ میں کتر نہیں جائے گی تو سفر کیسے کٹے گا۔ دادا جانی نے یہ سن فوراً جمن میاں کو دوڑایا کہ جاؤ اور پاندان لے کر آؤ۔ جمن میاں نے بھی کمال دکھایا۔ تیر کے موافق گئے۔ خاکیوں سے بچتے بچاتے محل میں پہنچے اور پاندان بغل میں داب کے خرگوش کی مثال زقندیں بھرتے واپس آئے۔ دادی حضرت نے گلستان محل کی خیریت پوچھی۔ جمن میاں ٹھنڈا سانس بھر کے بولے کہ بی صاحب، ڈیوڑھی سونی پڑی تھی۔ کمرے دالان بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ ہاں صحن میں بطخیں شور کر رہی تھیں۔ یہ سن دادی حضرت نے ماتھا پیٹا۔ ہاتھ مل کے بولیں کہ مجھ کال کھائی کو اتنی سدھ بھی نہ رہی کہ ناند میں پانی بھر آتی۔ دکھیا بطخیں پیاسی ہوں گی۔

خیر یہ فقیر اپنے جیتے جی چراغ حویلی کو گلستان محل نہیں بننے دے گا۔ برخوردار مصداق علی کو میری طرف سے اجازت ہے کہ اپنی سہولت دیکھ کر جس روز چاہیں اہلِ خاندان سمیت پاکستان کی راہ لیں۔ اس درماندہ کو چھوڑ جائیں کہ چراغ حویلی میں رات کو چراغ جلانے کے لئے کوئی تو رہے۔ ویسے چراغ حویلی کی تقدیر میں خانۂ بے چراغ بننا اب لکھا گیا ہے۔ میں آخر کتنے دن جیوں گا۔ بتی سب جل چکی ہے۔ چراغ اب بجھا کہ اب بجھا۔

برخوردار فی الوقت اس حیص بیص میں ہیں کہ بوڑھے باپ کو چھوڑ کر چلے جائیں یا اس کے گذرنے کا انتظار کریں۔ اہلِ خاندان کی غیرت کو گوارا نہیں کہ اس بوڑھے کو وہ پیچھے اکیلی حویلی میں دشمنوں کے بیچ چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس باب میں مہجور آنجہانی کے بدھشٹر مہاراج کا عمل اہلِ نظر کے لئے ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بزرگ کُتّم کو لے کر اپنے سفرِ آخر پہ نکلا۔ مگر اس طور کے ساتھ کہ جو پیچھے رہ گیا اور ڈھے گیا اس کی طرف مڑ کر نہ دیکھا۔ بھائی برادر، تھکتے گئے ڈھیتے گئے۔ بدھشٹر مہاراج ٹھٹھکے بغیر آگے بڑھتے گئے۔ یہاں بھی وقت کا قافلہ تیز قدم ہے۔ ناتواں مشتاق علی تھک کر پیچھے رہ گیا ہے۔ ڈھے گیا ہے۔ مگر اہلِ خاندان بدھشٹر کی بصیرت سے محروم ہیں۔ اگر معاملہ فہمی سے کام لیں تو ان کا سفر بھی کھوٹا نہ ہو اور میں بھی الجھن سے نجات پاؤں۔

سو اس وقت عجب احوال ہے۔ اہلِ خاندان نے مجھے پکڑا ہوا ہے۔ میں نے زمین کو پکڑا ہوا ہے۔ اس مخمصے سے گلو خلاصی کیوں کر ہو۔ اسی صورت ہو سکتی ہے کہ یہ جان جلدی جان آفرین کے سپرد ہو۔ یہ درماندہ راہ تو چلنے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ پتہ نہیں فرشتۂ اجل کو آنے میں کیا تامل ہے۔ میں نے اپنے بزرگ مولوی مشتاق علی کا نسخہ بھی استعمال کر کے دیکھ لیا۔ یعنی اب کے ۱۴ شعبان المعظم کی مبارک شب پچھلے پہر بیچ صحن میں کھڑے ہو کر دعائے کمیل پڑھی۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ بِرَحْمَتِکَ الَّتِی وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ..... اور پھر بدرِ کامل کی چاندنی میں اپنی پرچھائیں کا جائزہ لیا کہ

گردن پہ سر نظر آتا ہے یا نظر نہیں آتا۔ اس بے بصر کی نظر نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا۔ دیر تک اپنی پرچھائیں کو تکا کیا پر فیصلہ نہ کر سکا کہ گردن پہ سر نظر آتا ہے یا نظر نہیں آتا۔ اب میں پیدا کرنے والے ہی سے یہ پوچھتا ہوں اور ساتھ میں گڑگڑا کر دعا کرتا ہوں کہ ربّ العزت میرے فرزند کو شرمندگی سے بچائے اور میری بیکسی کی شرم رکھ لے۔ فرشتۂ اجل کو شتابی سے بھیج۔ صاحبو جانا ہمارا ٹھہر گیا ہے۔ آج گئے یا کل گئے۔ مگر اسی آج اور کل میں دن گذرتے جا رہے ہیں اور اس کے ساتھ رنگِ فلک دگرگوں اور زمانہ زبوں ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ گنہگار خالقِ حقیقی سے ایک ہی رحم کا طالب ہے کہ جان جلدی جان آفریں کی نذر ہو۔ یا ارحم الراحمین، رحم، رحم، رحم

تب میں نے سوچا کہ آشیانے کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ ابوجان کی موت نے زبیدہ کو عارضی طور پر خاموش کیا تھا۔ مگر اس کے ذہن کی سوئی تو وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ کتنے دن خاموش رہ سکتی تھی۔ میں سادہ دل اس کی وقتی خاموشی سے یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ قصہ رفع دفع ہو گیا اور میرے ذہن سے یہ بات ایسے اتر گئی۔ جیسے کبھی چھڑی ہی نہیں تھی۔

"وہ آج آیا تھا۔ جواب مانگتا تھا"

"کون آیا تھا؟"

"پراپرٹی ڈیلر اور کون؟"

"پراپرٹی ڈیلر۔ اچھا۔ اس نے پھر پھیرے لگانے شروع کر دیئے"۔ میں ڈر سا گیا۔ دفعتاً مجھے وہ دن یاد آ گئے۔ جب وہ میرے پیچھے پھر رہا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا۔ جیسے میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی یا دروازے کی گھنٹی میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا۔ بس یہی گمان ہوتا کہ ہو نہ ہو وہی ہے اور بس جیسے اس نے مجھے آ لیا ہے۔

"خیر آج کے دن تو میں نے ہی اُسے آنے کے لئے کہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آج تم گھر پہ رہو گے۔ چھٹی کا دن ہے۔ مگر تم صبح ہی گھر سے نکل گئے۔ تم گئے ہو اور وہ آیا ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں کتنا اطمینان محسوس کیا کہ میں صحیح وقت پر گھر سے نکل گیا۔

"پوچھتا تھا کہ کیا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ فیصلہ صاحب کریں گے۔ کسی وقت فون کر کے ان سے وقت لے لینا اور آ کے بات کر لینا۔ کہتا تھا کہ گاہک ابھی ہاتھ میں ہے۔ جلدی فیصلہ کریں۔"

یہ شخص، میں نے سوچا، گلے پہ چھری رکھ کے جواب مانگتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ فی الوقت اسے ٹال دیا جائے۔ ممکن ہے تاخیر سے گاہک بددل ہو جائے اور کوئی اور گھر دیکھے۔ میں نے پراپرٹی ڈیلر کو ٹالنے کی کئی ترکیبیں سوچیں۔ لیکن ہر بار وہی ایک اندیشہ کہ زبیدہ اس ترکیب کو چلنے بھی دے گی۔ گڑبڑ تو، میں نے سوچا، اصل میں گھر کے اندر ہے۔ چھری میرے گلے پہ زبیدہ نے رکھی ہوئی ہے اور چھری جیسے اب گلے کے بالکل قریب آ گئی اور اچانک میرے دل میں ایک شک جاگا کہ کہیں خود زبیدہ نے تو پراپرٹی ڈیلر سے رابطہ پیدا نہیں کیا تھا۔

"کہتا تھا کہ گاہک موٹی اسامی ہے اور ضرورت مند ہے۔ مکان کی اچھی قیمت لگ جائے گی۔"

"پتہ نہیں کون آدمی ہے۔ یہ جو موٹی آسامیاں نظر آتی ہیں۔ بالعموم فراڈ لوگ ہوتے ہیں۔" میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"میں نے پوچھا تھا۔ وہی آدمی ہے جسے لا کر اس نے گھر دکھایا تھا۔"

"وہ آدمی" میں چونکا اور بے ساختہ منہ سے نکلا "وہ سبز قدم۔ مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شخص بوجان کی موت کا ذمہ دار ہے۔"

زبیدہ چپ ہی تو ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد بولی بھی تو دوسرے ہی لہجہ میں "پتہ نہیں بوجان کو کیا ہو گیا۔ اچھی بھلی تھیں۔ ایک ساتھ گریں اور ایسی گریں کہ پھر اُٹھیں نہیں۔ تین دن میں چٹ پٹ ہو گئیں۔ وہم کی بات تو ہے۔ مگر کیا پتہ ہے کہ اس بخت مارے گھر ہی پہ کوئی اثر ہو۔ مجھے تو یہی شک گزرتا ہے۔ خیر اگر کسی باہر والے کی نحوست تھی تو اب جب ہمیں اس گھر میں رہنا بسنا ہی نہیں ہے تو ہماری بلا سے کہ آنے والے کے نیک قدم ہیں یا سبز قدم ہیں۔"

"زبیدہ میں ایک بات بتا دوں۔" اب میری زبان کھل گئی تھی۔ "اگر میں نے یہ مکان بیچا تو ہمارے خاندان میں مکان بیچنے کی یہ پہلی مثال ہو گی۔ ہمارے والد صاحب نے چراغ حویلی کو فروخت نہیں کیا۔ میاں جان جو منع کر گئے تھے۔ بس تالا ڈال کے نکل کھڑے ہوئے اور یہاں آ کر بھی ہم نے اس کی بنیاد پہ کوئی الاٹمنٹ نہیں کرائی۔"

"یہ کوئی عقلمندی کی بات تھوڑا ہی تھی۔ لوگوں نے جھوٹے سچے کلیم داخل کر کے کتنی بڑی بڑی جائدادیں بنا لیں۔ اب وہ رئیس بنے بیٹھے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"خیر پرانی باتوں کو کریدنے میں کیا رکھا ہے۔" زبیدہ نے بات کو لمبا کھنچتا دیکھ کر خود اسے مختصر کر دیا۔ "اب کی بات کرو۔ بخت مارے پراپرٹی ڈیلر کا تقاضے پہ تقاضا آ رہا ہے۔ کہتا ہے کہ جلدی فیصلہ کرو نہیں تو گاہک ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

"فیصلہ میں نے کر لیا ہے۔"

"کیا؟"

"آشیانہ نہیں بکے گا۔" میں نے قطعی لہجہ میں کہا اور فوراً ہی اُٹھ کر برآمدے میں آ گیا۔

میں مطمئن تھا کہ بالآخر میں نے اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا ہے اور اب اس کیلئے جواز بھی تو پیدا ہو گئے تھے۔ اب آشیانہ خالی اینٹ پتھر سے بنا گھروندا تو نہیں رہا تھا۔ اس کی ڈیوڑھی سے ایک بزرگ کا جنازہ نکل چکا تھا اور پھر شیریں سے تجدید ملاقات کی یادیں بھی اس کے درو دیوار سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ ایک چڑیا ہارسنگھار کے بیچ سے اُڑ کر آئی اور عین میرے سامنے میز پر بیٹھ کر چیں چیں کی اور واپس چلی گئی۔ کیا وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اس وقت بھی میں اس کی تواضع کے لئے کچھ دانہ دنکا لے کر آیا ہوں۔ یا خالی شکایت کرنے آئی تھی کہ خالی ہاتھ کیوں آئے ہو۔ ادھر ہارسنگھار پر چڑیوں کی برات اُتری ہوئی تھی۔ کتنا شور مچا رہی تھیں۔ اس جواز کی طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا کمرشل ایریا میں نے سوچا، اس علاقہ میں پھیلتا چلا جا رہا ہے تو مجھے کیا۔ میرے گھر میں تو ہارسنگھار بھی مہکتا ہے اور چڑیاں بھی چہکتی ہیں۔ اگر اس علاقہ میں کمرشیل ایریا پھیل رہا ہے تو پھر تو گھر کا قائم رہنا اور بھی ضروری ہے۔ چڑیوں کو کہیں تو پناہ ملنی چاہیے۔

اچانک مجھے لگا کہ چڑیوں کی چہکار میں ایک اضطراب کی کیفیت اور خون کی لہر ہے اور اسی آن میں نے دیکھا کہ ہارسنگھار تلے ایک بلی منڈلا رہی ہے۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ میرے کان کھڑے ہوئے تو آ گیا وہ موذی میں بالکل یہ سمجھا کہ پراپرٹی ڈیلر آیا ہے۔ مگر اب میں اس سے خوفزدہ نہیں تھا۔ اب میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے لئے تیار تھا۔ جب زبیدہ کے سامنے میں نے کھل کر بات کر دی تو پراپرٹی ڈیلر کیا چیز ہے۔ میں لپک کر گیٹ پر گیا۔ گیٹ کھولا۔

"ارے کامریڈ، تم ہو۔ تم تو اس روز کے بعد غائب ہی ہو گئے۔ آج صورت دکھائی ہے۔"

کامریڈ نے میری بات کا جواب دینا مطلق ضروری نہیں سمجھا۔ برآمدے میں آ کر تھیلا گلے سے اُتار کر میز پہ پٹخا اور کرسی پر پسر گیا۔ میں نے تعجب سے تھیلے کو دیکھا جو کتابچوں رسالوں، اخباروں سے ٹھسا ٹھس بھرا تھا۔ "کامریڈ یہ کیا۔ تم تو تھیلے کو نہر میں خالی کر

آئے تھے۔ یہ تو پھر بھرا نظر آ رہا ہے۔"

"یار کیا کرتا۔ سالی زندگی بے معنی نظر آنے لگی تھی۔ کامریڈ آدمی کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیئے۔ سالے تمہاری طرح میں بے مقصد زندگی نہیں گذار سکتا۔"

"ٹھیک کہا تم نے کامریڈ۔ لدو جانور کی پیٹھ سے گھاس کا گٹھر اُٹھا لیا جائے تو وہ بیکل ہو جاتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ بے مقصد زندگی گذار رہا ہے۔"

کامریڈ نے میری بات کو نظر انداز کیا اور پوچھا۔

"پھر گھونسلے کے بارے میں کیا سوچا۔"

اور میں نے یوں جواب دیا جیسے کوئی مشکل مرحلہ کامیابی سے سر کر لیا ہے۔ "کامریڈ میں نے بیگم سے بالآخر صاف صاف کہہ دیا کہ "آشیانہ" ہم نہیں بیچیں گے۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا، بیچو یار کھو" کامریڈ نے سرد مہری سے کہا۔

میں حیران کہ کامریڈ نے آشیانہ کو بیچنے کے خیال کی کس شد و مد سے مخالفت کی تھی اور اب وہ میرے فیصلہ پر کتنی سرد مہری دکھا رہا ہے۔

"میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کچھ نہیں بچے گا۔ سب جل جاوے گا۔ مروا دیا حرامزادوں نے۔"

"کیا بک رہے ہو کامریڈ۔ ہوش میں تو ہو۔"

"بالکل ہوش میں ہوں۔"

"تمہیں کچھ یاد ہے کہ تم نے "آشیانہ" بیچنے کی کتنی مخالفت کی تھی اور کتنے مجھے طعنے دیئے تھے۔"

"یاد ہے۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ شاید بھابی ٹھیک ہی کہتی تھی۔"

"کیا ٹھیک کہتی تھی۔" مجھے کامریڈ پر اب غصہ آنے لگا تھا۔

"یہی کہ آخر اس نے کچھ تو دیکھا ہو گا۔ بھابی جھوٹ بولنے والی خاتون تو نہیں ہے۔"

"اُس نے تو تین مُردے دیکھے تھے۔ کفنیاں پہنے ہوئے تین لمبے بانس جیسے آدمی۔ تم یقین کرو گے اس بیان پر؟"

"یار اس نے تو تین آدمیوں کو کفنیاں پہنے دیکھا تھا۔ مجھے تو اس شہر کا ہر آدمی کفنی پہنے نظر آتا ہے۔"

"کامریڈ، تم واقعی کھسک گئے ہو۔ میں اپنی بیوی کو روتا تھا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ تم اس سے آگے نکل گئے۔"

"استاد تم نے تو آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ کیا ہونے لگا ہے۔"

"کیا ہونے لگا ہے؟"

"گڑبڑ۔ لمبی گڑبڑ نظر آتی ہے۔ پتہ ہے آج کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

ایک سوالیہ نشان کی صورت میں گھر سے نکلا اور حیران ہوا یا مظہر العجائب اتنی خلقت۔ اتنا آدم تھا اس شہر میں۔ سب ہی گھروں سے نکل پڑے ہیں۔ مگر کیوں۔ پوچھا کس سے جائے۔ ہر چہرہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ پریشانی سے بھرا سوالیہ نشان۔ جیسے ان پر کوئی بڑی مصیبت آن پڑی ہو۔ اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔ قصہ کیا ہے۔ کہیں پھر وہی کچھ تو نہیں ہونے لگا ہے۔ شاید۔ پھر تو مجھے واپس گھر جانا چاہیے۔ ہماری عقبی دیوار سے جیل کا دروازہ اور پھانسی کا تختہ دونوں صاف نظر آتے ہیں۔ مجھے یوں بھی گھر پہنچنا چاہیے کہ زبیدہ گھر میں اکیلی ہے۔ اس وقت تو بوجان موجود تھیں اور اس وقت تو زبیدہ نے بھی اسے تماشہ ہی جانا تھا۔ لیکن اب تو ویسے ہی اس کے اندر دہشت سمائی رہتی ہے اور بوجان بھی نہیں ہیں کہ دعا پڑھ کر چاروں سمتوں میں منہ کر کے چار پھونکیں ماریں اور شیاطین کو دفع کر دیں۔

"بہت زبردست دھماکہ تھا۔"

"دھماکہ۔ اچھا؟ کہاں کب؟"

"پورا شہر ہل گیا۔ کمال ہے آپ کو پتہ نہیں چلا۔ نیو پلازا کا تو ایسا نقشہ ہے جیسے بمباری ہوئی ہو۔"

"نیو پلازا۔ وہ تو بہت پختہ عمارت تھی۔ بالکل بم پروف نظر آتی تھی۔"

"پختہ عمارتوں ہی کو تو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کچے گھروں میں تباہ ہونے کے لئے ہوتا کیا ہے۔ اس عمارت کے تباہ ہونے سے کتنا کچھ تباہ ہو گیا۔ پورے مارکیٹ پہ جھاڑو پھر گئی۔"

خیر نیو پلازا ہمارے گھر سے بہت فاصلے پر تھا مگر بساطیوں والا بازار بھی ہمارے گھر سے دور ہی تھا۔ وہ رات چراغ حویلی میں ہماری آخری رات تھی۔ وہ پوری رات بوجان نے جانماز پر بیٹھ کر اور والد صاحب نے اپنی بھری بندوق کے ساتھ چھت پر بیٹھ کر گذاری۔ بوجان گڑگڑا کر دامن پھیلا کر دعا کرتی رہیں کہ یہ آخری رات خیریت سے گذر جائے کہ صبح کو تو سپیشل میں بیٹھ کر رخصت ہو ہی جانا ہے۔ ہماری گلی میں بالکل سناٹا تھا۔ لیکن دور کے محلوں سے شوروغل کی نعروں کی آوازیں رات بھر آتی رہیں۔ وہ بساطیوں والے بازار کی سمت تھی جس طرف سے شوروغل کی آوازیں زیادہ آ رہی تھیں۔ اسی سمت میں آسمان بھی بہت سُرخ ہو گیا تھا اور والد صاحب نے آسمان کی سرخی سے اندازہ لگایا کہ بساطیوں والے بازار میں آگ لگی ہے اور جب فائر بریگیڈ کی آواز سنائی دی تو گویا ان کے شک کی توثیق ہو گئی۔ شہر میں ہر طرف سے شوروغل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جا بجا آسمان سرخ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ پورے شہر میں بس ایک چراغ حویلی بچی رہ گئی ہے اور بس ایک گلی خاموش ہے۔ اونگ، ہیرنگ، سرینگ، اونگ، بلونگ، بجرنگ، مم کلٹ، بسکٹ مم متوحش تھی۔

پورنی مم جھنا چورنی - دور نکل آنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا - گلی اسی طرح خاموش تھی - ہاں گلستان محل کے اندر سے بطخوں کی سراسیمہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں - اس سناٹے میں بطخوں کی پریشان پکار اور اس آن مجھے دھیان آیا کہ ناند میں پانی نہیں بھرا گیا تھا - بطخیں پیاسی ہیں - ایک اکیلی بطخ گلی میں بھٹک رہی تھی - گلستان محل کا پھاٹک تو مقفل تھا - یہ بطخ کیسے باہر نکل آئی - مگر اس کا باہر نکل آنا بے سود ثابت ہوا - گلی میں بھی کہیں پانی کا نام و نشان نہیں تھا - قافلہ سے بچھڑی ہوئی پیاسی بطخ کہ نہ واپس قافلہ میں جا سکتی تھی نہ دور نکل سکتی تھی - اندر سے پیاسی بطخوں کی پکار آتی اور وہ آگے جاتے جاتے ٹھٹکتی اور منقار آسمان کی طرف بلند کر کے دردناک آواز میں جواب دیتی - کتنی دور تک کتنی دیر تک وہ پکار میرا تعاقب کرتی رہی، میرے کانوں میں گونجتی رہی قائیں قائیں قائیں قائیں قائیں - تب گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی - میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا - ایک سوار باحال پریشان گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا چلا آ رہا تھا - قریب آکر باگیں کھینچیں - "عزیز پیاسا ہوں - پانی کی طلب رکھتا ہوں"

میں نے جواب میں اپنی پانی کی چھاگل کھولی - کوزہ بھر کر اس تشنہ لب کو پیش کیا - سوار نے اتر کر گھوڑے کو درخت کے تنے سے باندھا - بیٹھ کر پانی پیا، خدا کا شکر ادا کیا -

تب میں نے استفسار کیا کہ اے مرد مسافر، بیان کر کہ تو کس سمت سے آتا ہے اور کس سمت میں جاتا ہے -

اس نے جواب میں آہ سرد بھری اور یوں گویا ہوا کہ اے عزیز، میں شہر تیرہ بخت اصفہان نصف جہان کی سمت سے آتا ہوں اور ادھر جاتا ہوں جدھر میرا رب مجھے لے جائے -

میں نے تامل کیا - پھر ڈرتے ڈرتے استفسار کیا کہ اے اصفہان نصف جہان

کی سمت سے آنے والے کچھ اصفہان نصف جہان کا احوال بیان کر -

یہ سن اس مرد اجنبی نے پھر آہ سرد بھری اور یوں گویا ہوا کہ "اے اصفہان نصف جہان کا حال پوچھنے والے، میں اس باب میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب میں اس دیار سے نکلا ہوں تو ابھی کھوپڑیوں کا مینار ادھورا تھا کہ اصفہان کی کچھ گردنوں پر ابھی سر باقی تھے اور ابھی سب گھروں میں خاموشی نے گھر نہیں کیا تھا کہ ہنوز کتنی حویلیوں سے عورتوں کے بین اور بچوں کے بلکنے کی آوازیں آ رہی تھیں"

میں نے یہ سنا اور ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا - تامل کیا، پھر رکتے رکتے سوال کیا کہ "اے اصفہان نصف جہان سے آنے والے کیا تیرا گذر بیت الابیض کی طرف سے بھی ہوا"

"ہاں ہوا - میں جب ادھر سے گذرا ہوں تو وہ ایوانِ بلند و بالا شعلوں کی لپیٹ میں تھا اور اندر سے صرف گھوڑوں کے ہنہنانے کی مضطرب آوازیں آ رہی تھیں - جیسے رسہ تڑا کر بھاگ نکلنے کے لئے تڑپ رہے ہوں"

تب میں نے گریہ کیا اور میں نے بکا کی، اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ خَیر - سوال سب بے سود - گریہ دعا بکا کا فائدہ معلوم - میرے تین بڑے افسوس ہیں - پہلا افسوس گلستان محل کی پیاسی بطخوں کے لئے کہ کاش چلتے وقت میں ان کی ناند میں پانی بھر آتا - دوسرا افسوس شاما چڑیا کے لئے جسے میں نے سدا منڈیر پہ چہکتے دیکھا، اسے پکڑ نہیں سکا - تیسرا افسوس .... خیر تیسرے افسوس کا اب کیا ذکر - اب وہ بستی نہ وہ دیا نہ وہ لوگ جانے ان بالا قد گھوڑوں پہ کیا گذری - وہاں تو اب یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کھوپڑیوں کا مینار کہاں کھڑا کیا گیا تھا - قصرِ ریحان کی فصیلیں کتنی خستہ ہو چکی تھیں - کتنی کاہی ان پر جم چکی تھی - کوئی ہے، کوئی ہے، کوئی ہے - میں پکارا کیا - کوئی جواب نہیں آیا - پیاسی بطخیں پانی کی تلاش میں جانے کس طرف نکل گئیں - بس منڈیر پہ ایک کوا

گُم سُم بیٹھا تھا۔ اس کے ایک بازو کے سارے پر سفید ہو چکے تھے۔ اس نے کتنی اجنبی نظروں سے مجھے دیکھا اور کتنی خاموشی سے اُڑ گیا۔ تب میں نے افسوس کیا۔ میرا تیسرا بڑا افسوس۔ میرا سب سے بڑا افسوس یہی ہے۔ اے جہان آباد، اے گلستانِ محل، اب تیری اُجاڑ منڈیروں پہ بیٹھنے والے کوے بھی مجھے نہیں پہچانتے۔ سو میں نے جانا کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ مگر خیر میں تو شاما سے شروع ہوتا ہوں۔ شاما اوشا ہے۔ شیریں کی بچی، اس نے اگر عین وقت پہ گڑبڑ نہ کی ہوتی تو شاما میری مٹھی میں تھی۔ وہ ایک ساعت تھی کہ پلک جھپکتے آئی اور گذر گئی۔ میں اس چوک کو کبھی نہیں بھول سکا۔ ایک بڑا پچھتاوا میری قسمت میں لکھا گیا۔ عمر اس حسرت میں گذری کہ وہ ساعت کاش پھر آئے۔

اس وقت میں یہی سمجھا تھا کہ وہ ساعت پھر آ گئی ہے اور اب یہ ساعت میری مٹھی میں ہے۔ زندگی میں آنے والی ساعت اسی طرح جل دیتی ہے۔ پتہ چلا کہ ساعت ایک مرتبہ چنگل سے نکل جائے تو دوبارہ درشن بھی دے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پچھتاوے میں اُلٹا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اے شہرِ خوبی، اتنے دن گذرنے پر یہ بھید نہ کھلا کہ تو کون ہے، کہاں سے آئی ہے، رات کو جب وصل کی گھڑیاں قریب آتی ہیں تو کس پردے میں چلی جاتی ہے۔ وہ نازنین یہ سُن، آگ بھبھوکا ہوئی اور بولی کہ اے نادان کیا تو نے قول نہیں دیا تھا کہ تو کچھ نہیں پوچھے گا۔ بولا، قول دیا تھا۔ مگر اب ضبط کا یارا نہیں، پوچھے بنا چارہ نہیں۔ نادان، یہ مت پوچھ۔ پچھتائے گا۔ پوچھوں گا۔ دیکھ مت پوچھ، پچھتائے گا۔ پوچھوں گا۔ تب وہ ماہ رو زمین پہ لوٹی پوٹی اور کبوتری بن گئی پھڑپھڑائی اور اُڑ گئی۔ تب حیرانی پریشانی بخت میں اس کے لکھی گئی۔ در بدر خاک بسر پھرتا تھا۔ اور پوچھتا تھا کہ وہ شہرِ خوبی کس دیس میں بستی ہے۔ ایک مردِ پیر نے اسے دیکھا اور افسوس سے کہا کہ کمبخت تو نے جاننے کی کوشش کیوں کی تھی۔ کیا شربتِ دیدار تیرے لئے کافی نہیں تھا۔ اب وہ وہاں ہے جہاں پہنچنا تیرے مقدور میں نہیں ہے۔ کوہ قاف

سے آگے کوہ قاف ہے۔ اس سے آگے پھر کوہ قاف ہے۔ وہاں وہ قلعۂ بے در میں رہتی ہے۔ جہاں نہ آدم زاد پہنچ سکتا ہے۔ نہ پرندہ پر مار سکتا ہے۔ ہم کچھ نہیں جان پاتے۔ جاننے کی کوشش میں خراب ہوتے رہتے ہیں۔ خیر ان دنوں تو ہم دونوں ہی بےخبری کی جنت میں تھے۔ کسی بات کی خبر ہی نہیں تھی۔ جب اس کے سینے سے دوپٹہ ڈھلک کر نیچے گرا تھا تو مجھے بس ایک استعجاب ہوا تھا۔ وہ استعجاب ابھی تک برقرار ہے۔ استعجاب، استعجاب، استعجاب ــــ از کجا می آید ایں آوازِ دوست ــــ کہاں سے کیسے میں نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ جب دیکھا تو میں نے کہا کہ یہ تو وہ نہیں ہے۔ جب جانا کہ وہی ہے تو پھر نہ صورت دکھائی دی نہ آواز آئی۔ آواز آخر کہاں سے آتی تھی، سمندر کے اُدھر سے یا پہاڑوں کے پیچھے سے یا پاتال سے وہ فقط آواز تھی۔ آواز میں اتنا سحر ہوتا ہے۔ میری زندگی میں خالی ایک آواز ہے، دور سے آتی ہوئی۔ ایک نرم شیریں آواز کہ دھیمی ہوتے ہوتے کان کے قریب آتے آتے سرگوشی بن جاتی تھی۔ بلند آہنگ رنگین مکالموں میں کیا رکھا ہے۔ ایک سرگوشی بہت ہوتی ہے۔ بشرطیکہ ہاں بشرطیکہ..... کتنی دور سے ایک خشک چوب سے گذر کر وہ شیریں آواز آئی اور ایک سرگوشی بن گئی۔ اس سرگوشی میں کیا کچھ تھا۔ پورا ایک شہرِ آرزو۔ ایک حرفِ شیریں سے کائنات میں کتنا آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ گم ہو جائے تو پھر یہ پوری کائنات ایک بےہنگم شور ہے۔ زق زق بق بق چخ چخ رولا گولا غل غپاڑہ بھنبھل بھوسا۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ جس نے سنا اس طرف دوڑ پڑا۔ لگتا تھا کہ پورا شہر وہاں ٹوٹ پڑا ہے۔ تباہی بھی تماشے کا ذائقہ رکھتی ہے۔ اتنے بڑے پیمانے پر تباہی کا تماشہ دیکھنے کو کب ملتا ہے۔ کھوپڑیوں کے مینار روز روز تو کھڑے نہیں ہوتے۔ ملبے سے لاشیں برآمد کی جا رہی تھیں۔ کتنے جسموں میں ابھی جان باقی تھی۔ سانس چل رہا تھا۔ کراہنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

آدمی بھی کتنی سخت جان مخلوق ہے۔ حیرت اور دہشت سے آنکھیں دیکھنے والوں کی پھٹی ہوئی تھیں۔ قیاس کے گھوڑے دوڑائے جارہے تھے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

گھر میں داخل ہوا تو گویا شور کے جہان سے نکل کر خاموشی کے منطقہ میں داخل ہو گیا۔ حیران ہوا کہ باہر اتنا شور اندر اتنی خاموشی۔ کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ سارا ہنگامہ اندر ہوتا ہے۔ باہر سناٹا۔ داخل ہوتے ہی میری نظریں آج پہلے پچھواڑے والی دیوار پر گئیں۔ نادانستہ اسی طرف ہو لیا۔ یوں ہی دیوار سے دوسری طرف جھانکنے لگا۔ آج پہلی مرتبہ میں نے اپنی اس دیوار سے پرلی طرف جھانکا تھا۔ کتنا تعجب ہوا۔ جیل کی لمبی پُراسرار فصیل یہاں سے صاف نظر آرہی تھی اور کتنی قریب محسوس ہوتی تھی۔ جیسے بس یہ رہی ذرا ہاتھ بڑھاؤ اور چھو لو۔ ویسے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ دل میں کہا۔ زبیدہ یہاں کیا دیکھ لیتی ہے۔

زبیدہ نے برآمدے سے نکل کر مجھے تعجب سے دیکھا "ادھر کیا کررہے ہو"

"کچھ نہیں"۔ جیسے میں کوئی غلط یا فضول سی حرکت کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں، فوراً ہی ادھر سے پلٹ پڑا۔

دونوں وقت مل رہے تھے۔ مولوی غلام رسول کے بتائے ہوئے وظیفہ کے مطابق بوجان کی تقلید میں زبیدہ نے چراغ جلایا اور دیوار کے پرلی طرف دیکھے بغیر منڈیر پر رکھا اور چلی آئی۔

"ہوا تیز ہے۔ بجھ تو نہیں جائے گا"۔ مجھے یونہی ایک تشویش سی ہوئی۔ حالانکہ میں بوجان کے وقت سے یہ وظیفہ دیکھتا چلا آرہا تھا اور مجھے کبھی اس کے جلنے بجھنے کے بارے میں تردد نہیں ہوا تھا۔

میرے کہنے پر زبیدہ نے بہت تشویش سے چراغ کی کانپتی ہوئی لو کو دیکھا۔ پھر جیسے اپنے آپ کو دلاسہ دے رہی ہو کہنے لگی "اس روز تو ہوا زیادہ تیز تھی۔ مگر

نہیں بجھا تھا"

اس روز؟ ہاں اس روز ہوا واقعی زیادہ تیز تھی۔ چراغ کی لو کتنی کانپ رہی تھی۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اتنی دھیمی ہو جاتی کہ بس اب بجھی کہ اب بجھی مگر جھونکا گذرنے کے بعد پھر تیز ہو جاتی۔ یہ اس روز کی بات ہے۔ جس روز پھانسی لگی ہے۔ اس روز بھی یہی صورت تھی۔ بہت شور تھا اور بہت سناٹا تھا۔ جہان آباد ایک بڑے شور کی زد میں تھا۔ گلستان محل میں ابھی تک سب موجود تھے۔ سوائے بزرگوار مولوی میثاق علی کے۔ مگر گلستان محل بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہاں بیچ بیچ میں کسی بطخ کی ہراساں پکار سنائی دے جاتی تھی۔ جب بزرگوار مولوی میثاق علی گھر سے نکلے ہیں تو بطخیں ان کے پیچھے پیچھے قائیں قائیں کرتی ہوئی ڈیوڑھی تک گئی تھیں۔ بعد میں دیر تک چلاتی رہیں۔ جیسے جانے والے کو پکارتی ہوں۔ مگر اب خاموش تھیں۔ بس اچانک کوئی بطخ اپنی گردن اٹھاتی اور ایک ڈری سی قائیں کر کے چپ ہو جاتی۔ اب دونوں وقت مل رہے تھے اور بزرگوار مولوی میثاق علی کا مصلےٰ خالی پڑا تھا۔ خالی مصلےٰ کو دیکھ کر میری لکڑدادی کی آنکھ بھر آئی۔ بہت روئیں۔ کتنی دیر تک روتی رہیں۔ اسی میں ان کی آنکھ لگ گئی۔ صبح کو انہوں نے بتایا کہ "اے بی پچھلے پہر کو میری آنکھ کھل گئی۔ سامنے جو نظر گئی تو کیا دیکھوں ہوں کہ بھائی میثاق علی مصلے پہ بیٹھے تسبیح پھیر رہے ہیں۔ سفید براق کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کیا بتاؤں چہرے پہ کیسا نور برس رہا تھا"۔ تو اب صبح ہو رہی تھی اور میں تذبذب میں تھا کہ چراغ معمول کے مطابق شہر کے چراغوں کے ساتھ بجھا ہے یا رات کے کسی پہر میں تیز ہوا کا کوئی جھونکا اسے بجھا گیا۔

"زبیدہ"

"ہوں"

"وہ پراپرٹی ڈیلر پھر ملا تھا۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔ وہاں جائے حادثہ پہ ایک خلقت ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہاں وہ بھی نظر آگیا۔ میں نے اس سے آنکھ بچانے کی بہت کوشش کی۔ مگر ۔۔۔ خیر ۔۔۔ عجب چیز ہے۔ جب ملتا ہے مجھے CONFUSE کر دیتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"مگر تم تو فیصلہ سنا چکے ہو۔" زبیدہ نے طنز بھرے لہجہ میں کہا۔

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کامریڈ سے جب میں نے ذکر کیا تو اس نے کچھ اور ہی کہا۔ کامریڈ خود CONFUSED آدمی ہے۔ مجھے بھی CONFUSD کر دیتا ہے۔"

"بخت مارا کامریڈ۔ مجھے تو وہ زہروں بُرا لگتا ہے۔ اصل میں تو اسی کے کہنے پر تم بہک گئے تھے۔ اب وہ کیا کہتا ہے۔"

کامریڈ نے کیا کہا تھا۔ میں نے زبیدہ کو کچھ نہیں بتایا ورنہ پریشان ہو جاتی۔ مگر میں نے سوچا کہ کامریڈ سے ایک مرتبہ کھل کر اس مسئلہ پہ بات کر لی جائے۔ اس وقت تو اس نے روا روی میں ایک بات کہہ ڈالی تھی کیا وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ یہ محض اس کی قنوطیت تھی یا واقعی حالات ۔۔۔ خیر۔ کامریڈ سے چل کر بات کرنی چاہیئے۔ اس وقت تو اسے اپنے ٹھکانے ہی پہ ہونا چاہیئے۔ میں بس فوراً ہی نکل کھڑا ہوا۔ نقشہ باہر اور ہی دیکھا۔ خلقت کو سراسیمہ دیکھا۔ سروں کا سمندر اُمنڈا ہوا تھا۔ چاندنی چوک کی سمت میں بہتا تھا۔ میں حیران کہ یہ ماجرا کیا ہے، ہر فرد کیوں چاندنی چوک کی طرف دوڑا جاتا ہے۔ اے صاحبو۔ قفلِ دہن کو کھولو۔ منہ سے کچھ تو بولو۔ زبان کیوں سی رکھی ہے۔ حلق پہ تمہارے کس نے چھری رکھی ہے۔ معلوم تو ہو کہ اس ناہنجار کوچہ میں اب کونسا گل کھلا ہے۔ کونسا آسمان ٹوٹا ہے اور میں رویا کہ جہان آباد تو تماشوں کا شہر بن گیا۔ میرے پڑدادا نے کہا کہ دنیا میں سب سے بڑھ کر

ظالم اور جاہل امتِ مسلمہ نے چنے ہیں۔ اس بزرگ نے ایسا کہا، پھر گریہ کیا، پھر گڑگڑا کر دعا کی کہ اے غفور الرحیم تو اپنے حبیبؐ کے صدقے میں اس اُمت کے گناہوں کو بخش دے ۔۔۔ شامتِ اعمالِ ما صورت نادر گرفت ۔۔۔ ایک کوکھ سے آخر کتنے نادر شاہ پیدا ہوں گے ۔۔۔ کامریڈ ۔۔۔ کامریڈ ۔۔۔ اے یار کامریڈ ۔۔۔ دروازہ تو کھول ۔۔۔ میں نے کتنا پکارا، کتنی کنڈی کھٹکھٹائی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ہار کر میں نے کنواڑ جھڑ جھڑائے۔ دروازہ دھاڑ سے کھل گیا۔ جھلنگا چارپائی کے برابر بڑے سٹول پر اخباروں رسالوں کتابوں سے بھرا انھیلا رکھا تھا، مگر کامریڈ موجود نہیں تھا۔ میں حیران کہ کامریڈ گیا کہاں۔ میں اُسے اس کے سارے ٹھکانوں پر دیکھتا ہوا آرہا تھا۔ وہاں کہیں نہیں تھا۔ میں نے طے کیا کہ اسے گھر پر ہونا چاہیئے۔ مگر وہ یہاں پر بھی نہیں تھا۔ پھر کہاں گیا۔ میں وسوسے میں پڑ گیا۔ دن بھی تو خراب تھے۔ ابھی تک پتہ نہیں چلا تھا کہ نیو پلازا کا حادثہ کس کی کارستانی تھی۔ کتنی گرفتاریاں ہو چکی تھیں۔ کہیں کامریڈ بھی ۔۔۔ مگر میں نے فوراً ہی اس وہم کو رد کر دیا۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ روپوش ہو گیا ہو۔ ایک دفعہ پہلے بھی ہو گیا تھا۔ مجھے تشویش بھی تھی اور میں جزبز بھی تھا کہ آج جب میں واقعی سنجیدگی سے اس سے بات کرنا اور اس سے مشورہ لینا چاہتا تھا تو وہ غائب تھا۔ میں مایوس ہو کر واپس ہونے لگا۔ میرے نکلنے سے پہلے ایک بدرنگ بلی میرے برابر سے نکلی اور تیزی سے میرا رستہ کاٹتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کریسنٹ ہاؤس کی بلند و بالا عمارت کے سامنے کیا قیامت مچی ہوئی تھی۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں اندر سے نکل نکل کر باہر آرہے تھے۔ بھاگ رہے تھے۔

"ہوا کیا؟"

"بم۔"

"کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں۔ کسی نے فون کیا تھا!"

نیو پلازا کے بعد سے کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ مگر کسی وقت بھی کسی بھی دفتر میں کوئی نامعلوم فون موصول ہوتا۔ فوراً ہی بھگدڑ مچتی۔ دم کے دم میں عمارت میں اُلّو بولنے لگتا۔

پراپرٹی ڈیلر۔ یہ شخص یہاں کیا کر رہا ہے۔ میں نے اس بھگدڑ میں اسے بریف کیس در بغل اطمینان سے گذرتے ہوئے دیکھا اور میں حیران ہوا کہ نیو پلازا میں جب واردات ہوئی تھی تو وہاں بھی اسی اطمینان سے گھوم پھر رہا تھا اور یہاں بھی اسی اطمینان سے چل پھر رہا ہے۔ میں حیران ہوا اور پھر پریشان ہوا کہ پھر مجھے آن دبوچے گا اور وہی پرانا سوال دہرائے گا کہ آشیانے کے بارے میں کیا سوچا ہے اور میں اور زیادہ تذبذب میں پڑ جاؤں گا۔ ابھی تو مجھے کامریڈ سے مشورہ کرنا ہے۔ ابھی میری اس سے ملاقات نہیں ہونی چاہیے۔ میں وہاں سے تیزی سے نکل لیا۔ لیکن مجھے لگا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے اور لپک جھپک میرے پیچھے آرہا ہے۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کردی اور تیز مگر تھوڑی ہی دیر میں مجھے احساس ہوا کہ بہت سے لوگ میرے آگے میرے پیچھے مجھ سے بھی تیز چل رہے ہیں۔ ایسے بھی ہیں۔ جو بھاگ رہے ہیں۔ ان کے سانس پھولے ہوئے ہیں جو بھاگ رہے ہیں۔ ان کے سانس پھولے ہوئے ہیں۔ چہروں پر خوف کی تحریر لکھی ہوئی ہے۔ تب میں نے جانا کہ میرے ارد گرد خوف کا ایک سمندر اُمنڈا ہوا ہے اور میں؟ مجھے اس خوف کے سمندر میں اپنے اوسان برقرار رکھنے چاہئیں۔ اسی آن بدرنگ بلی میرے برابر سے تیزی سے گذری اور بھگدڑ میں کھو گئی۔ ارے یہ یہاں بھی آگئی۔ میں سخت متوحش ہوا۔ بدرنگ بلی ہو یا بدرنگ، ہتھنی میں بدرنگ مخلوقوں سے ڈرنے لگا تھا اور مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ کہیں یہ وہ بلی تو نہیں ہے اور میں اپنے تئیں خوف کا ایک سمندر بن گیا۔ تب میں نے دھیان کیا کہ میں اس بھگدڑ میں پھنس کر

کہاں کہاں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ کب سے گھر سے نکلا ہوا ہوں۔ یہ غیر وقت ہے اور زمانہ خراب ہے۔۔۔۔ اور چاروں طرف بھگدڑ پڑی ہوئی ہے۔ میں ہوں کہ تنکے کی طرح رو میں بہہ رہا ہوں۔ بھگدڑ میں آدمی پھنس جائے تو اس کے ساتھ یہی ہوتا ہے ـــــ نہ بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی جائے ہے ـــــ بس ایک ہی دائرے میں چکر کاٹتے رہو۔ جیسے بھنور میں تنکا۔ پھر اس سے مڈھ بھیڑ ہو جائے گی۔ وہی ایک سوال کہ گلستان محل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ کس اطمینان سے سوال کرتا ہے اور کتنا مجھے بے اطمینان کر دیتا ہے۔ اس بھگدڑ میں ایک اسے دیکھا کہ اطمینان سے پھر رہا ہے۔ اور وہ بدرنگ بلی وہ اس آشوب میں یہاں کیا کر رہی ہے۔ اموی دربار میں کیا کر رہی تھی۔ جھبھل بھوسا۔ ایسے میں یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ کون کون ہے اور کون کیا کر رہا ہے۔ صورتیں پہچانی نہیں جاتیں یا یہ ہمارے عہد کا جھبھل بھوسا ہے۔ میرے دادا کی سوچ واضح تھی اور قطعی چراغ حویلی نہیں بکے گی۔ بیشک برباد ہو جائے۔ میں نے رشک کیا۔ اے کاش میں مشتاق علی ہوتا۔ تب میں نے لمبا سفر کیا۔ چراغ حویلی اپنی روشن منڈیروں مٹیوں برجیوں کے ساتھ اور گلستان محل اور قصرِ ریحان اور بیت الابیض۔ پتہ تو چلے کہ کون کہاں تھا اور میں خیر۔ اب ہم اپنے آپ سے شروع ہوتے ہیں اور اپنے آپ پر ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی اپنے آپ پر واضح نہیں ہو پاتے۔ بھگدڑ، زق زق، لق لق تب میں نے دھیان کیا کہ میں کہاں سے چلا تھا کہاں نکل آیا۔ یہ غیر وقت ہے اور زمانہ خراب ہے۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ جھٹپٹے میں صورتیں پہچانی نہیں جارہی تھیں یا صورتیں بدل گئی تھیں۔ الٰہی یہ صورتیں کیا ہوئیں۔ یہ صورتیں کیسی ہیں۔ صورتوں کو تکتا تھا اور حیران ہوتا تھا۔ پیشانی پر نظر گئی۔ دیکھا کہ وہاں داغ ہے۔ حیرانی سوا ہوئی۔ دوسری پیشانی، تیسری پیشانی۔ جو پیشانی دیکھی داغدار دیکھی۔ تب دل مبتلائے تشویش ہوا۔ وسوسوں نے نرغہ کیا۔ سو میں پوری بستی

میں گھوم گیا۔ پیشانیوں کو دیکھتا چلا گیا۔ سب پیشانیاں داغدار ہو چکی تھیں۔ یہ دیکھ دل داغ ہوا۔ الم بے حساب ہوا۔ پھر میں وسوسہ میں پڑ گیا کہ کیا وہ آ گیا ہے۔ مگر کوہِ صفا۔ خیر کیا خبر ہے کہ وہ۔۔۔۔۔ ہاں کیا خبر ہے۔ تب فقیر نے افسوس کیا۔ مگر عین افسوس کے ہنگام خیال آیا کہ نادان یہاں کیوں خراب ہوتا ہے۔ شتابی سے اس قریئے سے نکل چل۔ سو فقیر نے وہاں سے ڈیرا اُٹھایا اور نکل چلا۔

اس قریئے سے کس شتابی سے نکلا تھا۔ پر نکلتے نکلتے ایک وسوسہ دل میں پڑ گیا کہ کیا میری پیشانی بھی۔۔۔۔۔ جی سن سے نکل گیا۔ پھر اپنے تئیں سنبھالا، دل کو دلاسہ دیا کہ تو اُن میں سے تھا ہی نہیں۔ دل کو قدرے اطمینان ہوا۔ مگر پھر وہی وسوسہ۔ وسوسے میں گھرا، ہرج مرج کھینچتا، رنج سفر اُٹھاتا کہاں کہاں پھرتا پھرا۔ سراغ اس خانہ برباد کو اس در کا نہ ملا۔ دل مبتلائے تشویش ہوا کہ وہ مسکن کہاں گم ہو گیا۔ وہ در و بام وہ اونچی ڈیوڑھی، وہ منڈیریں۔ دور کی آوازوں پہ کان لگائے کہ شاید کسی سمت سے کسی پیاسی بطخ کی آواز آ جائے، یا کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی، یا شاما چڑیا کے چہچہانے کی اور یوں سمت کا اندازہ ہو جائے۔ کوئی آواز نہ آئی۔ تب حیرانی سوا ہوئی۔ اور تشویش فزوں ہوتی کہ کیا اس منڈیر پر بھی اب کوئی پرندہ نہیں اُترتا۔ مگر آخر کیوں۔ کیا ڈیوڑھیوں کے ساتھ شاد آباد منڈیریں بھی ویران بے آباد ہو جاتی ہیں۔ کیا ہوتا ہے کہ مکینوں کے نکل جانے پر منڈیروں پہ براجنے چہکنے والے پرندے بھی وہاں سے کوچ کر جاتے ہیں۔ پھر کوئی مردار چیل ہی وہاں آ کر بیٹھے تو بیٹھے۔ مگر اس کے بیٹھنے سے تو ویرانی سوا ہوتی ہے۔ سو ہے سنتو پھر اس بیراگی نے ایک لمبی یاترا کی۔ نگر سے نکلا۔ بنوں میں بھٹکنے لگا۔ سب شور پیچھے رہ گئے۔ نرجن بن اور سناٹا۔ رین اندھیری، دور کنارہ، پورب گیا۔ پچھم گیا۔ پھر اتر، پھر دکھن چاروں کھونٹ کھونڈ ڈالے۔ اندھیکار ہی اندھیکار اور جل کی گرجتی دھار۔

ہے پر بھو، اُجالا کہاں ہے۔ کنارہ کس اور ہے۔ یہی ایک چنتا۔ یہی ایک دھن۔ پر اُجالا اور کنارہ جیسے الوپ ہو گئے ہوں۔ دھرتی جل منڈل بنی ہوئی تھی جس استھان کو جا کے دیکھا واں پہ جل تھل دکھائی دیا۔ پاٹھ شالا، دھرم شالا، گئو شالا محل دو محلا، سب ڈوب چکے تھے۔ جنگل پربت سب پانی میں سما گئے تھے۔ جیو جنتو پنچھی پکھیرو سب الوپ ہو گئے۔ پھر اُوپر نیچے دیکھا اور بھوچک رہ گیا کہ امبر کہاں گیا، دھرتی کس پاتال میں سما گئی۔ برہمانڈ کھانڈ کا کھلونا تھا کہ جل میں گھلتا چلا جا رہا تھا۔ جی ڈوبنے لگا کہ یہ تو سب کچھ ڈوبا جا رہا ہے۔ یہی ہوتا ہے۔ پانی جب چڑھتا ہے تو سب کچھ بہا کرلے جاتا ہے۔ تو کچھ بچے گا بھی یا نہیں۔

نراشا کے اندھیکار میں بھٹکتا پھرتا تھا کہ ایکا ایکی آشا کی کونپل پھوٹی۔ دھیان میں ایک ہرا بھرا گھنا پیڑ ابھرا جس کی چھاؤں میں ٹھنڈی مہکتی چھاؤں میں۔ ہاں بالکل، اس کی ٹھنڈی مہکتی چھاؤں ہی میں تو۔۔۔۔۔ ہاں بالکل انہیں پانیوں میں تھا۔ ایسی ہی جل دھارا تھی۔ سارا کچھ ڈوب گیا تھا۔ پورا برہمانڈ۔ پر وہ ایک برکش پانیوں کے بیچ کھڑا تھا۔ اس کا کھوج لیا جائے کہ کہاں کس اور لہلہاتا ہے۔ مارکنڈے رشی سے پوچھا جائے۔ پھر ایک لمبی کٹھنائیوں بھری یاترا۔ پھر نرجن بن اور ایک بڑا سناٹا۔ نہ سادھو سنت، نہ رشی منی نہ پیر فقیر۔ سمادھیاں۔ کٹیاں تکیے سب ویران۔ کالے کوسوں کا سفر۔ بے فرسنگ بے منزل۔ در بدر خاک بسر سنگ دل زمین، بے اماں آسمان یا مظہر العجائب، صفا کی پہاڑی تو واقعی دو نیم ہو چکی ہے۔ کوئی پیشانی داغدار ہونے سے بچی بھی کہ نہیں۔ اور چہرے۔ کیا سب ہی۔۔۔۔۔ اور یہ سروں کا سیلاب۔ مگر چھتوں تلے اماں نہیں تو آسمان تلے کہاں اماں ملے گی۔ بھگدڑ، چیخ پکار، زق زق بق بق دانت کلکل۔ جیسے کوئی بڑی آگ تعاقب کر رہی ہو۔ تو کیا حاملہ اُونٹنیوں کے حمل گرنے کا وقت آ گیا ہے۔ پہاڑ سی رات اور بھرتا

سمندر کف در دہن۔ لمبی کالی یاترا کہ کالی ہوتی چلی جا رہی ہے اور وہ برکش۔ کہاں الوپ ہوگیا۔ یاترا کتنی لمبی کھنچے گی۔ کالے پانیوں میں شتابدیاں بلبلوں کے سماں بن گئیں۔ کب تک ان کالے پانیوں میں چلیں گے۔ کب تک ان کالے پانیوں میں چلیں گے۔ کب تک۔ اس لمبی کالی رات کا کوئی انت ہے کہ نہیں۔ اجالا اور کنارہ کہیں ہے کہ نہیں اور درخت؟؟ ..... اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ